آپ بیتی - جگ بیتی

جمیلہ ہاشمی

اردو مرکز گنپت روڈ ○ لاہور

آپ بیتی جگ بیتی

نرائن چاچا نے دنیا تیاگ دی ہے۔ نہ کسی کی شادی بیاہ میں جاتا ہے اور
نہ ہی کسی کے مرنے پر افسوس کے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔
بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے بے مقصد سی۔ انسان جیتا تو اس لیے ہے کہ بچے
ہیں اس کے چار دوست ہوں چار پاس بیٹھنے والے ہوں لوگ اس کا
نام لیں تو عزت سے اس کی طرف دیکھیں۔ اس کے تجربہ اور عقل سے
کام لیں۔ اس کے صلاح اور مشورے کو اہمیت دیں اور یہ نرائن چاچا ہے
کہ بس حویلی میں پڑا گھورتا رہتا ہے۔ گھر بار کا جھنجھٹ بھی نہیں کسی سے کوئی
رشتہ داری نہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی اور جینا ہے یقین؟
اور یقین نے مجھے گھور کر یوں دیکھا گویا میری باتیں میں نے نرائن چاچا کے
لیے نہیں کہیں، اس کے لیے کہی ہوں۔ حویلی کے باہر لگے گھنے اور
بوڑھے پیڑ پر پرندے بسیرا کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ شاخیں بار بار
ہل رہی تھیں۔ شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شام کی سرخیاں

درخت کے پرے سے غائب ہو رہی تھیں اور گہرے اندھیرے میں لمبی لمبی لٹکتی داڑھیوں سے خوف آتا تھا۔

تم کیا جانو کسی دُکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی اتھاہ خاموش ساگر کی طرح زندگی کی حدوں سے پرے موت کی حدوں سے دُور جگنوؤں کے گھر کو چھونے لگتی ہے۔ ہرنام، ہو سکتا ہے نرائن چاچا کو بھی کسی ایسے ہی دُکھ سے پالا پڑا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے ماضی میں بھی ایسی یاد ہو جو پھیل کر اندھیرے کی طرح ساری زندگی پہ چھا جاتی ہے۔

پُر یادوں کا دُکھ بھی دھیرے دھیرے کم ہو جاتا ہے اور اندھیرے سے مانوس آنکھیں اسی تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ کلونت کی موت کا غم ایسا نہیں تھا جس نے کسی کو چھوا نہ ہو، سوائے نرائن چاچا کے۔ وہ اس گرتی ہوئی دیواروں والی پرانی حویلی میں زخمی جانور کی طرح گھوم رہا ہے۔ جیسے یہ دُنیا کلونت کے مرنے پہ ذرا سی بھی تبدیل نہ ہوئی ہو۔ جیسے کلونت کا مرنا کوئی بات ہی نہ ہو۔

ہرنام، کلونت تمہاری بہن تھی نا میری بیوی تھی نا، ہم دونوں کا غم دُوسری دُنیا کے غم سے کس طرح ایک سا ہو سکتا ہے۔ تم نے اس کے ساتھ بچپن گزارا تھا۔ تم اور وہ دونوں ایک ہی آنگن میں ایک ہی تھالی سے کھا کر بڑے ہوئے تھے۔ ایک ہی ماں کا خون تمہاری رگوں میں تھا۔ پر نرائن

چاچا سے اس بات کا گلہ کرنا فضول ہے۔

یقین تم نے غلط سمجھا ہے۔ میں نرائن چاچا سے کسی بات کا گلہ نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں ایسی بپتا میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ اس سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے۔ نرائن چاچا ایسے ہیں ویسے ہیں میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ پر چار دن پہلے جب کلونت کی ارتھی اٹھی ہے تو دیواریں بھی رو رہی تھیں۔ یہ درخت بھی ماتم کرتے دکھائی دیتے تھے۔ بادلوں کی گھُپ تاریکی سے جی ڈر رہا تھا۔ مندر کے بوڑھے پجاری جو کسی کے مرنے پر صرف ٹھنڈا سانس لے کر سمرن کرنا شروع کر دیتے ہیں اُسے دیکھنے آئے تھے۔ گاؤں میں کون تھا جو رو نہ رہا ہو مگر نرائن چاچا جیسے پتھر ہے اس کے پاؤں میں حرکت نہیں ہوتی۔ اس نے حویلی کے کواڑ کھول کر باہر نہیں جھانکا۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی اور جینا ہے۔ نہ کسی کے دُکھ سے دُکھی اور نہ کسی کے سکھ میں شریک۔

پھر ہم دونوں چُپ ہو گئے جیسے کہنے کے لیے بات نہ رہی ہو دُنیا کے اور لاکھوں دھندے ہیں۔ کلونت کے دس دن کے بعد اس کی چھوٹی سی بچی بھی مر گئی۔ پے در پے اس مصیبت نے تو ہم سے حواس بھی چھین لیے۔ گھر میں نئے سرے سے رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔ خزاں کے پیلے بے ہنگم اداس دن آ گئے۔ آندھیاں چلتی رہتیں۔ بڑی شاخیں تقریباً

ننگی ہوگئیں اور دور جوہڑ کے قریب بنے ہوئے چیلوں اور کوؤں کے گھونسلے
بڑے بے آسرا سے نظر آنے لگے۔ آسمان پر سارا وقت ایک زرد رنگ کا
غبار گھومتا رہتا اور آٹے کی چکی کی مسلسل کوک سے میرا دل گھبرا اٹھتا۔ خشک
پتّے گاؤں کی گلیوں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہتے اور فضا میں
گوبر، موت، اُپلوں اور سڑے پانی کی بُو بسی رہتی۔ ایک سال پہلے کلونت
جب زندہ تھی گھر میں خوشیاں تھیں۔ اس کے چرخے کی گھوں گھوں کو سُن
کر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک سال بعد خزاں ایسی ویران، اُداس اور دل کو
گھبرانے والی ہوگی۔

باہر بارش ابھی شروع ہوئی تھی۔ ہوا بہت زوروں سے چل رہی
تھی اور چوپال کے ساتھ والے بڑ کی داڑھیوں میں سائیں سائیں کے شور
نے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مٹی کی سوندھی خوشبو بھینس کے دروازے
میں سے اندر آرہی تھی اور گوبر کی بُو کے ساتھ مل کر عجیب غم ناک تاریکی پیدا
کر رہی تھی۔ دیے میں تیل کم ہوتا جا رہا تھا۔ ہم سب امام دلاسے کا انتظار
کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ گاؤں کا نمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ
اس کی باتوں کا رس، اس کی آواز کا رعب اور اس کی شخصیت کی کشش ہمیں
روز اس کا انتظار کرنے پر مجبور کرتی تھے۔ وہ بہت لمبے چوڑے کنبے
والا بڑا معروف آدمی تھا۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ چوپال میں نہ آئے۔ محفلیں

اُس کے بغیر سونی رہتی تھیں۔ چودھری کریم بخش بھی یوں تو بڑا زوردار باتونی
تھا مگر رام دُلارے میں جو بات تھی وہ اس میں کہاں۔ اور اس لیے حُقّہ
پیتے آگ تاپتے، باتیں کرتے جم کر نہیں بیٹھے تھے۔ ہر گھڑی پھونس کے
بھیڑے ہوئے دروازے کی طرف نظر اُٹھ جاتی تھی نہ جانے رام دُلارے
کیوں نہیں آیا تھا؟ اور پھر باہر بارش شروع ہوگئی تھی اور سائیں سائیں
کرتی، بین کرتی گزرتی ہوا تو میرا دل دہلا رہی تھی۔ سنتوک سنگھ نے الاؤ پر
اور اُپلے رکھ دیے تھے آگ کو چمٹے سے ایک دو بار اِدھر اُدھر کیا اور پھر
کہنے لگا "چپ چاپ بیٹھے کب تک راہ دیکھیں گے۔ شمشیر سنگھ یار تم ہی کوئی
بات کہو۔"

شمشیر سنگھ کہنے لگا "فصلوں کے کاٹنے بونے کے دن دُور ہیں خالی
دنوں میں میں کیا بات کروں۔ سمجھ نہیں آتی آج رام دُلارے کیوں نہیں آیا۔
وہ تو کبھی اتنی دیر سے نہیں آتا۔ اُس نے کبھی چوپال سے ناغہ نہیں کیا؟" —
سنتوک سنگھ بولا "چودھری یار آج کچھ دل اُتر رہا ہے میرا تو۔ واہ گورو اچھی
ہی کرے۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ پیارا نمبردار آخر گئے قبیلے والا ہے پھر
آج ایک گھوڑی کا سودا کرنے دوسرے گاؤں گیا تھا۔ بات نہ بنی ہوگی کل
کے لیے ٹھہر گیا۔"

کریم بخش نے کہا "یہی بات ہو سکتی ہے اور اگر تم ایسے ہی فکرمند ہو تو دو

قدم پر گھر ہے جا کر نمبردار کا پتہ کیوں نہیں کرتے۔ بارش سے ڈر گئے ہو جوان؟

"ڈر کون گیا ہے؟" سنتوک سنگھ نے کھڑے ہو کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا اگر یہ بات ہے چودھری تو لو میں چلا۔ کیا تم سمجھتے ہو سنتوک سنگھ بارش سے ڈر گیا۔ ارے خون کی ہولی بھی کھیلنی پڑے کبھی ڈروں نہیں۔ واہ گرو کا خالصہ ہوں سمجھتے کیا ہو۔ لو میں تو چلا۔"

چودھری کریم بخش اور شمشیر سنگھ نے اس کے کھیس کا پلو پیچھے سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور بولے۔ "بس بس دیکھلی تیری دلیری۔ یار آگے ہی کون سی رونق ہے جو تو بھی جا رہا ہے۔ کیا یہ بات کوئی کہنے کی ہے کہ تو بہادر ہے یا نہیں بس اب بیٹھ جا۔"

اور پھر بڑے زور سے دروازہ کھلا۔ رام دلارے کی بجائے نرائن چاچا اندر آگیا۔ اس کی سفید داڑھی سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ اس کی پگڑی پانی سے بھیگی ہوئی تھی۔ کھیس نہ ہونے کی وجہ سے قمیص بھی جسم سے چپک گئی تھی۔ پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔

"نرائن چاچا تم آج ایسے میں چوپال کیسے آگئے؟" شمشیر سنگھ، سنتوک سنگھ اور چودھری نے یک زبان کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گیلے پاؤں سے گلی کی کیچڑ کو صاف

کیا۔ جھٹکے سے پگڑی اُتار کر دونوں ہاتھوں سے اُسے نچوڑنے لگا۔ پھر اُس
کے پاس کھڑے شمشیر سنگھ کو نچڑی ہوئی پگڑی دے دی اور کُرتا اُتار کر اسے
نچوڑا۔ اتنی سخت سردی کے باوجود نرائن چاچا کانپ نہیں رہا تھا۔ اس
کی چھاتی لوہے کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ اس کا آن یوں ریا یک چوپال میں آ
جانا ایک زلزلے سے کم نہ تھا۔ ہم سب چُپ چاپ اس کی طرف دیکھ
رہے تھے۔ نرائن چاچا لگ رہا تھا جیسے ایسی اندھی اندھیری رات میں
کسی قبرستان سے نکل کر ہمیں ڈرانے کے لیے آیا ہو۔

پھر اُس نے چوپال کے ایک کونے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے
کہا:

"کیوں شمشیر سنگھ کچھ کھانے کے لیے مل سکے گا۔" اور شمشیر سنگھ کی
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ برسوں سے ہم لوگ نرائن چاچا کو
حویلی میں چُپ چاپ گھومتے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس نے کبھی
کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ کھانا وقت پر کسی نے
بھجوا دیا تو کھا لیا۔ نہیں ملا تو خاموش ہو رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کبھی اُسے
بولتے ہی نہیں سُنا تھا۔ اور آج یہ آواز جیسے کہیں دُور کسی غار میں تازہ پانی
کے چشمے کے چلنے کی آواز ہو، وہاں اس کونے سے آئی تھی۔

"شمشیر سنگھ!" نرائن چاچا نے پھر کہا۔ "گھر جا کر روٹی ساگ جو کچھ

بھی ہوئے آدمی جو کہ سے میرا عجب حال ہو رہا ہے۔"

اور اٹھتے ہوئے شمشیر سنگھ کا کہیں اس کی بے وجہ پانی ہیں پاؤں میں آ سے گیا۔ بارش اور کیچڑ اندھیرے کی پروا کیے بنا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

کھلے دروازے میں سے بارش اندر آرہی تھی چنتیں نے پڑ پڑا کر بھاو بدلا اور نرائن سیا چاچا کو وہاں دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔

پانی میں بھیگا۔ تہبند کو گھٹنوں سے اوپر اٹھائے شمشیر سنگھ آ گیا اور اس نے روٹی نکال کر چاچا کے سامنے رکھ دی۔

چاچا نے نہ جانے کتنی دیر میں روٹی ختم کی ہوگی۔ پانی پی کر زور کا ڈکار لیا۔ ہاتھ اپنی سفید داڑھی پر پھیرے اور آگ کے قریب ہو کر کہنے لگا۔

"بھئی تو تم چپ کیوں ہو۔ چوپال آج سے تیس سال پہلے تو اتنی سونی نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہاں قہقہے گونجا کرتے تھے، جوان اونچی آواز سے ماہیا اور ہیر گایا کرتے تھے، بولیاں، کہاوتیں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں کتنی رونق ہوا کرتی تھی اور آج تیس سال بعد اس چوپال میں آکر تو میرا دل سرد ہو گیا ہے۔ تم چپ کیوں ہو، باتیں کرو۔ میں باتیں سننے ہی تو آج یہاں آیا ہوں۔"

چیتن بولا " نرائن چاچا موت بڑی ظالم ہے سارے سپنے چھین لیتی ہے۔ تب جگ بیتیاں آپ بیتیاں لگنے لگتی ہیں اور سرد راتوں میں بھی جی چاہنے کے باوجود بات نہیں ہو سکتی۔ ہم کہانیاں کیا کہیں گے۔"

کریم بخش چودھری ہمیشہ کا باتونی آج خاموش بیٹھا اپنے حقے کی نے منہ میں رکھے کچھ سوچ رہا تھا اور شمشیر سنگھ نے کمبل کو جھٹک کر آگ کے قریب پھیلا دیا تھا۔ چھت پہ بارش بڑے زور سے شور مچا رہی تھی اور سوندھی خوشبو میں پانی کی نمی کی باس مل کر اندر پھیل گئی تھی۔

نرائن چاچا بولا " چیتن سنگھ جب بات کرنے کو جی نہ چاہے تو چوپال میں موت کا سناٹا کیوں پھیلاتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کلونتی اپنے ساتھ زندگی کی ساری ادھوری ان کہی کہانیاں اور دکھ سمیٹ کر لے گئی ہے۔ تمہاری زندگی اتنی خالی تو نہیں ہو گئی کہ گا بھی نہ سکو۔"

چیتن تو جیسے چاچا کی ہر بات کا جواب دینے پر تیار ہی تھا۔ بولا " جو گیت دوسروں کے دلوں کو شانتی اور سکھ نہ دے سکیں ان کے سنانے سے فائدہ۔ اور چاچا میں کہتا ہوں ہیر کی باتیں پرانے قصے ہیں ان کو بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔"

نرائن چاچا نے کہا " ہیریں روز پیدا ہوتی ہیں اور روز مرتی ہیں۔ چیتن دکھ کی دوڑ میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا۔"

سنتوک سنگھ نے آگ پر اُپلے پھینکے تو راکھ اُڑ کر سب پر گری۔ آگ کے ننھے ننھے انگارے باہیں نکالے لپک کر اُپلوں کے ساتھ لگ گئے۔ بالکل یوں جیسے نرائن چاچا کے کہنے کے مطابق دُکھ کی دوڑ میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا یہ آگ سب کو چاٹ جاتی ہے۔ ہر ایک دامن تک اس کی گرمی جلدی یا دیر سے ضرور پہنچ ہی جاتی ہے۔

چیتن جیسے کوئی بات بعد میں یاد آنے کہنے لگا۔ کیوں چاچا آج کیوں تم قصہ نہ کہو۔ آج تم کوئی آپ بیتی جگ بیتی سناؤ۔ چوپال کے سونے پن میں ویرانوں کی کہانیاں گونجیں۔ گیتوں میں کیا رکھا ہے کیوں شمشیر اور شمشیر سنگھ نے جیسے کسی خواب سے چونک کر کہا ہو "ہاں ہاں گیتوں میں کیا رکھا ہے" وہ نہ جانے کتنا اداس تھا اور اُسے کیا یاد آ رہا تھا۔ چاچا تم ہی کوئی بات کرو۔ باہر کیسا اندھیرا ہے اور بارش نے تو دل اُداس کر دیا ہے۔"

نرائن چاچا نے بڑے ہوئے جھکا ہوا سر اُٹھا کر اُن پرانی بوڑھی آنکھوں سے شمشیر سنگھ کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ تیس سال سے اس راز کو سینے میں دبائے دبائے اب تو میرا سانس بھی گھٹنے لگا ہے۔ مجھ میں اور سہنے کی ہمت نہیں رہی۔ کیوں جوانو تم میں سننے کی ہمت ہو گی۔ چیتن اُٹھ کر الاؤ کے قریب آ گیا۔ میں نے ٹانگیں سمیٹ لیں شمشیر نے

زور سے کہا" واہ گرو کا خالصہ واہ گرو کی جے" سنتوک سنگھ نے چٹخنے
سے آگ کو کریدا۔ اور دوسری کریم بخش نے حقّے کی نے مُنہ سے نکال کر
اُسے دیوار سے ٹکا دیا۔

"تم میں سے کسی نے گوبندی کو نہیں دیکھا ہو گا۔ گوبندی میری چھوٹی
بہن تھی۔ اسی حویلی کے دالانوں اور نیچی چھتوں والے بڑے بڑے کمروں میں
کھیلتی کھیلتی وہ اچانک بڑی ہو گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کسی جادو کے
زور سے بڑی ہو گئی تھی۔ نہیں یہ بات نہیں۔ میں اس سے دس سال
بڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ، کھلیانوں کی حفاظت اور گھومنے پھرنے میں بچپن
کے دن گزار کر جب میں نے ہوش سنبھالا تو گوبندی میری انگلی پکڑ کر دُور
تک پھیلے کھیتوں کے کنارے ایک چھوٹی سی گڑیا کی طرح پھرا کرتی تھی۔
میں نہ جانے کتنی حدیں پار کر گیا تھا کہ جب اُس نے گوٹے لگی چنریاں
اوڑھنی شروع کی ہیں اور گڑیوں سے کھیلنے لگی ہے تو میں سنتو کے عشق
میں مبتلا تھا۔ سنتو آج نہیں ہے۔ بچپن کی خبت کی طرح وہ بھی دُور
پیچھے چھپ گئی ہے۔ جنگل کی آگ کی طرح اُس کی محبت نے مجھے
چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سنتو مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ اس کا باپ
ہمارے کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کا گونا کر کے باپ نے ابھی
سسرال نہیں بھیجا تھا۔ میں نے بھی اُن دنوں گاؤں کی لڑکیوں کو آنکھیں

کھول کر ذرا بس بھینچی نظروں سے دیکھنا شروع کیا ہی تھا۔ میرے جیسے
اور کئی ہمدرد دوست بیٹھ کر کسی باغ میں تاڑی پیتے اور نشے میں بہک کر
لڑکیوں کی باتیں کرتے۔ انھی مجلسوں میں میں نے سنتو کا نام بھی سنا۔
سنتو کے بعد میں نے ویسی طرحدار عورت پھر کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے
رنگ میں گندم کا سنہرا رنگ ابھرا تھا اور چہرے پر چھاپ دبی دبی تھی جیسے
کوئی ہیرا کسی کپڑے کے پیچھے سے دمک رہا ہو۔ آنکھوں میں کسی نے
ستارے کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے۔ اس کے لمبے لمبے بال کتنے کالے تھے چوٹی
چلتے میں یوں جلتی گویا کوئی ناگن مستی میں جھول رہی ہو۔ سنتو سے زیادہ
پُرسکون چال میں نے کسی عورت کی نہیں دیکھی اور پھر وہ مسکان جو ہونٹوں
کے قریب آنکھوں سے نکل کر امرود کے شہد کی سی مٹھاس بن کر ادھر ادھر
اس کے گرد رہا کرتی تھی۔ اس کی کمر کا لوچ۔ میں سوچا کرتا تھا وہ ہاتھ لگانے
سے ہی یوں کچی کلی کی طرح دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ پر ایک شام جب
پنگھٹ سے واپس آتے ہوئے۔ ادھر کی گلی سے آگے بڑ کی داڑھیوں
کے قریب اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے گھڑا میرے سر پہ دے
مارا اور تن کر یوں کھڑی ہو گئی گویا اس میں کسی چیتے کی سی طاقت اور کسی شیر
کی بہادری ہے۔ میں نے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا سا
منہ بنا ہوا دیکھ کر کہا تھا۔ سنتو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ داد گرو کی

قسم تم مجھے بہت ہی اچھی لگتی ہو۔ تو اس نے کہا تھا جوان سرداری سے رشتے
میں نہ رہنا۔ جیسے آدمیوں کو دوسروں کی بہو بیٹیاں بھی عزت دار لگا کرتی ہیں
تم نے مجھے سمجھایا تھا۔" اور تب مجھے معلوم ہوا تھا کہ سنتو کبھی گالی کی طرح
ٹوٹ نہیں سکتی تھی۔ وہ تو چٹان کی طرح سخت اور کسی رانی کی طرح باوقار
تھی۔ مجھے وہ شام کبھی نہیں بھول سکتی۔ اگر مجھے یاد نہ رہے تو بڑی لالہ جی
ٹکٹکی دار بیبیوں کو یاد ہوگا کہ میں نے سنتو کے پاؤں پر سر رکھ دیا تھا اور اس
نے اپنے پاؤں سمیٹ کر ایک آن سے میری طرف دیکھے بغیر گھر کی راہ
لی تھی۔ دوسرے دن جب ہم سب روز کی طرح تاڑی پی کر باغ میں
گپیں مار رہے تھے تو بیجے نے کہا تھا۔ "یار رات میں سنتو سے ملنے اس
کے باغ میں گیا تھا تو میں نے اس کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ مار دیا۔
بیجے نے کرپان نکال لی اور قریب تھا کہ ہم دونوں لڑنے لگیں، دوسروں
نے درمیان میں پڑ کر صلح کروا دی تھی۔ نتیجا میری پھوپھی کا اکلوتا لڑکا اور میرا
ہم عمر تھا۔ آہستہ آہستہ یہ بات لڑکوں میں پھیل گئی کہ میں سنتو پر مرتا ہوں
اس کا دیوانہ ہوں۔ سب مجھ پر ہنستے مجھے چھیڑتے۔ نتیجا کبھی مجھے کچھ نہ کہتا۔
بس آنکھیں جھکا لیتا۔ سیٹی بجاتا یا کہیں ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ بچپن کے باوجود
جانے کیوں بیجے کی اس بات سے میرے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔
ہم دونوں بڑے ہوتے گئے۔ دوڑوں کے مقابلوں میلوں ٹھیلوں میں ہم

دونوں کئی بار اکیلے گئے مگر ہمارے درمیان ہوا جیسے یخ بستہ رہتی۔ اُس
نے اور لڑکیوں کی طرح کبھی مجھے نہیں چھیڑا۔ سنتو بیاہ کر اپنے سسرال
چلی گئی۔ سال دبے قدموں ہمارے قریب سے نکل گئے اور جب وہ دو
بچوں کو لے کر گوبندی سے ملنے ہمارے گھر آئی تو میں نے اسے ہاتھ جوڑ
کر پرنام کیا۔ اور اُس نے بھی بنا حجاب کے مجھ سے باتیں کیں۔

ان دنوں آموں پر بور آ گیا تھا کوئل رات کے درختوں میں کوہو کوہو
بولتی اور ہوا پر بڑی سوندھی پیاری اور انجان خوشبوئیں تیرتی رہتیں۔ رہٹ
چلتے اور گاڑی پر بیٹھا لڑکا ہیر گاتا رہتا۔ اپنے دیس کا پیار ہے جو ان۔
ہیر اپنی زندگی کا حسن ہے اور رانجھا اس زندگی کا عشق ہے۔ یہ محبتیں جو سنتو
سے پہلے زندہ تھیں اور اس کے بعد بھی زندہ رہی ہیں۔ دو بچوں کی ماں
سنتو سسرال سے میکے آ کر پھر واپس نہیں گئی۔ کیوں کہ واہگرو کی قسم
میں نے اُسے کاٹ کر اس کے ذرا اوپر سے کاٹ کے اُسی جڑ کی اتنی
لگتی داڑھیوں کے نیچے اُسی جگہ دبا دیا تھا جہاں میں نے اُس سے کہا تھا
"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

رات کا کوئی پچھلا پہر ہوگا۔ میں کھیتوں کو پانی دینے جا رہا تھا۔ باری
تو اصل میں بدھو کی تھی مگر میں نے اس سے کہہ کر اس رات پانی اپنے لیے
لے لیا تھا۔ آخری راتوں کا چاند پُرانے زمانے کی طرح آسمان کے کنارے

پرستاروں کے جھرمٹ میں چمک رہا تھا اور کھیتوں پر پھیلی چاندنی سوئی ہوئی
معلوم دیتی تھی۔ میں نے کھیس کندھے پر ڈال رکھا تھا اور ہاتھ میں پھاوڑا
لیے تیزی سے گاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ مندر کے قریب موڑ سنسان سا
ہے اور وہاں سادھو کی کٹیا بہت عرصے سے خالی پڑی تھی جب کوئی
مہاتما ادھر سے گزرتے تو بس اُسے چند دنوں کے لیے آباد کر جاتے تو یہ
ویرانی ہوتی۔ اچانک میں نے دیکھا سامنے سے کوئی آ رہا ہے۔ دوپٹا
کچھ کہے بغیر پاس سے گزر گیا۔ چند قدموں پر منیرداس کے مکان کی
وجہ سے وہ موڑ آج بھی اسی طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور
جب میں دوبارہ سامنے آیا ہوں تو میں نے سنتو کو اس کٹیا سے نکل کر
تیزی سے اپنے گھر کی طرف جاتے دیکھا۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو
میں دھوکا کھا جاتا مگر یہ سنتو کی چال تھی۔ یہ اس کی چوٹی تھی۔ اس کے جسم
کے رنگ ڈھنگ، اور پھر اس کی خوشبو۔ میں کہتا ہوں جوان مٹیار ساری عمر
ایک ایسی ہی ان جانی خوشبو کو ڈھونڈتا نہ جانے کتنی عورتوں میں اُسے
پا لینا چاہتا ہے۔ وہ خوشبو جو روحوں کی پاکیزگی اور جسم کے حسن سے پیدا
ہوتی ہے اور جو انسان کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی اور فضا میں
ڈولتی ہے۔ مگر تم یہ سب سن کر کیا لو گے۔ میں تو سنتو کی بات کر رہا تھا
بڑ کی داڑھیوں کے پاس جا کر میں نے اُسے پکارا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

اس کا جسم کانپ رہا تھا ۔ میں اس کا کوئی نہ تھا ۔ مگر وہ کانپ رہی تھی ۔ میں
نے کہا "تم نے مجھے وعدہ کر کے کیوں پسند کیا تھا ۔ تم ماں بن جانے کے
بعد بھی اچھے بُرے کو نہیں پہچان سکی ہو ۔ میں نے تمہارے نام سے اپنا
سینہ آباد رکھا تھا" اور اس نے واہگرو کی قسم اس نے داڑھیوں کے
اندھیرے میں جب چاند چمک رہا تھا میرے مُنہ پر تھوک دیا تھا اور کہنے
لگی "تم اس کی جوتی کی برابری نہیں کر سکتے ۔ تم تو کُتے کے پِلے ہو جو ٹکڑے
چوگا دیکھ کر مالک کے پیچھے چوپاؤں کر کے چلتا ہے ۔" اور واہگرو کی قسم
پھر مجھے غصے نے پاگل بنا دیا ۔ مجھے صرف یہ شعور رہی کہ میرے ہاتھ میں
پھاوڑا ہے اور سنتو نے میرے مُنہ پر تھوک دیا ہے ۔ جب مجھے ہوش آیا
تو سنتو اوندھی میرے پاؤں کے قریب پڑی تھی اور میں اس پر زور زور
سے وار کر رہا تھا ۔ میرا غصہ جیسے جیسے ٹھنڈا ہونے لگا اور میں ایسے
آدمی کی طرح جو تیزی اور جلدی سے کوئی ضروری کام کر رہا ہو ۔ اپنی ساری
طاقتوں کو اکٹھا کر کے سنتو کی لاش کے ٹکڑے کیے ۔ نہ جانے تیزی اور
کام کرنے کی طاقتیں کیسے اکٹھی ہو گئی تھیں کہ میں نے صبح ہونے سے پیشتر
ان ٹکڑوں کو دبا دیا ۔ جگہ برابر کر دی اور خود کھیتوں کو پانی دے کر نہر کے
کنارے بیٹھا کاتا رہا ۔ میری انگلیوں میں سنتو کے جسم کی نرمی بس گئی تھی ۔ زندگی
میں نہیں تو موت کے بعد سہی ۔ میں نے الگ الگ اس کے جسم کو چھوا

تھا۔ اس کے گلابی پھولوں کی خوشبو سونگھی تھی اُن ریشمی بالوں کو خون میں لتھڑ کر چوما تھا۔ سنتو زندگی میں میری محبوبہ تھی اور وہ مرنے کے بعد بھی میری محبوبہ رہی۔
دوسری صبح شور مچ گیا، سنتو کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس کے نام پر گالیاں پڑتی رہیں۔ اس کے ماں باپ شرم سے منہ چھپا کر راتوں رات کسی دوسرے گاؤں چلے گئے اور سنتو کا نام ہمارے گاؤں سے مٹ گیا۔ میرے دل میں ہر وقت ایک غم تھا جو گھن کی طرح میری روح کو کھا رہا تھا۔ یہ غم نہیں کہ میں نے سنتو کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یہ غم کہ اب سنتو کہاں ہے۔ میں ہر رات سپنے میں اسے دیکھتا۔ سنتو معصوم صورت بنائے بال کھولے وہ آتی اور میرے پاؤں کے قریب بیٹھ جاتی۔ پھر حسرت سے میری طرف دیکھتی رہتی اور آہ بھر کر اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگتی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ جاتی۔ ان سپنوں نے مجھے اتنا پریشان کر دیا کہ میں جو سنتو کی موت کے بعد کھیتوں کو پانی دے کر نہر کے کنارے بیٹھا گاتا رہتا تھا۔ سونے سے ڈرنے لگا۔ باپو نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھے رام نگر جہاں میرا چچا رہتا تھا۔ بھیج دیا۔ چاچے کے پانچ لڑکے تھے سب مضبوط جسموں والے اور بہادر جوان تھے۔ انھوں نے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ کی مگر نیند سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ سادھوؤں، سنتوں، مہاتماؤں، جادو ٹونے والوں نے سب جتن کیے اور میں روز بروز کمزور ہوتا چلا گیا۔ اور چھ ماہ کے بعد میں اسی طرح پریشان حال گاؤں لوٹ آیا۔

اور تب میں نے اندازہ کیا۔ میں نے دیکھا گویتری کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں بھی ناگن کی سی مستی تھی۔ اس کے پاؤں بھی زمین پر یوں پڑتے تھے جیسے روئی کے گالے ہوں۔ وہ بھی خود اس سے نا آشنا بھولی تھی۔ ڈیوڑھی سے اندر گھسا ہوں تو سب سے پہلے بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ مجھے ویر کہا کرتی تھی۔ اسے تم چھ ماہ میں کتنی بڑی ہو گئی ہو۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میرا دل یکایک اس کے لیے نرمی ملائمت اور محبت سے بھر گیا۔ وہ میری اکلوتی بہن تھی۔ اس کے پاؤں پر گویا پر لگ گئے تھے۔ کام کرتے ہوئے مڑ کر وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ ویر تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔ اتنے پیلے کیوں ہو گئے ہو۔ اس کے ساتھ ہی۔ ساتھ وہ بھی میری آنکھیں دبا رہی تھی، میرا سر دبا رہی تھی اور میری بیوی کی طرف دیکھ کر یوں ہی مسکرا رہی تھی۔ میری بیوی جو ابھی تک گھونگھٹ کی اوٹ سے سب کی نظریں بچا کر میری طرف دیکھ لیتی اور پھر گردن جھکا کر کام کرنے لگتی اور وہ شوخ نگاہیں میرے جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھیں، ان پیلے زرد نگاہوں مجھے سر سنتو کی یاد دلا رہی تھیں۔ میں زندگی بھر کے لیے بیٹھ اسے نہیں بھلا سکا۔

غموں اور دکھوں، مصیبتوں اور گناہوں کے بوجھ تلے دبا میں اسے کبھی نہیں بھول سکا۔ وہ آج بھی بڑی کڑکتی دھوپوں کے نیچے زندہ ہو گی۔ مجھے

کبھی یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر تیجے میں کیا تھا، اس کی شکل پر مجھے ہمیشہ آوارگی اور بدکاری کی جھلکی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے اسے کبھی آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

شام کو میری چھوٹی چچی اور جیسا مہمان کے اور لوگ ملنے آئے۔ اچھا خاصا میلہ، ساتھ تیجے کی بیوی بھی تھی۔ اس کی بہن بھی تھی۔ ننھی پیاری ہونہار چھوٹی لڑکیاں۔ بوڑھی عورتیں، جوان لڑکے بچے۔ گاؤں میں ملنے والے بانٹنے والے سارا گاؤں ہی اُمڈ آیا تھا۔ گاؤں والوں کو یوں بھی ایک دوسرے سے بہت پیار ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں تیجا آیا۔ سر پر شوخ تیز رنگ کی پگڑی باندھے گلے میں ہار پہنے جو اٹکا ہوا تھا آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میرا حال پوچھا۔ چاچا کی، رام نگر کی اور اس کے بیٹوں کی خیریت دریافت کی۔

گوبندی دودھ اُدھر ہی تیجے کے ساتھ آنے والوں کی خاطر تواضع کر رہی تھی۔ وہ دودھ کا گلاس لے کر تیجے کی طرف بھی آئی۔ گلاس پکڑاتے ہوئے میں نے دیکھا دونوں کی انگلیاں ٹکرائیں۔ گوبندی نے مسکرا کر تیجے کو دیکھا اور تیجے نے ایک لمحے کے بعد گلاس لے لیا۔ میں لیٹا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ تبھی ایک سنسناہٹ سے میری رگوں میں خون بہنے لگا۔ جیسے جسم میں کسی نے بجلی چلا دی ہو۔ میرا ہاتھ بار بار اپنے پہلو میں لٹکتی کرپان کی

طرف جاتا۔ گھر میں رُک گیا۔ مہمان ایک ایک کر کے رُخصت ہونے لگے۔ بڑی
بوڑھیاں میرے سر پر ہاتھ پھیرتیں، مجھے دعائیں دیتیں اور ماں کے اکلوتے لڑکے
کے لیے دُعائیں کرتی بڑے دروازے سے نکل جاتیں۔ لڑکیاں، بچے، بہوئیں۔
میلہ ہوتے ہوتے کم ہو رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف بندھی دس بارہ بھینسوں
گایوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں ٹنٹنا اٹھتیں، جب وہ چارہ کھاتے کھاتے
سر ہلاتیں یا ایک دوسرے سے زیادہ کھانے کی کوشش میں آگے بڑھ کر
منہ مارتیں۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور میری آنکھیں گوبندی کا تعاقب
کر رہی تھیں۔ تیجا سب کے جانے کے بعد بھی بیٹھا ہوا تھا اور چارپائی پر
بیٹھا آہستہ آہستہ ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

میں نے کہا "یار کس سوچ میں ہو؟" تو اس نے گہری نظروں سے
مجھے دیکھا اور کوئی جواب دیئے بنا کچھ گنگنانے لگا۔ پھر کھنکار کر گلہ صاف
کیا اور بولا "اچھا بھئی ذرا مسٹر گنگو میں چلتا ہوں۔" پھوپھی جو ماں اور جیتو
کے ساتھ بیٹھی کسی کی بہو کا قصّہ کہہ رہی تھی۔ کہنے لگی بیٹے تو گھر چل میں آ جاؤں
گی۔ مگر تیجا وہاں کھڑا رہا۔ بے مقصد ادھر ادھر دیکھتا رہا اور گنگناتا رہا۔ مجھے
پھر گھڑی غصّہ آ رہا تھا۔ آخر یہ اب جاتا مرتا کیوں نہیں۔ یہاں کھڑا کیا کر رہا
ہے گوبندی بھینسوں کی ناند کے قریب کھڑی کسی بڑے ضروری کام میں

آ گئی ہوئی تھی اور کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے زور سے کہا۔

"ماں گھڑے میں پانی کم ہے اگر کہے تو جیتو کے ساتھ جا کر پنگھٹ سے پانی لے آؤں۔" اور ماں نے اسی طرح ہی باتوں میں الجھے پھوپی سے کوئی کمائی سُننے کر دیا۔ ہاں جب آؤ تم دونوں لے آؤ۔ پھر میں نے جیتو اور اپنی بہن کو بستہ ہی کر گھڑے اٹھا کر باہر نکلتے دیکھا۔ یہ سارا تماشا میری نظروں کے سامنے ہو رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں صدیوں پرانا ایک بھوت ہوں جسے کہیں چین نہیں ملا۔ جس نے پاتال کی گہرائیوں اور آکاش کی بلندیوں پر بھی اپنے لیے جگہ نہیں پایا اور جو اب یہاں صحن میں اپنے گھر کی چارپائی پر لیٹا کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر جیتے نے بھی کہا۔ اچھا بھئی نرائن سنگھ میں بھی چلتا ہوں اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آنگن پار کر کے نکل گیا۔ تمام خون کی روانی سے سائیں سائیں کرتی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور کوئی بات مجھے سنائی نہ دے رہی تھی۔ چاند کے قریب لٹے کا رنگ آنکھوں میں اترے خون کی وجہ سے مجھے سرخ لگ رہا تھا۔ میں آگ میں جھلس رہا تھا اور پھر اتنا لاغر ہونے کے باوجود میں بھی باہر نکل گیا۔ ماں کو اتنی شُدھ بُدھ ہی نہیں تھی کہ مجھ سے کچھ کہتی۔ پھوپی اور وہ اپنی باتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

پنگھٹ کے قریب جا کر میں نے دیکھا کہ تنہا کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ جیتو اور
گوبندی پانی بھر چکی تھی اور گگرے اٹھا رہی تھیں۔ ان دونوں نے مجھے نہیں دیکھا
میں دور ہی سے لوٹ آیا تھا۔ یہی گلی سے آتے مجھے دیر ہو گئی تھی اور جب میں
گھر میں گھسا ہوں تو گوبندی چاولی میں دودھ ڈال رہی تھی اور جیتو چولہے
میں آگ تیز کر رہی تھی۔ چاند کی تیز اور دیے کی مدھم روشنی کے سنگم پر کھڑی
گوبندی مجھے نہ جانے کیوں اتنی پیاری لگی۔ اس کے چہرے پر ملاحت کا ایک
طوفان تھا، ایک ایسا جذبہ جس کی سمجھ مجھے نہیں آئی۔ اس گھڑی مجھے یوں لگ
رہا تھا گویا وہ دنیا کی ساری حسین عورتوں کی سردار ہو۔ اور جیتو، سنتو سب
اس کے سامنے پانی بھرنے والی کہاریاں۔ اور اس کے ساتھ ہی جیتو کے خلاف
پرانا غصہ میری رگوں میں شرر پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گھوم رہا تھا اور جیتو ان
میں رہنے والی سنتو کی صورت مجھے چولہے کی آگ کے شعلوں میں نظر آنے
لگی۔ جیسے وہ جھلس رہی ہو۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔

پھر رات اور گہری ہو گئی۔ کام ختم کر کے گوبندی نے زور سے کہا۔ ماں
آج ہم پھوپی کے گھر جا رہے ہیں وہاں ساری رات چرخے کاتیں گی میرے
حصے کا تیل لے لے۔ اور ماں نے کہا اچھا تیری پھوپی بھی کہہ گئی ہے تیرے
دیر کو کھانا دے دوں۔ پھر چلتی ہوں۔ جیتو گھر رہے گی اور جیتو نے گھڑے
میں سے پانی ڈالتے ذرا سا سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ مگر اس رات تو میں

صرف گوبندی کو دیکھ رہا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ نہیں ماں میں گوبندی کو گھر سے
باہر نہیں جانے دینا چاہتا۔ مگر چپ رہا اور گوبندی کے تو پاؤں جیسے زمین پر
نہیں پڑ رہے تھے۔ سیویوں کا ڈھیر اُٹھا کر اس نے ایک کپڑے میں باندھا
میرے پاس آ کر کہنے لگی: "ویر تیرا جی کیسا ہے۔" وہ جھک کر آرام سے بولی
ویر تم کتنے دُبلے ہو گئے ہو۔ تمہیں کیوں یہ روگ نہیں چھوڑتا۔ اس کی آواز میں
اتنی اداسی تھی، اتنی سچائی تھی کہ اگر میری رگوں میں خون کی جگہ آگ نہ ہوتی تو
میں گوبندی کو گلے سے لگا لیتا اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا اور اسے
کہتا۔ میری بہن میں صرف تیری دُعا سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مگر میں
پتھریلے دل کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اسے ایک لفظ بھی نہ کہا اور
وہ ماں کے ساتھ پھوپی کے گھر چلی گئی۔

چنتو نے لمبا گھونگھٹ ہٹا کر بڑے پیار سے کہا اندر چلو جی اب تو بہت
ٹھنڈ ہو گئی ہے مگر مجھے اس ٹھنڈک کا ہوش کہاں تھا۔ میں نے اسے کوئی
جواب نہ دیا۔ اور یونہی بیٹھا رہا۔ رات نیلے آکاش کی چھتری اوڑھے دھیرے
دھیرے پائل چھنکاتی ستاروں کی آنکھوں سے ہمارے گھر کے خالی صحن کو دیکھ
رہی تھی جس میں گایوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹ گونج رہی تھی
اور دہلیز پر بیٹھی چنتو اپنا سر دروازے سے ٹکائے میرے اندر جانے کے
انتظار میں نہ جانے کب کی سو چکی تھی۔ ان دنوں دل کتنا دیوانہ تھا۔ میرے

خون میں موت کا راگ تھا صرف موت کا۔ میرے منہ کا مزہ کڑوا تھا جیسے مجھے
خون کی پیاس لگ رہی ہو۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ میں دروازہ
کھول کر باہر نکل گیا۔ میرے انجانے ہی قدم چھبیلی کے گھر کی طرف اٹھ رہے
تھے۔ پیچھے حویلی کی دیوار کے قریب جا کر میں نے دیکھا گوبندی گھڑوں کے قریب
کھڑی پانی پی رہی تھی اور تیجا بھی اس کے قریب کھڑا تھا اس سہانی اور تصویر
کی سی رات میں میری بہن گوبندی اور تیجا۔

کمرہ لڑکیوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ سو رہی تھیں۔ دیے کی
ٹمٹماتی روشنی میں بچوں کی گھوں گھوں تھی جو موت کا راگ معلوم ہوتی تھی اور
بیٹھے مدھر بیتوں کے گیتوں سے ہوا بوجھل تھی۔ میں دہلیز پر کھڑا ہو گیا
اور گوبندی جو ابھی میرے سامنے آ کر بیٹھی ہی تھی۔ گھوم کر دیکھنے کے بعد
کھڑی ہو گئی۔ "کیوں ویر کیا بات ہے؟"

میری شکل دیکھ کر اسے اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی ہو گی۔ ایک
عورت نے جسے ہم سب ماسی کہتے تھے کہا "نرائن سنگھ بچوں کی طرح
ماں ہی کے پیچھے آیا ہے" اور ہنس پڑی۔ "ماں کہاں ہے" میں نے یوں ہی
پوچھا۔ اونچے اسے کے پاس موٹی ماں کو چھبیلی نے کہا "بھائی نرائن سنگھ
آیا ہے پوچھ تو کیا بات ہے"۔ پھر وہ تعجب سے کہنے لگی "کیوں نرائن تو اچھا
بھلا تو کیا پریشان دکھائی دے رہا ہے"۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہ

دیا اور خاموشی سے گوبندی کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کا رنگ دیے کی شفاف
روشنی میں مٹی ہو رہا تھا اور جو اپنے چرخے کے پاس کھڑی تھی۔ پھر میری بیری
چھوٹی بہنیں بھی پریشان ہو گئیں۔ سب نے چرخے چھوڑ دیے اور اٹھ اٹھ کر دہلیز
میں آ کھڑی ہوئیں۔ "نرائن کیا بات ہے۔ نرائن ویر تیرا جی کیسا ہے؟" ماں
نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور باپو بھی آ گئے۔ میں نے کہا گوبندی کو بھی ساتھ لے
لو۔ نانے کے گھر سے ہو آیا ہے۔ شاید اسے آج رات جانا پڑے اور ماں
حیران تھی اور اسی سے بولی چل گوبندی آ گھر چلیں۔ سب کو دہلیز میں کھڑا چھوڑ
کر ہم سب چلنے لگے تو منتوپی کہنے لگی "کہیں بھائی جی ابھی آؤں۔ کیا کوئی بڑے
فکر کی بات ہے؟" اور ماں کی بجائے میں نے جواب دیا: "چھاؤنی سے
تار آیا ہے۔ باقی بات میں پھر بتاؤں گا۔"

گوبندی ہمارے پیچھے پیچھے ہولے ہولے چل رہی تھی جیسے راستہ کانٹوں
سے بھرا ہو اور اُسے سنبھل سنبھل کر قدم دھرنے کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ
ہو۔ گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح کبھی ادھر اُدھر دیکھتی اور آگے چلنے لگتی۔
اس کا چھوٹا سا دل نہ جانے کتنے زور سے دھڑک رہا ہوگا۔ کیونکہ اس کے
بعد تو مجھے اس سے پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میں نے اس کے گلے پر اپنا
پاؤں دھر دیا۔ اور وہ بے کس جانور کی طرح دبکنے کی کوشش کرتی رہی۔
اس نے ہاتھ پاؤں بھی نہیں مارے۔ یوں ایک کپڑے کی طرح جیسے کوئی

ذرا سی انگلی سے روندے سے - میں نے گوبندی کو بٹھا دیا - اپنی اس بہن کو جس
کے بعد آج تک مجھے کسی نے ویر نہیں کہا - ان آنکھوں کی حسرت مجھے کبھی
نہیں بھولی - ایک لمحے کے لیے بھی نہیں - جیسے کی آنکھیں خوف سے کھلی ہوئی
تھیں اور ماں یوں گم سم بیٹھی تھی جیسے پتھر ہو - اگر ان دونوں میں سے ایک
بھی ذرا سی حرکت کرتی تو اس کا انجام بھی شاید یہی ہوتا۔

اگر تیجا اتنا بانکا نہ ہوتا تو شاید میری کہانی مختلف ہوتی - میری زندگی کے
گوشے میں اور رنگ ہوتا - میں نے یہ زندگی حویلی میں بند ایک زخمی جانور کی طرح
بھیگ کر گزارنے کی بجائے اور طریقے سے گزاری ہوتی - اگر تیجا عورتوں کو
لڑکیوں کے دلوں کو باندھنے اور انہیں بے بس کرنے والا جادو نہ جانتا ہوتا
تو آج گوبندی زندہ ہوتی - میرے بیٹے بھی دنیا میں خوشیاں سمیٹتے - مگر
گوبندی کو میں نے مار دیا - اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میں نے
اسے اناج کی کوٹھیوں سے بھرے کمرے میں دبا دیا - اور پیپل کی چھاؤں
تلے سے گوبندی کی ڈولی کبھی نہ گزری - ہمارے آنگن میں سہاگ بھرے
گیت کبھی نہ گونجے - ہمارے دالانوں میں مہندی کی ہلکی خوشبو کبھی نہ اڑی
گوبندی کے بعد یہ حویلی ویران ہے - اس کے بڑے بڑے دالان ڈھولک کی
تھاپ کو سننے کا برسوں انتظار کرتے رہے اور پھر بوڑھے ہو گئے۔

اگر تیجے کو میری اس کمزوری کا یقین نہ ہوتا کہ میں اس سے جلتا ہوں

تو شاید آج وہ بھی اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر تیلی دھواں اڑاتا ہوا چوڑی گلیوں اور بڑ
کی لٹکتی داڑھیوں کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ اسے میری اس کمزوری کا یقین تھا
اور اسی لیے اپنی شکست کو وہ اس کی آنکھوں میں پڑھنے کی بجائے میں
نے اسے مار دیا۔

نہر کے پل کے قریب گھنے درختوں کی وہ رات کبھی نہ بھولے گی جب
وہ رات اپنی ساری تاریکیوں سمیت گزر رہی تھی اور بیتا ہیا گاتا گھوڑی کو دلکی
چلاتا بڑے گھاٹ سے گھر آ رہا تھا اور وہ نشے میں دھت تھا اُس نے
دوسرے گاؤں میں پیٹ بھر کر تاڑی پی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے
ناچ رہے تھے۔ شاید اس رات گاؤں کے کسی موڑ پر کوئی سنتو اس کا انتظار
کر رہی تھی۔ شاید اس گھڑی بھی کسی دالان میں نکل کر کسی کوٹھری سے پانی
پینے کے بہانے اُس سے بات کرنی تھی مگر میں نے ان سب کا انتظار ختم کر
دیا۔ میں نے اس پر پیچھے سے وار نہیں کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا آج
پچھلا حساب برابر کرو اور اُس نے ہنس کر جواب دیا۔

زمان سنگھ واہگرو کی قسم ساری زندگی میں تو نے آج ایک بات کام
کی کی ہے۔ میں تو کب سے سوچ رہا ہوں۔ اگر تجھ سے حساب کتاب نہ
ہو سکا تو کیا ہوگا اور اس نے اپنی لمبی کرپان نکال لی تھی اور گھوڑی کو درخت
کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ پھر میں بھی اپنی گھوڑی سے نیچے اتر آیا۔ اور ہم

خاموش چُپ چاپ لڑتے رہے۔ صرف کرپانوں کے ٹکرانے سے اندھیرے
میں چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ تیجے کے بازوؤں کی قوت کا احساس مجھے اس
رات ہوا تھا۔ اپنی برتری اور غصے کا پتہ بھی مجھے اس رات ہی چلا تھا۔ اس
کے ہانپنے کی آواز میرے کانوں میں فتح کے گیت سے بھی زیادہ سہانی
ہو کر پڑتی تھی۔ مجھے معلوم تھا میں اپنی باقی ساری زندگی رہ سکتا ہوں میرے
خون کی گرمی اور غصے کی آگ نے مجھے دیوتا بنا دیا تھا۔ ورنہ تیجے کے سامنے
جاتے تو لوگ کانپا کرتے تھے۔ اس نے کہا " نرائن سنگھ موت یقینی
ہے مگر میں تجھ سے رحم کی بھیک نہ مانگوں گا جو بھی چاہے کرو" اور اس نے
اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ مگر میری کرپان کی کاٹ بڑی گہری تھی۔
تیجا گر گیا اور پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی گھوڑی رسہ تڑا کر نہ جانے
کب کی گھر بھاگ گئی تھی۔ مجھے اس رات کسی کا ڈر نہیں تھا۔ میں نے پہلے
نہر سے جی بھر کر پانی پیا۔ پھر کرپان کو مَل مَل کر دھویا۔ اور اس کے بعد اپنی
گھوڑی کو کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔ زندگی میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔

جس رات میں نے تیجے کو مارا ہے۔ میری زندگی کے سارے
دُکھ سُکھ ختم ہو گئے۔ میں بھی اسی رات وہیں مر گیا اور آج تیس سال پہلے
کی بات ہے میرا بھوت حویلی کے دالانوں میں یونہی چکر لگایا کرتا ہے۔
مجھے کبھی کوئی یاد نہیں آتا پر گوبندی کے لیے میرا جی تڑپ اٹھتا ہے اس

کے بعد سے آج تک مجھے کسی نے ویر نہیں کہا۔ نہ جانے اس کا ننھا سا دل اُس رات کس زور سے دھڑک رہا ہو گا۔ یہ راز میں نے تیس سال سینے میں چھپائے رکھے ہیں۔ پر آج ان کے وجہ سے میرا دل پریشان ہو گیا تھا اور میں تیس سال میں پہلی بار حویلی کو چھوڑ کر نہر کے کنارے اس پل تک گیا تھا۔ جہاں اماوس کی آخری رات ہم نے ایک دوسرے سے ملنے میں اپنے اپنے حساب کتاب سمجھے تھے!

ہم سب خاموش تھے نرائن چاچا بجھتی ہوئی آگ کرید رہا تھا۔ شاید اُسے گوبندی یاد آ رہی تھی۔

پرانے گیت

ترنم کے بعد میرا گیت سر نہیں پا سکا۔ ترنم کے بعد میرے گیتوں کے بول ادھورے ہیں اور پھر بھی وہ کبھی میری نہ ہو سکی۔ آج اپنے سے پوچھتا ہوں تو کوئی جواب نہیں پا سکتا۔ کیا میں نے ترنم کو چاہا تھا؟ اندر سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ صرف وہ گھٹن ہے جو بھاری بوجھ کی طرح دل کو نیچے کھینچتی ہے اور چاہت بھی کیا ہے؟ اپنے وجود کے تقاضوں سے میں کبھی آزاد نہ ہو سکا اور اسی لیے ترنم کے چرن چھونے کی ایک دھیمی سی خواہش ہوتے ہوئے میری رگوں میں آگ بن کر بہنے لگی۔ پتہ نہیں وہ ساری پوترتا اور ساری سُندرتا جو ہمارے جنم کی گھڑی اکٹھی ہوتی ہے۔ وہ دوسرے دیس میں آن کر کہاں بھاگ جاتی ہے اور زندگی صرف چھونے محسوس کرنے کے احساس تک ہی کیوں محدود ہو جاتی ہے۔

"ترنم تم سے ایک بات کہوں۔"

"کہو؟" اس نے برش ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ساڑھی کے پلو سے

انگلیاں پونچھتی ہوئی میرے قریب آن بیٹھی ہیں اسے کیا کہتا میرا دل زور
زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے اُس کے قرب اور
وجود کے احساس سے میرا سانس رُک رہا تھا۔ کائنات تھم گئی تھی ساری
آوازیں ڈوب گئی تھیں۔

رتنم عورت نہیں ایک خواب تھی اندھیرے کی طرح اپنے اندر آپ
چھپی وہ یورپ کے اس بیگانے شہر میں نہیں کتنی اپنی لگتی تھی۔ دیے کی
طرح جلتی ہوئی شعلے کی طرح لرزاں۔ وہ ہم سب کے لیے پگڈنڈی تھی
جس سے ہم اپنی سمتوں کا تعین کر سکتے تھے۔ مگر میں نے اپنے ہاتھوں اس
راہ کو کھو دیا زندگی کی سردی میں محبتوں کے اس دیے کو میں نے ہاتھ بڑھا
کر خود ہی بجھا دیا۔

رتنم سے تم عام باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ موسم کی باتیں، شہر کی یا رشتوں کی
باتیں، لڑکیوں کے حسن کے قصے اس کے پاس آ کر کھو سے جاتے کیونکہ رتنم
بالکل مختلف لڑکی تھی۔ اس کو مل کر تو کبھی یوں نہیں لگتا کہ تم کسی بڑے واقعے
سے دوچار ہو رہے ہو۔ کسی کیفیت میں سے گزر رہے ہو۔ کوئی سرور محسوس
کر رہے ہو۔ نیند کی طرح رتنم کے وجود کا احساس انسان کو جب ہوتا تو وہ
اس کی شخصیت کی جاذبیت میں بہہ چکا ہوتا۔ اس میں کوئی بلندی نہ تھی تم اس
سے مل کر خوش نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے کو کسی بڑے گیت کا حصہ دے دے

ٹھہرایا جانے والا پل محسوس نہیں کرتے کچھ بھی تو نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ ترنم کی آنکھوں میں ستاروں کی جوت نہ تھی۔ اس کے بالوں میں لہریے نہ تھے۔ وہ زور سے قہقہے نہ لگاتی تھی اس کی گرمجوشی میں ایک سردی ہوتی جسے کو تم کبھی کبھار اپنی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتا محسوس کر سکتے تھے۔ اسے یاد کر کے کسی کا دل کبھی دکھی نہیں ہو سکتا تھا اور پھر بھی ترنم کے بعد میرا گیت سُر نہیں پا سکا۔

جب میں ترنم سے پہلے پہل ملا تو وہ اپنی کم عمری کے باوجود جانے نہیں کیوں کچھ ماں جیسی لگی شاید اس لیے کہ وہ ساڑھی پہنتی تھی اور اس پر دوسرے دیس کے رنگوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ سر کو پلو سے ڈھانپ کر چلتی تھی وہ ساری باتیں جو مجھے پیاری تھیں اسے دیکھ کر یاد آنے لگتیں۔ آم کی خوشبو زمین کی باس۔ رات کی سیاہی۔ پروا کا لمس' اور تلسی کے پودے کی نرمی۔ یہ ساری چیزیں جب میرے خیالوں پر ابھرتیں تو پہلے ماں یاد آتی اور پھر جانے مجھے ترنم آن کھڑی ہوتی۔ میلی سی مسرتیں جو سنہرے غبار میں لپٹی ہو اور جس کے گرد سالگرہ کی خوشبو ہو۔

ترنم بہت آہستہ بولتی تھی اس کی بات سننے کے لیے اپنا سانس روکنا پڑتا تھا وہ جب کسی کی طرف دیکھتی تو لگتا اس کی نگاہیں دلوں کو ٹٹول رہی ہیں۔ پتہ نہیں اس میں یہ تمکنت کہاں سے آئی تھی۔ تم اس کی طرف بری طرح نہیں دیکھ سکتے تھے پر تم اسے نظر انداز بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی جاذبیت اور کشش

دھوپ کی طرح زندگی بخش اور چاند کی کرنوں کی طرح آسودگی بخشتی تھی۔

اتنے بہت دنوں بعد رتنم کو یاد کرتے مجھے یہ دھیان نہیں پڑتا کہ کون مجھے اُس تک لایا تھا۔ یا پتہ نہیں جن دروازوں کو کھلا ہو وہ دُنیا کے کناروں سے چلتے ہیں اور ایک سلسلے کے بیچ سینے میں بند ہو جاتے ہیں پر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی میں رتنم کے پیچھے اس کے لیے غلط باتیں نہیں کروں گا۔ رتنم کو کبھی پتہ نہیں چل سکا کہ میں نے اُسے چاہا بھی تھا۔ وہ ساری دُنیا کی مالک تھی اسے کیا پرواہ کہ اسے کون یاد کرتا ہے اور کون بھلاتا ہے۔ وہ تو بس حاکم تھی پر اُس نے کبھی کوئی حکم نہیں دیا۔ ہمیں سدا یہ حسرت رہی ہی کہ ہم اس کے کسی کام آ سکیں۔

ریاض سے جب اُس نے سُنا کہ میرے پاس تان پورہ ہے اور میں گا سکتا ہوں تو کہنے لگی "کسی دن میرے سٹوڈیو آؤ نا"۔

میں نے سمجھا تھا تان پورے میں میری اور رتنم دونوں کی آوازیں گھُل مل جائیں گی۔ ہم دُوسروں کی طرح نہیں تو کم از کم دو انسانوں کی طرح آپس میں گھل مل جائیں گے۔ گھر سے دُور یورپ کے اس دھندے سے بھرے کثیف شہر میں لوگوں سے بھرے ریستورانوں اور شراب کی بُو سے بوجھل ہوا میں بیٹھ کر میں دوستوں سے اس کے جسم کے خطوط اور اس کی آنکھوں میں پھیلتی مدہوشی کی باتیں کر سکوں گا۔ کافی کے پیالے پکڑ کر جہاں کے کھنچے ہوئے

پردوں، رنگوں اور روشنیوں کے قہقہے میری زندگی کو رنگین کر دیں گے۔ یورپ میں ہر شخص اسی شے کا متلاشی ہوتا ہے۔ سستی خوشیاں کم قیمت پر وصول کر کے تنی ہوئی رسی پر جذبات کا ناچ ناچتے ہوئے ایک گونہ مسرت ہوتی ہے کہ تم زندگی سے دو چار ہو رہے ہو۔ لڑکیوں اور پارٹیوں میں خوشی سے گلے مل سکتے ہو۔ اتنے مصروف ہو کہ تمہارے اندر بھی قہقہے گونجتے ہیں۔ تم زندگی کے دھارے میں نہا سکتے ہو۔ کوئی حسرت باقی نہیں رہتی۔ تمہارے ذہن کے پس منظر میں ہر وقت نغمہ دوڑ رہا ہوتا ہے۔ میں رخشی سے ملا تو میں نے سوچا اتنی بہت لڑکیوں سے عشق کر چکنے کے بعد میں چالاکی سے اسے دام میں گرفتار کروں گا۔ مجھے ریاض سے اس کی باتیں سن کر بھی اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ چند دنوں کی بات ہوگی۔ پھر تان پورے کے تار ڈھیلے ہو جائیں گے۔ مضراب کھو جائے گا۔ انگلیاں تھک جائیں گی اور لکڑیوں کے پٹے کھل کر میری زندگی کے ایک اور باب کو ڈھانپ لیں گے۔ وہ اپ میں اندھیرا اور چُور چُور جسم۔ بند بند میں درد اور روح کی شکست، ذہن کا خلا جس کے احساس کا شکار میں اس بھری پُری ہنستی کھیلتی دنیا میں بھی اکثر ہو جایا کرتا تھا۔

رخشی کی لاتعلقی میں بھی ایک تعلق تھا۔ اس کے سٹوڈیو میں بیٹھ کر ایک سے کو بھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ تم اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو۔ تصویر بناتے بناتے وہ مڑتی اور بات کرتے پھر کام کرنے لگتی مگر جب میں پہلے دن آیا

کے ساتھ اس کے سٹوڈیو میں گیا تو مجھے یقین تھا کہ یہ معمولی سی لڑکی رستم مجھے
پاکر بہت خوش ہو گی۔ میں سدا محبوب بنا رہا ہوں۔ ہر کہانی کا ہیرو۔ ہر جگہ کا
مرکز۔ ہر محفل کی رونق بھی میں۔ اپنے سے بڑی لڑکیاں سب چاہتی تھیں۔ میں بہت
سی خوش فہمیوں میں مبتلا تھا۔ فتح کا غرور، آنکھوں میں شہرت کے نشے کے آگے
اور بھی زیادہ چمک رہا تھا۔ میں ہر بار اپنی دلداری کرتا تھا اور خود اپنے وجود
کی تکمیل سے مطمئن تھا۔

ریاض اور جمشید رستم کے ساتھ کسی تحریک کا ذکر کرنے لگے گفتگو اتنی ذاتی
تھی کہ میں اس میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ اور میں دیواروں پر لگی تصویروں
اور بوتلوں کے ساتھ زاویے بناتی کتابوں کی چھت کو دیکھتا رہا۔ پھر کچھ ہی کتابوں
کے سنہری حروف میں لکھے نام پڑھتے پڑھتے مجھے غنودگی آنے لگی۔ ان
لفظوں کی باتیں میرے کانوں میں شہتوت کے درخت پر مدہوش مکھیوں
کی ہوا کے ریلے کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور کم ہوتی بھنبھناہٹ کی طرح پہنچنے
لگیں۔ نیند کا ہلکا سرور مجھ پر بادل کی طرح چھا گیا۔ رستم کی آواز خواب میں
قریب آتی آہٹ کی طرح میرے دماغ میں گونج کر پھیلتی گئی پھر تان پورہ
میرے ہاتھ سے ڈھلک کر زمین پر گرا اور میں جاگ گیا۔

رستم نے جب تان پورے کو اٹھا کر اس کے تاروں پر ہاتھ پھیرا تو وہ
مجھے پریوں جیسی لگی۔ ویسی ہی جوان اور جنگلوں کی سی خوابوں سے بھری آنکھوں والی

کو مجھ لگا سے بڑی معمولی سی لڑکی ۔ میں جیسے لفظوں کے جادو کا احساس تھا اور جسے اپنی آواز سے عشق تھا ۔ ساری سہ پہر بنا بسے وہاں بیٹھا رہا تھا ۔ میں نے کہا "اب میں جاؤں گا۔"

زتنم نے ہورے سے کہا "نہیں تم ابھی نہیں جا سکتے ۔" اور مجھے لگا جیسے کسی طاقت نے ان جانے ہی مجھے اپنے تابع میں کر لیا ہو ۔ میں اس حکم کو ماننے پر مجبور تھا ۔ اور پھر بھی میرا دل اس کی طرف کھنچ نہیں رہا تھا ۔ وہ ایک تنہا عورت ہے جس کی شدید تمنا کے باوجود میں اسے چھو نہ سکا جس کے لمس کے لیے اندھیرے میں میں صدیوں منتظر رہوں گا جو میرے دُکھی دل کے روگ کو اپنی مسکراہٹ سے بدل سکتی تھی ۔

میرا دُکھ اسی طرح ہے کیونکہ زتنم نہیں ہے ۔ زتنم ہوتی تبھی تو میرے دل کا دُکھ کبھی نہ جاتا ۔ پتہ نہیں مجھے اس سے محبت تھی بھی کہ نہیں ۔ زتنم نہیں ہے اور دُکھ زندہ ہے ۔ پتہ نہیں خوشیوں کی زندگی اتنی کم کیوں ہوتی ہے کہ اس کے بنا زندگی کو اپنا وجود تاریک راہوں سے گھسیٹ کر کسی نہ کسی منزل کی تلاش میں بھٹکتے رہنا پڑتا ہے ۔

اوم شانتی ۔ شانتی شانتی ۔

جب زتنم نے تان پورہ بجانے سے پہلے اسے ماتھے پر چڑھایا اور ماتھا رگڑا تو میں حیران رہ گیا ۔ پھر مضراب کو انگلی میں گھما کر بولی "بھگوان مجھے

شگفتہ نے اور دھیرج بھی " اور میں تو جو بات ٹھیک طریقے سے ٹھیک
وقت پر کہنے کا عادی تھا ہنس کر بولا : آخر دھیرج چاہنے سے کیا ہوگا اور
شگفتہ تو جتنی ہے اُسے ہی سنبھالو تو ٹھیک رہے گا۔"

رتنم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے پہلی بار لگا جیسے میں
نے کوئی بہت غلط بات کہی ہو۔ اس کے بعد سے میں نے رتنم کے سامنے
کبھی زیادہ باتیں نہ کیں۔ اسے تان پورہ بجاتے دیکھ کر مجھے لگا جیسے عورت
کے وجود میں ایک زہر ہے جو رگوں میں پھیل سکتا ہے جو بے چین کر سکتا
ہے اور جس سے بچ کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔ صرف حسن ہی زن کی طاقت
نہیں۔ خوب صورتی ساری شکتی نہیں۔ شگفتہ کا ایک حصہ ہے بڑا معمولی
سا جسے بھلایا بھی جا سکتا ہو۔

رتنم اداس تھی وہ شانت تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا میں بہت
کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں بہت سی باتیں تھیں جنہیں کہنے کی اتنی
مجھے اپنی زبان پر ناز تھا لفظوں کے ڈھلنے کی نرم اور میری روح جیسے
باہر نکلنا چاہتا تھی میں اسے بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا رتنم کے
بنا زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا۔ میرے بازوؤں میں اینٹھن تھی وہ ساری
محبتیں جو میں نے شراب پی کر میم والی آنکھوں کے کونے سے چہرے پر
بھرپور نظر ڈالنے والی لڑکیوں سے کی تھیں مجھے کھوکھلی لگتی تھیں۔ گذری

زندگی ایک غلط سا نحو لگ رہی تھی۔ میں اتنے سالوں کے بعد اپنے وجود کو گم ہوتے محسوس کر رہا تھا۔

پھر ترنم کا سر ان پڑھے پر جھک گیا جو روز کی تھی۔ میں نے سوچا اب میں اسے چپ کرا سکتا ہوں۔ زندگی ایک گیت بن جانے گی۔ تاکہ ہم دونوں مطمئن ہو جائیں گے۔

میں نے کہا: ترنم تم رو کیوں رہی ہو۔

ترنم نے سر اٹھا کر غصے سے میری طرف دیکھا جیسے میرا وجود اس کے سٹوڈیو میں قطعاً فالتو شے ہو اور میں نے غلط بات کہی ہو۔ اس کی وہ نگاہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔ میرا تجربہ اس کی حیرت سے شکست کھا گیا۔ میری زندگی میں یہ پہلی ناکامی تھی۔ اس کے بعد میں نے کبھی ترنم کو نہیں پکارا۔

ترنم کو نہیں پکارا تو کیا ہوا میری ہر وقت ہیں اس کے قدموں کی آہٹ ہے۔ اس کی چاپ جو کبھی قریب آتی ہے اور کبھی دور ہو جاتی جیسے کوئی خواب میں چل رہا ہو۔

ایک دن میں نے ترنم سے کہا: "مجھے بہت کچھ کہنا ہے میرے دل پر ایک بوجھ ہے۔"

ترنم نے کہا: "کہہ ڈالو شاید اس سے تمہارے من کا بوجھ ہلکا ہو جائے تمہیں شانتی مل سکے کہہ ڈالو۔"

اور مجھے اپنے جذباتی پن پر بڑی شرم آئی میں اُسے وہ عام باتیں کس طرح کہتا۔ ایسی باتیں جو ہر چاہنے والا مرد کسی نہ کسی عورت سے زندگی میں ضرور کہتا ہے۔ اور میں اپنے آپ سے بھاگتا اپنے سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کے اسٹوڈیو سے آ گیا۔ میں نے اپنے جی سے وعدہ کر لیا کہ کبھی رتنم سے نہیں ملوں گا جب وہ میرے دل کی بات جانتی ہے تو پھر بتانے اور کہنے سے فائدہ۔

کتنی ہی راتیں میں نے زخمی جانور کی طرح اپنے کمرے میں چکر لگا کر گزار دیں مگر لسنڈن کی ساری جل پریاں اور حسین شاموں کی مدہوش کرنے والی رونق میرے لیے ختم ہو چکی تھی ناچنے اور تلخ شراب پی کر حلق میں کانٹے چبھونے والی خوشی کو تلاش کرنا میرے لیے بے معنی تھا۔ خوشی جسے محسوس کرنے کی کوشش کرو تو لگتا ہے جیسے بھاری پتھر سے بندھی ہستی نیچے ڈوب رہی ہو۔ ڈوبتے آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارو تو اپنی ناکامی کا اور بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ ریاض اور جشیدو میری حالت سے بے خبر تھے وہ ہمدردی کے بہانے میرے زخموں کو کریدتے۔ یہ زخم بھی کہاں تھے۔ یہ تو ایک خود سے پیدا کردہ دُکھن تھی۔ یا میں اس دور سے گزر رہا تھا جب انسان دُکھ سے پیار کرتا اور دُکھی ہونا چاہتا ہے۔ میں رتنم کو بھلانا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ سے بدلے رہا تھا۔

اگر میں تم سے کوئی بات نہ کہتا تو شاید یہ جلن جو آج میرے سینے میں ہے ٹھنڈک میں تبدیل ہو سکتی اور اس خلا سے میرا سینہ آباد نہ ہوتا جسے اس کی چاہت نے پیدا کیا تھا۔ اس خلا میں نہ خواب جاگتے ہیں نہ روشنیاں ہیں نہ اندھیرا ہے۔ انسان میں بار بار عشق کرنے کی طاقت کہاں سے آ سکتی ہے؟

مگر محبت اظہار چاہتی ہے اور جب تم آنکھوں کی زبان نہیں سمجھ سکیں تو میں نے اسے اپنے دل کا حال لفظوں کے سہارے بتانا چاہا۔ مجھے لفظوں سے بھی عشق ہے نرم رو دھارے کی طرح بہتے اور مختلف شکلیں اختیار کرتے لفظ مجھ پر جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔ میں اپنی آواز کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہوں مجھے اپنے سے بھی بہت محبت ہے۔ تم کی چاہت نے مجھے آزاد پسند بنا دیا تھا مگر پھر بھی روح کی تہوں کے نیچے چھپی اپنے میں گم ہونے اور اپنے کو بچانے کی طاقت مجھے مجبور کر رہی تھی تب بہت دنوں بعد وہ میرے پاس خود آئی تھی۔

کمرے کے سامنے کھڑی بولی: "میں اندر آ سکتی ہوں؟"

اور پھر وہ میرا جواب سنے بنا اندر آ گئی اور مجھے یوں لگا جیسے میری ان کی ڈولی آموں کے بوڑھے پیڑ سے جیسے راہ پہ سے ہو کر گھاٹ پہ آن اتری ہو اور دوسرے لمحے میرا دل اس کی شدید چاہت سے بھر گیا اس کی تمنا

نے مجھے پاگل بنا دیا۔ میں نے آج تک اپنے آپ کو دھوکا دیا تھا۔ آخر میں
اپنے آپ سے ہار جانا پڑتا ہے۔ انسان دوسروں سے جنگ کر کے جیت
سکتا ہے پر اپنے سے جیتنا بڑا مشکل ہے۔

میں نے کھڑکی میں کھڑے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رتنم تم کیوں
آئی ہو؟"

بولی: "تم مجھ سے ناراض ہو گیا؟ اپنی تان پورہ لینے بھی نہیں آئے۔
اور میں اس اجنبی دیس میں تمہیں پا کر بہت خوش تھی۔ یوں جیسے تم میرے
ہاں جانتے ہو۔"

"رتنم" میں نے چیخ کر کہا۔

"کیا ہے؟" وہ حیرت سے میری طرف تکنے لگی۔ "کیا میں نے کوئی
غلط بات کہی ہے۔ تمہیں تکلیف دی ہے میں بہت شرمندہ ہوں۔"

اگر رتنم اس لمحے واپس چلی جاتی تو آج یہ احساس گناہ میرے دل
کو یوں نہ ڈستا۔ میں نے جو ساری عمر ایک گناہ گار کی طرح اپنے سے بچنے میں
گزاری ہے کچھ اور ہوتا۔ مگر المیہ تو یہی ہے کہ رتنم میری طرف دیکھتی رہی اور
پھر میں نے بھاگ کر اسے زور سے پکڑ لیا۔ ہوا ہم دونوں کے گرد رقص کرنے
لگی۔ ساری روشنیاں بجھ گئیں اور صرف یہ درد کا احساس جاگتا رہا۔ یہ کھو
دینے کا احساس جو اب تک ہے میرے بازو جو آگ میں جلتے رہتے ہیں۔

کاش میں انہیں اپنے جسم سے علیحدہ کرسکتا۔ کبھی کبھار جی چاہتا ہے میں سینہ کھول کر دل کو نکال لوں اور اس کے ریزے ریزے کرکے ہوا میں بکھیر دوں یہ پاگل دل۔ وہ چاہت جو ایک شعلے کی طرح ترنم کی آنسوؤں بھری آنکھوں کے نیچے جنم لے کر اب تک زندہ ہے۔ وہ شعلے کی طرح تڑپی اور میرے بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی۔ اس کے بعد میں نے کبھی ترنم کو نہیں دیکھا کبھی نہیں۔

مے واپس نہیں آتے۔ وقت بیت جاتا ہے۔ زندگی بہر طور گزر جاتی ہے جب میرا جہاز روانہ ہونے لگا تو ریاض نے بڑے دکھ سے کہا پتہ نہیں ترنم کہاں گئی؟ اب تم گھر جاؤگے تو یہ تک بھول جاؤگے کہ کسی بلند عظیم اور ترنم جیسی پیاری عورت سے مل چکے ہو۔ پتہ نہیں ترنم کہاں ہے؟ وہ کس شے کو ڈھونڈتی رہی تھی؟

اس تشکر سوادے میں آم کے گھنے سایوں تلے بیٹھا آدھی زندگی گزارنے پر بھی میں یہ سمجھ نہیں سکا کاش مجھ میں ذرا کم ہمت ہوتی مجھے اپنی طاقت پر ذرا کم ناز ہوتا۔ اپنی تکمیل سے کم جانیت ہوتی۔ عورت جو ہمارے لیے وقتی خوشی اور عمر بھر کی رونق ہوتی ہے۔ ترنم میں کہاں تھی؟ وہ ساری عورتیں جن سے میں نے راہ کے کنارے ،ٹیوب سٹیشن پر اور یونیورسٹی میں چاہت حاصل ہونا کی کہاں ہیں۔ کیا میں بھی کسی کے لیے ایسی دکھن بن سکا ہوں؟

اور یہ سوال کرتا۔ تم ایسی کیوں تھی اب تک ویسا ہی ہے۔ پتہ نہیں ایک
شادی کے نہ ہونے سے ساری دُنیا اندھیر کیوں ہو جاتی ہے۔ ہم نئی اور
پُرانی روایتوں کے دوراہے پر آخر کس شے کے منتظر ہوتے ہیں۔ بس
خوشی کے حصول کی خاطر زندہ رہنے کی کوشش کرتے اور مر جاتے ہیں؟

ہمارے لیے زندگی صرف پیٹ اور جسم کے احساس تک کیوں
محدود ہے۔ ہمیں نہ محبت شانتی دے سکتی ہے اور نہ مکتی۔ ہم زندگی
میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ عورتوں کے جادو میں شدت سے
قید ہیں۔ ہم اچھائی اور سچائی کی نہیں صرف عورت کی تلاش میں پھرتے ہیں۔
ہمارے لیے کسی تلاش کی گنجائش نہیں۔ ہماری ساری جنگیں اپنے سے چھڑنے
اور اپنے سے شکست کھانے میں ختم ہو جاتی ہیں۔

رتنم کو کھو کر میں کبھی خوش نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد میرا گیت کبھی
سُر نہیں پا سکا۔ وہ بھی شاید ایسا بول تھی جو کسی گیت میں نہ ڈھل سکی۔ وجود
کے شدید احساس کا شکار وہ بھی تھی۔ پر جب میں نے اس کے لیے یہ ساری
باتیں جان لیں تو وہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں آخر ہم ساری عمر کسی شے
کو کھو بیٹھنے میں گنوا دیتے ہیں یا ہمیں کسی شے کی چِنتا نہیں۔ نہ کسی گیت
کی اور نہ کسی شعر کی!

برہا کی رات

دکن سے پریم سنگھ کا خط آج ہی آیا ہے۔ ایک پرزہ کاغذ ہے صرف ایک پرزہ۔ پریم سنگھ کو نہ میں نے کبھی دیکھا اور نہ ہی اُس نے مجھے۔ پر موہن سنگھ کے مرنے کی خبر اُس نے صرف مجھے لکھی ہے صرف مجھے۔ مرتے مرتے اس نے پریم سنگھ کو تاکید کی ہوگی کہ میں دُور پنجاب دیس میں بیٹھی موہن سنگھ کے مرنے پر ضرور دکھی ہو جاؤں گی۔ کیونکہ میں جو اور بہت سی عورتوں کی طرح اُس کی دامن بنوں اُسی کی طرح بوڑھی ہو رہی ہوں مرنے کی راہ دیکھ رہی ہوں اس خبر کو سُن کر دو آنسو ضرور گراؤں گی۔ انسان کو یہ تسلی کہ دُنیا کے کسی کونے میں کوئی اور اس کے اپنوں سے الگ اس کے نہ ہونے سے رنجیدہ ہو گا کتنی بہت ہوتی ہے۔ انسان مرنے کے بعد بھی اس دُنیا سے کوئی نہ کوئی رشتہ محسوس کرنا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟

آج بھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلے پہل موہن سنگھ کو کب دیکھا تھا۔ جب یکایک میں نے ہوش سنبھالا ہے تو اُنہیں اپنے گھروں میں آتے

جاتے پانی بھرتے اور گاتے پایا۔ اُس سے پہلے اُس کے کندھوں پر سوار ہو
ہم میلہ دیکھنے جایا کرتے تھے۔ بڑے بھیّا، بیبی، ہم سب ایک ساتھ ہی
تو پڑھے اور بڑے ہوئے تھے۔ بیبی مجھ سے یہی کوئی ایک سال بڑی تھیں
شرارت اُن کی نس نس میں بھری تھی ایک منٹ کو ٹک کر نہ بیٹھتیں۔ ماں کے
منع کرنے کے باوجود گھر میں زور زور سے گاتیں۔ بھیّا اُن کی چٹیا کھینچ کر کھینچ
دیتے تھے۔ پھر دونوں میں خوب زور سے لڑائی ہوتی۔ ماں رسوئی گھر سے چلاتی
پکارتی رہتیں۔ جب لڑائی نہ تھمتی تو اُٹھ کر آتیں اور سب سے زیادہ مار بیبی پر پڑتی۔
ادھر اُدھر سے موہن سنگھ نہ جانے کہاں سے آجاتا۔ آنگن میں سے ہی شور مچاتا
ہوا "بڑی بہو! ہاتھ روکو پھول سی بچی کو مار رہی ہو۔ بھلا کوئی کنیا کو بھی مارتا ہے۔
لڑکوں کو اتنا سر چڑھانا اچھا نہیں۔ نہ جانے تم لڑکیوں کے پیچھے کیوں پڑ جاتی
ہو۔" اور میری ماں اپنا ہاتھ روک کر چپکے سے واپس رسوئی گھر میں چلی جاتیں۔
موہن سنگھ ہم سب کو اپنے گرد جمع کر لیتا۔ بھیّا کو کہتا "دیکھو لالہ اگر بٹیا
سے معافی نہ مانگو گے تو میں کبھی کندھوں پر بٹھا کر میلے میں نہیں لے جاؤں گا۔" اور
بڑے بھیّا فوراً بیبی کا ہاتھ پکڑ لیتے۔ صلح ہو جاتی موہن سنگھ وہیں بیٹھ جاتا ہم
اُس سے سانپوں کی اور جانوروں کی کہانیاں کہنے کی التجا کرتے۔

میری یادیں آج بھی وہ صورت اُبھرتی ہے موہن سنگھ کی طرح میں نے
کسی کو کہانی سناتے نہیں دیکھا۔ وہ جنوں کی کہانیاں کہنے کا اُسے بہت شوق

تھا۔ ہم کہتے "موہن بھیا" کہانی کہو! وہ کہتا "نہیں منیا تم رات کو ڈر جاؤ گی۔ یہ بڑے بڑے بھوت خواب میں نظر آئیں گے۔ تم شور کرو گی تو بڑی بو مجھے ماریں گی۔ نہ بابا میں کہانی نہیں کہتا۔ رام رام!" اور اٹھ کھڑا ہوتا۔ ہم سب اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتے۔ اس کے کندھوں سے لٹک جاتے اور اسے زبردستی بٹھا لیتے۔ کہانی جاری ہوتی کہ کہیں سے آواز آتی "موہن بھیا" اور وہ وہیں وہیں چھوڑ چھاڑ کھڑا ہو جاتا۔ نہ جانے اس نے کتنی کہانیاں ایسے ہی ادھوری چھوڑ دی ہوں گی۔ زندگی کی طرح اس کی کہانیوں کا اختتام ہم نے کبھی نہیں سنا۔

صبح اٹھتے تو سب سے پہلے اس کے جانے کی آواز کان میں پڑتی۔ وہ ماں کہتی "اٹھو موہن۔ بھیا اٹھ گیا ہے۔ وہ کنوئیں سے پانی نکال رہا ہے۔ وہ ابھی دروازہ کھٹکھٹائے گا اور تم کو سوتا دیکھ کر تم سے خفا ہو جائے گا۔" ہم آنکھیں ملتے ہوئے بستروں میں بیٹھ جاتے۔ ماں ایک ایک کا منہ دھلاتیں اور پھر ہم صاف ستھری رسوئی میں ماں کے پاس بیٹھ کر منتر یاد کرتے۔ ماں کام کرتی جاتیں بتاتی جاتیں۔ ان دنوں چولھے میں آگ کتنی بھلی لگتی تھی۔ سرخ شعلے اٹھتے اور توے کی سیاہی سے ٹکراتے۔ روٹیاں اترتی رہتیں۔ ماں انھیں ایک ٹوکری میں لپیٹ کر رکھتی جاتیں اور ہم سب میں سے [illegible] کی طبیعت بہت بے صبر تھی۔ اسے کسی شے کا انتظار کرنا برا لگتا تھا اور شاید

اسی لیے اُس نے مرنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ خُود ہی موت کو بُلا لیا۔ جیسے موت بھی کوئی چاٹ تھی جسے وہ بچپن میں مزے لے لے کر کھایا کرتی تھی۔

نہ جانے جیجی نے شیام کو چاہنا کیوں شروع کر دیا۔ شیام میں اُسے کیا دکھائی دیا۔ میرے لیے تو شیام میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے زندگی میں اُس سے زیادہ معمولی کبھی کوئی شخص نہیں لگا۔ اپنے کام میں مگن، بہت ہی کم باتیں کرنے والا۔ وہ جیجی سے کوئی چار سال بڑا تھا۔ جن دنوں ہم سب اپنی اسکول میں پڑھتے تھے وہ کالج میں تھا۔ اپنی کتابیں لیے خاموشی سے آتا۔ گلی میں سے گزرتے نیچی نگاہیں کیے بس گزرتا چلا جاتا۔ موہن سنگھ اکثر کہا کرتا تھا: "شیام تو چندر بھو کی بٹیا ہے۔" چندر بھو اُس کی ماں تھیں۔ بڑی باتونی، دولت پر جان دینے والی۔ زیور اور روپے پر ریجھ جانے والی۔ محلے بھر میں اُن سے بڑھ کر لڑاکا کوئی عورت نہ تھی۔ گرمیوں کی سہ پہروں کو جب دن ذرا ڈھل کر ٹھنڈا ہو جاتا تو ساری بہوئیں چھوٹی چھوٹی کھٹولیاں بچھا کر بیٹھ جاتیں۔ باتیں کرتیں، چرخے کاتتیں اور دُنیا جہان کی بہو بیٹیوں کے قصّے کہتیں۔ چندر بھو کی آواز ان دنوں بھی سب سے زیادہ بلند ہوتی تھی۔ انھیں کسی کا ڈر نہیں تھا وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھیں۔ ہاتھ ہلا ہلا کر زور زور سے ساری بہو بیٹیوں کے قصّے کہتی رہتیں۔ ہمیں اُن سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اور پھر بھی نہ جانے کیوں شیام کو جیجی نے چاہنا شروع کر دیا۔ چاہت میں سارے ڈر دُور

کیوں ہو جاتے ہیں اور انسان کو صرف ایک ہستی ہی کیوں دکھائی دیتی ہے؟ کیا محبت کی روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں؟

مجھے وہ رات کبھی نہیں بھول سکتی، وہ رات میری یاد میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سردیوں کی طویل راتوں میں سے زندہ رہنے والی صرف ایک رات۔ جیجی بہت دنوں سے چپ چپ رہا کرتی تھیں۔ سکول سے آتیں تو ماں کے کہنے کے باوجود دودھ نہ پیتیں، کھانا نہ کھاتیں اور سر پہ ہاتھ رکھ کر لیٹ جاتیں۔ ماں بہت فکرمند تھی۔ ماں نے کہا تھا "کاما چل مجھے وید جی کے پاس لے چلوں۔" تو اُس نے کہا "نہیں ماں طبیعت خراب نہیں صرف امتحان نزدیک ہے نا، میں سکول سے آکر لیٹ رہتی ہوں تو جی اچھا ہو جاتا ہے۔" اور ماں رسوئی گھر کے چکروں میں فکرمند سی کئی بار کاما جیجی کو آواز دیتی ہے کہتیں "جا بڑی بہن کے پاس بیٹھ اُس کا جی اچھا نہیں اُسے کھانا تو کھلا، نہ جانے اُس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا کیوں پڑ رہا ہے جیسے کسی نے اُس کے پرانوں سے جان ہی کھینچ لی ہو خون کسی نے چوس لیا ہو۔" اور جیجی لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر کہتیں "ماں مجھیں تو وہم ہے میں مر نہیں جاؤں گی بالکل نہیں مروں گی۔" اور ماں کام کرتے کرتے کہتی "رام کا نام لے لڑکی مرنا اتنا آسان نہیں۔" اس رات سخت سردی تھی، ہوا بہت زوروں سے کواڑوں کو دھڑ دھڑا رہی تھی چل رہی تھی۔ بڑے بھیا کا امتحان شاید نزدیک تھا۔ اپنے کمرے میں

لالٹین جسے جلائے پڑھ رہے تھے۔ ماں سارا دن کی تھکن سے بےسُدھ
سی سو رہی تھی۔ ہمارے کمرے میں کوئی روشنی نہ تھی۔ کوئی آدھی رات کا
وقت ہوگا۔ میں نے جانا جیسے سپنا دیکھ رہی ہوں۔ آنکھ کھلی' ذرا ہوش آیا
تو بیبی میرے پاس لیٹی تھی۔ میں نے بول کر پوچھنا چاہا تو اُس نے اپنا ہاتھ
میرے مُنہ پر رکھ دیا۔ ہاتھ اتنی سخت سردی کے باوجود پسینے سے گیلا تھا'
جیسے پانی میں بھیگا ہوا ہو۔ بیبی کی سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ اور وہ
رو رہی تھی۔ میں چپ تھی' مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کروں۔ ہچکیوں سے
اُس کا سارا جسم ہلنے لگا اور میں پریشان سی اُس کے قریب لیٹی چھت کی
طرف تکتی رہی۔

کتنی دیر میں بےحس پڑی رہی۔ پھر میں نے ہولے ہولے اپنی بائیں
بڑھا کر بیبی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ نہ جانے بیبی کو کیا دُکھ ہے۔ اگر کوئی اور
رات ہوتی تو میں ماں کو جگا دیتی۔ اسے زور سے چیخ کر آواز دیتی پر اُس
رات دل میں سے کسی نے کہا' یہ دُکھ ماں سے کہنے کا نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا
اگر اُس رات میں ماں کو آواز دے دیتی۔ پر وقت کو کون واپس بلا سکتا
ہے اور یہ دُکھ کہاں جانے جو کچھ ہم نے نہ کیا اگر کر لیتے تو دُکھ میں کمی ہو
جاتی دل کو کس طرح چپتا ہے۔

بیبی نے بتایا وہ شیام کو ملنے جانے والی تھی۔ پر رات کی سردی

بارش اور خوف ان سے اُسے ڈر لگتا ہے میرا دل زور سے دھڑکا۔ میرا جی چاہا
میں بیبی کے منہ پر ایک تھپڑ مار دوں۔ پر میں خاموش رہی۔ میں نے بیبی کو اور
زور سے اپنے سے لپٹا لیا وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔

اُس رات کے بعد کئی راتیں آئی ہیں وہ بیتی راتیں اگر واپس آسکیں
تو شاید میں بیبی کو اُس کی بھول بتا سکتی۔ پر ان دنوں تو کسی بات کا احساس نہ
تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ تارا میری بہن ہے اور اُسے ہر رات شیام
سے ملنا ہے۔ شیام جو جسونت رام کا بیٹا تھا اور جو نظر بچا کے گلی میں سے
گزرا کرتا تھا اور جسے لوگوں نے بہت کم بات کرتے سنا تھا۔ میں ڈرتے
ڈرتے صحن میں کھڑی ہو جاتی۔ بیبی ہولے سے دروازہ کھولتی شیام ہماری
ڈیوڑھی میں آ جاتا اور چند لمحوں کے بعد واپس چلا جاتا۔ بچپن کی چاہتیں،
بھولے پن کی چاہتیں، دیوانگی کے زمانے کی باتیں۔ اگر بیبی زندہ ہوتی تو شاید
اُن راتوں کو یاد کر کے مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔

موہن سنگھ کی گونج دار آواز ہمیں سنائی دیتی رہتی۔ ہمارے گھروں
میں اس کے ڈر سے کبھی چور چکار نہیں آسکے۔ بچپن میں جو چوکیدار کی آواز
سن کر کتنا ڈر لگا کرتا ہے پر اس صدا کو سن کر دل میں ایک طاقت آ جاتی تھی۔
جیسے ہر طرف وہ ہو اور ڈر کی باتیں پھٹکنے کی بے چارگی میں ہوں۔

جب بیبی نے کہا کہ وہ اور شیام کسی دوسرے شہر کو جانے والے

میں تو میرا رنگ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ میرے پاؤں سے کسی نے ساری جان
نکال لی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں نے پوچھا تھا "بھیا سوہن بھیا سے ڈر
نہ لگے گا۔" مجھے اس سے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔ کاش
میں نے اسے روک لیا ہوتا۔ پر گزرے دنوں میں بھی دکھ تو زندہ رہتا ہے
اور شام کی ہوا کی طرح سینے میں چکر لگاتا ہے۔ اور اس نے ہنس کر کہا تھا
"اس سے کون ڈرے گا۔" یہ سارا کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ میرا ذہن اس
تیزی سے سوچ بھی تو نہ سکا۔ کسی پرندے کی اڑان کے سائے سے زیادہ
تیزی سے سب کچھ ہو گیا۔ شیام اور تارا بھابی کو میں اور موہن بھیا دریا پار
جانے والی ناؤ میں سوار کرا کے خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

اور دوسری صبح ہمارے لیے مصیبتیں لے آئی۔ ایک چپ چاپ تھی
جس کا جادو ٹوٹ گیا۔ ایک طوفان تھا جس کے بند کھول کر کسی نے اسے
آزاد کر دیا۔ میں نے اپنے حالوں تو سوچا تھا کہ میں بھی اور شیام کے کام
آ رہی ہوں، بہن کے لیے کچھ کر رہی ہوں۔ سنت کا دوں میں بھی تو یہی لکھا ہے
"کسی کی مدد کرنا سب سے بڑا پن ہے۔" پر چندر بھوا کی گرج سے سارا محلہ
دہل اٹھا۔ چندر بھوا ایک بات سے تو سچی تھیں۔ میری ماں کی طرح اس نے
بھی بیوہ ہونے کے سبب سال شیام کے سائے گزارے تھے۔ اور ماں
کو تو ایسی چپ لگ گئی کہ گویا بات کہنے اور سننے کے لیے کچھ باقی نہ رہا ہو۔

رہوں گھر سُونا پڑا رہا۔ بڑے بھیا اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ ساری بہوئیں
کام دُوں کرتا ہی تو لگاتی پھرتی تھیں اور اس کے بعد سے میں نے موہن سنگھ کو
کبھی گنگناتے نہیں سُنا۔

تیسرے دن بڑے بابا کسی کی طرف دیکھے بنا ماں نے پیچھے سے
پران تیاگ دیے۔ بابا کے نہ رہنے کا ہم سب کو اتنا دُکھ نہ تھا پر اب
ہمارا کون ہے۔ بابا جی نے ساتھ گیا ساری زندگی گھر سے چلی گئی۔ وہی منڈیر یا
جھجروں اور گلیوں سے گونجنے والا گھر مرگھٹ لگتا تھا۔ ان دنوں اگر موہن سنگھ
نہ ہوتا تو نہ جانے ہمارا کیا بنتا؟ ہم شہر سے گاؤں لوٹ آئے!

موہن سنگھ نے کہا تھا "منیا یہ کرم کا چکر نہیں، اپنی اپنی سہار کی بات
ہے تم میں پاپا نانا نے بہت شکتی رکھی ہے اور اس لیے تم کو دُکھ بھی زیادہ دیا
ہے۔ دل کو ذرا سخت بناؤ تو ہر دُکھ ریت کر ادھر اُدھر گر جاتا ہے۔ اگر تم
ہر دُکھ کو جی سے لگاؤ گی تو جینا بہت مشکل ہو جائے گا۔" اور ان دنوں یہ
جاننے کے باوجود کہ سہار کیا ہے، جینا کیا ہے۔ میں نے موہن بھیا کی بات
کو پلّے باندھ لیا۔ دن تو بہرحال گزرنے تھے۔

سچ مچ اگر موہن میرے پاس نہ ہوتا تو میں کیا کرتی۔ پر آج سوچتی ہوں
تو لگتا ہے کبھی کبھار دُکھوں کے سامنے سر ٹیک دینے سے بھی بڑا آنند ملتا
ہوگا۔ اور مجھے تو موہن کی باتوں نے چٹان بنا دیا۔ نہیں نہیں میں غلط سوچتی

ہوں۔ موہن بھیا نے مجھے دنیا اور اس کے دکھوں سے مقابلے کے لئے
تیار کیا تھا ورنہ میں ہمیشہ دیا کی طرح ترستی رہ جاتی۔ کرن! کیا بتاؤں کیا
ہوتا ہے جب بھیا کے ہوش بھی جاتے رہے تھے۔ ان کی طاقت اور محبت
بھی مجھ سے چھن گئی تھی اور سارا بوجھ ایک فرد۔ ویسے بھی گھٹی گھٹی کہانی لگتی ہیں
میں یہ سوچ کر کہ میں نے گھر کو سنبھالا ہے مجبور ہوں۔ ان کا سہارا ہے زندگی میں
اصل تو یہ ہے کہ موہن بھیا نے ایک فرض سمجھ کر کسی احسان کے بنا سارا
بوجھ اٹھا لیا تھا۔

اس بڑی حویلی میں اکیلی بیٹھی میں اکثر سوچا کرتی تھی اور پھر سوچنے کو بھی
کچھ باقی نہ رہا۔ بھیا نے اپنے ہوش کھو دیے اور مجھ پر زندگی کا سب سے بڑا
دکھ آن پڑا۔ وہ طویل راتیں اور نہ ختم ہونے والے دن موہن نے جاگ
جاگ کر کاٹے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کبھی سویا بھی ہوگا۔ اگر کبھی میں نے رات
کو بھیا کی خاطر جاگنا چاہا ہے تو اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر "دیا! کیا تم کو مجھ
پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔ کیا تم سوچتی ہو میں بھیا کی دیکھ بھال ٹھیک سے
نہیں کرتا" مجھے خاموش کر دیا۔ میں کہتی موہن بھیا تم تھک گئے ہو گے۔
کہتا "دیا میں سب اوروں کے لئے کچھ کر رہا ہوں۔ کیا بڑے بھیا میرے
کچھ نہیں"

میں نے پھر بار اس سے ہار مان لی ہے۔ دوسرے کو سہارا دیا ہی تو اس

کی سب سے بڑی زینت تھی۔ دوسروں کے لیے اُس نے کبھی اپنے دکھ درد
کا خیال نہیں کیا۔ اگر بھگوان بھی کسی روپ میں آئے تو میں اُسے کبھی نہ پہچانوں
گی۔ سوائے موہن بھیا کے اُس کا کوئی روپ نہیں ہو سکتا۔

مجھے چپ چاپ بیٹھے دیکھتا تو کہتا۔ دیکھو منیا بھیا شباب ہو جائیں گے
تو ان کی سگائی کریں گے پھر دو سال کے بعد بیاہ کریں گے۔

میں کہتی کیوں سگائی کے بعد بیاہ دو سال کے بعد کیوں؟

کہتا دیکھو منیا تم ہر بار جلدی کرنے میں سب کام گڑبڑا دیتی ہو۔ بس دو سال
انتظار کروا دیں گے بھیا کو۔ اور میں بھیا کی طرف دیکھتی جو روز بروز سوکھتے
جا رہے تھے اور جن کی نگاہوں میں سوائے ویرانی کے کچھ نہ تھا۔

میں کیا بھولوں اور کیا یاد کروں۔

تارا بھی دو سال کے بعد گھر واپس آئی تو پہچانی نہ جاتی تھی۔ شام کو
چند بھولے بھٹکے ڈھونڈ ڈھانڈ کر واپس لے آئی تھیں۔ انھوں نے اُسے حاملہ
کر دیا تھا۔ تارا بھی کو چھوڑ کر ماں کی محبت اور سنہ بیاہ کا لالچ شیام بھیا
لے گیا۔ شہر میں نہ جانے کہاں جا چھپی تھیں۔ تارا بھی نے جیتے جی ہی انکار
کر دیا اور گاؤں واپس آنے کے تیسرے دن بعد اُس نے دھتورہ کھا کر
اپنی جان کی شرمندگی کو چھپا لیا۔

میں کہتی ہوں آخر دکھ سکھ کے ساتھ بھول تو انسان سے ہی ہوتی ہے

تارا جی نے زہر کا اثر کس شے سے چھٹکارا پایا تھا۔ زندگی کے تند تیز ریلے
ایک بار وہ رخ الٹ جاتے ہیں پھر یہ دھبے کبھی نہیں مٹتے کبھی نہیں کیا؟
تارا جی بہت جذباتی تھی، بڑی ہی بزدل۔ اگر وہ بھی اس طرح تھوڑے سے دن
موہن بھیا کے پاس رہتی تو اسے جینے کا ڈھنگ آ جاتا۔ یا پھر یوں ہوا ہوگا
جب کوئی آس باقی نہیں رہتی تو جینا بیکار کا بوجھ لگنے لگتا ہے اور تارا تو سدا
کی چنچل تھی اس سے کوئی بھی بوجھ کب اٹھ سکا ہے؟

اور اس کے بعد زندگی ایک خالی سنسان ویرانہ تھا۔ بیٹھے بیٹھے
بھیا کی خالی نگاہیں بھٹکتیں اور بڑی حویلی کی چھتوں پر چپ چاپ قدم دھرا
اداسی تھی۔ اس اداسی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور وہ تب
نے مجھے بہلانے کے لیے قصے کہنے شروع کیے۔ وہی کہانیاں جن کو
ہم نے بچپن میں سنا تھا۔ جیسے بھیا کی دادا دادی اور دیکھ بھال سے جتنا
وقت بچتا اس میں بیتی باتوں کے ہزاروں دھندلے گھر کے کام ہوتے اور
یہ خاموشی بھرا دم گھونٹنے لگتی تو موہن گھبرا کر کہتا تھا میں تمہیں کسی دن
ایک اصلی کہانی سناؤں گا۔ اصل اصلی ہی تو صبر کی بات ہے۔ اور
اس اصلی کہانی میں پریم دستگیر کا نام بھی کہیں آ گیا تھا ورنہ موہن کی زندگی
تو ایسی روشنی تھی جس کے آگے پیچھے اندھیرا ہوتا ہے اور جو اکیلی کرن
کی طرح اپنے نور سے آپ ہی روشن ہوتی ہے۔

پریم سنگھ کے خط کے باوجود مجھے یقین نہیں آتا کہ موہن سنگھ مر گیا ہے
موت کس طرح اسے چھو سکتی تھی وہ بھی آنسوؤں کی طرح لپٹ کر اس کی گود
میں گر گئی ہوگی۔ موت کو اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کیسے ہوئی۔ موت
نے ماں کو سمیٹ لیا کہ ماں تو کانچ سی مورت تھی۔ بڑی ہو جانے کے باوجود
اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہوا کے ایک ہی جھونکے ہی سے گر جائے گی۔
اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں مجھے آج یاد پڑتا ہے دیا جلا کرتا تھا جیسے آنسو
بھرے ہوں۔ ماں جب بھگوان کی مورتی کے سامنے آنکھیں بند کر کے ہاتھ
جوڑے آرتی اتارتی۔ تو میرا من ڈول جاتا۔ اس کے مرنے کے بعد کبھی کسی
پوجا میں دل نہیں لگا۔ بھگوان کی مورتی کا سارا سنہرا پن ماں سے تھا۔ کاؤ
کے گھر میں اکیلے طاق میں بھگوان کی میلی مورتی کی آنکھوں میں نہ کبھی جوت
جلتی ہے اور نہ ہی کبھی ان ہونٹوں سے ہنسی پھوٹتی ہے ماں سب کچھ
اپنے ساتھ لے گئی۔ جب بھی مندر میں کبھی بڑی پوجا کے سمے موہن جیت
مجھے گھسیٹ کر لے گیا ہے۔ میرا من شانتی پانے کی بجائے بہت دکھی
ہو گیا ہے۔ جو منتر مجھے یاد تھے وہ سب میں بھول چکی ہوں پر کرشن بھگوان
کی گیتا آج بھی میرے سامنے ہے اور اس میں لکھا ہوا ہے "موت تو بس
ایک دو گھڑی کا بچھونا ہے۔ نیند کی ایک جھپکی ہے۔" اگر یہ بات ہے تو
ہم بچھڑنے والوں کے لیے دکھی کیوں ہو جاتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ گنگا جو

میں لکھے ہوئے لفظ ہمیں تسلی نہیں دے پاتے اور سارے دُکھ سُکھ کو سہنے کے
لیے ہمیں اپنی جان کو خود اس بوجھ تلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ کیسی بے چینی
ہے یہ کیسا سُکھ ہے؟ اور موہن بھیّا نے مجھے ہمیشہ یہی کہا تھا۔ "بھیّا
سارے دُکھ سُکھ کی بات ہے جس طرح اوپر کی چیزوں میں چہروں میں
جگنو ان میں سُندرتا ہم اپنی آنکھ سے پیدا کرتے ہیں ایسے ہی من کی شانتی اور
ہر شے کی دُکھی سوچ کی بات ہے اور کچھ نہیں۔"

اور اُس نے ہی تو مجھے کہا تھا۔ "بھیّا دُکھ تو ایک سان ہے جس پر
چڑھ کر تم میں چمک آتی ہے۔ دُکھوں کے بعد سُکھ آتے ہیں، یہ چکر ہے
تمھارے لیے یہ چکر ذرا الٹا ہوتے ہوئے چل رہا ہے پر کسی نہ کسی دن آتے
قدموں چلتا سُکھ تو آئے گا ہی۔" اور یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ بھیّا کی آنکھوں
سے دُکھ ہو گیا ہے۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے ہیں۔ نار ویدی جی
ناش ہو کر نچڑے سُوکھ گئی ہیں اور ان کی شکل بھیّا میری آنکھوں سے
دُور ہو گئی ہے میں سُکھ کا انتظار کرنے لگی۔ بھلا موہن بھیّا نے جو کہا تھا وہ
کبھی جھوٹ ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رات
تھی جس میں بھیّا کے سرہانے بیٹھے ہیں اور موہن انتظار کرتے تھے۔

بھیّا کا سانس اُس رات بہت مشکل سے چل رہا تھا۔ ویدی جی سی
سب کوششیں کر چکے تھے۔ جاتے جاتے انھوں نے کہا تھا اگر یہ رات

گڑگڑیں تو شاید وہ بچ جاتیں۔ جیسے موت کے پنچھی سب طرف دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے راگ جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنے تھے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ بڑی خوفناک آنکھیں چاروں طرف سے گھور رہی تھیں۔ کمرے کے طاق میں پڑی بھگوان کی مورتی بہت دکھی لگ رہی تھی۔

موہن بھیا نے کہا تھا۔

"منیا کہانی سنو گی؟"

"ہاں بھیا۔"

"دور کے ایک نگر کی بات ہے منیا، دو بھائی اس کے گاؤں میں رہتے تھے دونوں میں بہت پریم تھا۔ جیسے تم میں اور تارا میں۔ نگر کے راجہ کی باندیاں بڑی خوبصورت تھیں، ان میں سے بڑا بھائی جیوتی کو چاہنے لگا۔ چاہت جانتی ہو کیا ہوتی ہے منیا جب آگ کا ایک شعلہ سب طرف لپٹ جائے اور اس آگ میں پریمی جل جائے اس کو ہر بات پر سکھ کا انوبھو ہو اور پھر بھی سکھ کہیں نہ ہو ایک جلن ہو جیسے ہون کنڈ میں سامگری ڈالتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ہوتی ہے تو ایسی ہی چاہت تھی۔ اس بڑے بھائی کے جی میں۔ پر وہ کر کچھ نہ سکتا تھا۔ جیوتی راجہ کی باندی تھی اور محل کی دیواروں سے باہر نہ آ سکتی تھی۔ مگر اس لگن سے وہ بھی بے خبر نہ تھی۔ پھر ایک شام آئی جب راجہ شکار کے لیے باہر گیا۔ راجہ کے ساتھ باندیاں تھیں

ڈوب گئے۔ پھر گھوڑوں کے ہنہنانے اور اُن کے ٹاپوں کی آوازیں نزدیک
آتی گئیں۔ ہری سنگھ نے کہا تم گھوڑے کو اور تیز کرو۔ میرا فکر نہ کرو بس
حویلی کا رخ کرنا۔ میں بچ گیا، اگر میں اُن کو روک کر مار سکا تو تم سے آ ملوں
گا ورنہ انتظار نہ کرنا۔ ابھی ہم دیپ ہی پہنچے تھے۔ بچ نکلا اور بڑا بھائی وجے کئی دنوں سے چند
لمحات میں بیٹھے رہتے۔ پھر سپاہی اور قریب آ گئے۔ ہری سنگھ نے
زور سے داہنے ہاتھ بندوق اور بڑے بھائی نے راجہ کے جوانوں کو اس
کے پیچھے دیکھ کر ماؤ کر پانی میں دھکیل دیا۔ راجہ کے جوانوں کی للکار دُور تک
پانی پر بھی بڑے بھائی کا پیچھا کرتی رہی اور ہری سنگھ کی چیخ جنگل کے گھنے
اندھیرے میں خاموش ہو گئی۔ بڑا بھائی اس للکار کا جواب نہ دے سکا۔ یہ
زندگی بھر آخر تک۔ وہ اس بات کا انتظار کرے گا جب بھی ہمت ہے وقت ملے
اُدھر قبیلے کی للکار کے بدلے انہیں پکارے گا اور پھر اس کی بوڑھی رگوں کی
ہمت اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ یہ ایک قرض ہے جسے چکانے کے لیے
وہ زندہ ہے۔"

تب تو مجھے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ موہن سنگھ سے پوچھ سکوں کیا یہ تمہاری
کہانی ہے مجھے کسی شے کا ہوش نہ تھا۔ ویسے کی تو بہت تیز تھی وہ کانپ اٹھا
بچھ گئی ہم دونوں ڈر گئے۔ رات ڈھل رہی تھی ہم سے موہن بیٹا کس شے سے
ڈر سکتا تھا بھلا۔ سرزمین کا ایک پھیرا لگا دیا۔ ہمارے ان جانے میں موت

کوٹھڑی میں گھس آئی تھی اور اس نے بڑے بھیا کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں
سے ڈھانپ لیا تھا۔

ہر موڑ پر میں نے سوچا ہے، سدا یہی سوچا ہے کہ بس اب راہ
ختم ہو گیا ہے، میرے لیے کچھ باقی نہیں رہا مگر موہن بھیا نے مجھے ہاتھ
سے پکڑ کر آگے چلتے ہوئے راہ پر بڑھا دیا ہے۔ مُرلی منوہر بھی تو موہن
بھیا کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور ادی تاش کی پیدائش کے بعد سے
تو اس نے مجھے الگن کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بہت کہا میں تمھاری ہی
دُنیا ہوں مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا "وہ پرانے دنوں کی دُنیا اب کہاں ہے
وہ تو شہر میں کہیں کھو گئی ہے۔ جس دن سے تمھارے کندھوں پہ پیسا کے
ٹکوں کا بوجھ آن پڑا ہے تم اجنبی بن گئی ہو"

سارے اپنے بچھڑتے ہوئے میرا ساتھ چھوڑ گئے اور آج موہن سنگھ
کی موت کا بھی سندیش آ گیا ہے۔ وہ بھی جھوٹ ہے! اصل جھوٹ پریما
سنگھ نے اپنی لکھ دیا ہے۔ بھلا موہن سنگھ کو بھی کسی سے شکست ہو
سکتی ہے۔ وہ بھی کبھی ہار سکتا ہے۔ وہ تو دوسروں کو ہرا جاتا تھا۔ زندگی
کے دکھ اس سے ٹکرا کر خود ہی پیچھے ہٹ جایا کرتے تھے۔ وہ تو لوہے کی
ایک دیوار تھا۔ میں کیسے سوچوں کہ موہن کے چاندی کے تاروں سے بھرا
ہوا سر، اس کی سفید بھویں اور چمکیلی آنکھیں اس کے مضبوط ہاتھ شان

کی راکھ بن گئے ہیں۔ اس کے گیتوں کی گونج آج میرے دل کے ویرانے میں زخمی جانور کی طرح پھڑپھڑا رہی ہے، چکر لگا رہی ہے۔ کاش کوئی مجھے وہ زمانہ واپس لا کر دے سکے۔ کیا وہ گیت اس کے گلے ہی میں گھٹ گئے ہیں اور وہ للکار اس کا کیا بنا۔ جینا کہاں گئی؟ یہ سب باتیں اب بھی چند رازوں کی طرح میرے دل کو پریشان کر رہی ہیں۔

موہن بھیا نے کہا تھا تم انتظار کرو جوسے سکھ تمہیں آ ملے گا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں آج سکھی ہوں۔ اگر بچوں اور رونق ہنسی اور گیتوں کا نام سکھ ہو سکتا ہے تو! پر نہ جانے کیوں جب بھی کبھی بیتا وقت یاد آ جاتا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ دکھ بیت جاتا ہے پر اس کی یاد نئے سرے سے دکھی کر دیتی ہے۔ اوما ناش کے بچے میرے گرد کھیلتے ہیں مجھے دادی اماں کہتے میری گود میں گھس آتے ہیں مجھ سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے ہیں تو مجھے اپنا بیتا وقت یاد آ جاتا ہے اور بیچارا ناتھی یاد آ جاتا ہے۔ تارا کا بچہ جس کو چندر بھیّو اس سے زبردستی چھین کر لے گئی تھیں۔ اب جوان ہو گا میرے اوما ناش کی طرح بچوں والا ہو گا۔ زندگی دکھ اور سکھ کے درمیان ایک ندی کے بہاؤ کی طرح خاموشی سے بہتی رہتی ہے اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔ دکھ ہو یا سکھ وقت بیت جاتا ہے۔

اروی ناش سے بیاہ کے بعد موہن بھیا نے کہا تھا " ماکمن اب میرا
وقت ختم ہو گیا ہے ۔ میں واپس جاؤں گا ۔ مجھے ایک قرض چکانا ہے " اور
پھر قرض چکانے کے لیے وہ کہانیاں لکھنے والا زور زور سے گانے والا
ہنسنے اور پریشانیوں کو ہاتھ کے اشارے سے دور کر دینے والا موہن بھیا
واپس اپنے قبیلے کے راجہ کے پاس چلا گیا ۔
تارا بھی کو شیام کے ساتھ ناؤ پر چڑھاتے ہوئے اُس نے کہا تھا
مجھے ٹھیک یاد ہے جیسے یہ کل کی بات ہو ۔ اس نے کہا تھا شیام
بھیا پریم بھی سہار کی بات ہے اگر تم تارا کو سہارا نہیں دے سکتے تو اب
بھی رک جاؤ اور ناؤ میں بیٹھے بوڑھے ماجھی نے بڑی بے چینی سے اپنی چھوٹی
سی کھڑی ہوئی ناک کو بڑے سے انگوٹھے سے دباتے ہوئے کہا تھا " ہاں
بھیا پریم کا سہار ہے بس اور کچھ نہیں ہے " اور پھر جب ناؤ کنارے
سے ہٹ کر دور چلی گئی تھی تو موہن بھیا نے زور سے کہا تھا " تارا کے
دل میں روشنی روز روز نہیں جلے گی ۔ اس جوت کو زندہ رکھنا تمہارے
ہاتھ ہے ۔ " اور شیام نے تب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا ۔
میرے جی میں ایسی کوئی جوت نہیں جلی ۔ مگر میں منوہر اور میں بڑی
خاموشی سے دو ساتھیوں کی طرح کندھے سے کندھا ملائے چلتے رہے
ہیں جیسے اب اروی ناش اور کملا چل رہے ہیں ۔ جیسے میرا بھیا ناپو اور کبھی

دن کسی روشنی کے سمندر سے کترا جانے سے چل کر زندگی کا راستہ طے
کرنے کا۔ اور یہ سوال کہ امکان ہے، ان دیکھا کون ہے موہن جیسا اور ویسا
نا تمام رہیں۔ اور زندگی ان چھوئی رہیں، ادھوری کہانیاں جن کا شروع بھی سمجھ
نہیں آیا جن کا انجام بھی معلوم نہیں ہوا میرے گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ اور
میں سوچ رہی ہوں کیا دل سے ساری تمناؤں کا نکل جانا اور کسی نئی آس
کی روشنی کے نہ رہنے کا نام بڑھاپا ہے یا اس وقت کا سر پہ آ جانا
جب واپس جا کر قرض چکانے کے سوا اور کوئی کام نہ رہ گیا ہو؟ موہن سنگھ
بھی تو زندہ نہیں ہے جس سے میں پوچھ سکوں اور اس کے ساتھی پریم سنگھ
نے اس کی موت کی خبر صرف مجھے لکھی ہے۔ کیونکہ اس خبر کو سن کر میں
دو آنسو ضرور بہاؤں گی، اور یہ سوال کہ انسان مرنے کے بعد بھی اس دنیا
سے اُن دیکھا رشتہ محسوس کرنا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ ویسے تو
سچ ہے کیونکہ اس سوال کا جواب دے کر میری تسلی کرنے والا موہن سنگھ
بھی تو اب زندہ نہیں اور ادھوری کہانیاں خلاؤں میں ایسے ہی ادھورے
سوالوں کے کندھے سے کندھا ملائے تیزی سے اتر رہی ہیں۔

سامنے کے پیپل پہ پڑی اُداس کرنیں دھیرے دھیرے رینگ
رہی ہیں اور نہ جانے یہ آوازیں میرے دل سے خون کیوں نچوڑ رہی ہیں
جیسے کوئی میرے پاؤں سے ساری جان نکال رہا ہو۔ گزرے دن

جب یاد آتے ہیں تو بس آنسو ہی چلے جاتے ہیں اور موتی سے بکھر رہے
بھولے ہوئے گیت پیپل کے پتوں کے تال پر کون گا رہا ہے ؟

اِس پار — اُس پار

اور وہ چلی گئی۔ کیسے وداع کیجیے نا! مجھ سے رخصت ہوئے بنا
میری آشیرواد کے بغیر! تو بتا سکتے ہو۔ یہ بات ناممکن ہے۔ آپ مجھے سہارا دو
وہیں خود باہر جاؤں گا۔ وہ بولا مجھ سے۔ کیسے بنا آپ سے پوچھے وداع کر سکتے ہیں۔
میں ابھی زندہ ہوں۔

مگر مالک۔ اب تو مہمان لوگ جا چکے ہیں۔ لالی بھی روشنیاں بجھا
دی گئی ہیں۔ اب تو کرسیاں بھی۔۔۔ سمیٹے ہیں اور بیٹی جا تو اپنے سسرال
پہنچ گئی ہوں گی۔ آپ باہر جا کر کیا کریں گے۔

تم چپ رہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بیٹی چپکے سے یا بات چلی
گئی اور کسی نے مجھے بتایا تک نہیں۔ ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے کیا میں اس کا
دادا نہیں ہوں۔ کیا وہ میرے لخت جگر کی بیٹی نہیں ہے۔ کیا یہ ڈیوڑھی اور اولاد
نہیں ہے۔ جو میری کوکھ سے جنمی ہے۔ کیسے وہ میری آشیرواد کے
بنا ہی وداع ہو گئی۔

اب کوئی اشیرواد نہیں لیتا۔ ہماری کوٹھی کے ادھر ادھر چھوٹی چڑیاں کی
شکستہ ڈالیوں میں بیٹھنے بھی بیاہ رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اچھا تم جونت سنگھ کو بلاؤ ۔ ۔ ۔ جاؤ کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ چلے
جاؤ۔ جاؤ۔ پر مجھے معلوم ہے میرا بیٹا بلونت سنگھ نہیں آئے گا۔ وقت بیتے
ہوئے ریشم کے کیڑے کی طرح میرے اوپر اس بار ایک تار سے ایک قبر تیار
کر چکا ہے اور اب نہ تو کوئی آس ہے اور نہ ہی کوئی خوشی۔ میں یادوں کے
بت کی طرح زندگی کے بگھتے اس چبوترے پر اندھیرے اجالے میں بیٹھا
رہتا ہوں اور بھلائی ہوئی پرانی چیزوں کو کراہی اشیرواد کے بیچ پکارتا ہے

اگر بیٹے آنے والے نہ تھے پر میں بھی کیا سوچ رہا ہوں۔ وقت
بہنے والے پانی کی طرح میرے گھر کے آگے سے گزر چکا ہے اور اب
واپس نہیں آئے گا۔ امراؤ سنگھ۔ عنایت علی۔ غلام نبی۔ چودھری شیر دل
سارے محبت سے بچھڑ چکے ہیں۔ وہ الاؤ اب کبھی نہیں جلے گا۔ وہ الاؤ جس کے
گرد بیٹھ کر ہم سب سردیوں کی ٹھنڈک اور آگ کی روشنی میں حافظ کے اشعار
پڑھتے تھے اور دنیا یاد کیا کرتے تھے۔ یہ نشان جو میری پیشانی کی دائیں طرف
ہے اس پر آج بھی ہاتھ پھیرتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرا کیٹ
کی بات ان بیٹے والے نرم مزاج سے یا اگر کنبے کے وقت کتنے سخت ہو
جانے۔ جیسے لوہے کی دیوار ہوں۔ وہ جب آنکھیں اٹھا کر چہرے کی طرف

دیکھنے تو کسی کی ہمت نہ تھی کہ ان سے آنکھ ملا سکے۔ سبق یاد کرنے سے جو وقت بچتا تھا اس میں سے ہم سب بابا کے گھر کے کام کرتے تھے۔ شیر دل اور میں کتنا جھگڑتے تھے کہ وہ لمبا برتن کون دھوئے گا۔ شیر دل بھی اب میری طرح بوڑھا ہو گا۔ وہ بھی اب ایسے ہی اپنے نئی روشنی کے داماد و بیٹے کے گھر کسی کونے میں پڑا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی بیٹھے یاد کر رہا ہو۔ بیتی زندگی پر جب نظر دوڑاتا ہوں۔ تو یوں جان پڑتا ہے جیسے ایک خواب تھا۔ خواب جس میں میں اور شیر دل اور غلام نبی اور کتنے اور ساتھی اکٹھے تھے اور پھر ماں کھیڑے کی بڑی نہر کے اس پار وہ مجھ سے وداع ہو گئے اور انھوں نے اپنے چہرے جو بے پیچھے آنے والے قافلے کے غبار راہ میں چھپا لیے مجھ سے منہ موڑ کر بھاری قدموں سے چلتے نہ کہاں چلے گئے اور میں اس قافلے کے تیز دھارے کے ساتھ ساتھ بہتا یہاں آگیا۔ یہاں میرے لیے کیا تھا؟

بڑی نہر کے پل کے پار وہ تھے اور میں ہوتے ہوئے بہت بے دلی سے ماں کھیڑے کو چھوڑ رہا تھا۔ پل کے جس کنارے وہ سب کھڑے تھے۔ وہ آنگن تھا جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ ان گلیوں اور راہوں سے مجھے الگ کیا جا رہا تھا جہاں میری جوانی گزری تھی۔ ماں کھیڑے کے باہر میرا وجود کہاں تھا اور پھر بھی وہ سب وہاں تھے اور مجھے رخصت کر رہے تھے۔ بڑی نہر کا پل میرے لیے تلوار کی دھار سے تیز اور بال سے باریک بن گیا تھا۔

سے گزر کر اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے مجھے خدا کے تخت کے سامنے حاضر ہونا تھا۔ مگر پل کے اس پار جنت کہاں ہے؟ وہ پریم آتما کہاں ہے وہ واہگورو کہاں ہے۔ وہ خدا جو محبت ہے، وہ پریم آتما جو سدا زندہ ہے۔ وہ واہگورو جو شکتی اور سچائی ہے۔۔۔ یہ سب چیزیں کہاں ہیں! وہ سب طاقتیں کہاں ہیں؟ پل کے اس پار جو تھا وہ یہاں کیوں نہیں ہے؟ ایک ایک کر کے ہوتے ہوئے ریت کے ذروں کی طرح میری آنکھوں میں یہ سوال چبھ رہے ہیں۔ میں کس طاقت کو پکاروں، کس سے مدد چاہوں؟

انور دعا کر کے انھوں نے مجھ سے آشیرواد لیے بار رخصت کر دیا۔ پر شیر دل نے تو ویسا نہیں کیا تھا ——— شیر دل کی فاطمہ کی شادی ہوئی ہے تو میں ماں کیپٹرے سے اپنے سمدھیوں کے ہاں کسی کام سے آیا تھا۔ شیر دل نے کتنی تاکید کی تھی اور کہا تھا "تم نہیں آؤگے تو فاطمہ کی ڈولی نہیں جائے گی۔" اور مجھے معلوم تھا کہ میں وقت پر نہ پہنچا تو فاطمہ کی ڈولی نہیں جائے گی۔ میں پچاس میل کی مسافت طے کر کے جب پہنچا ہوں تو پسینے میں شرابور ہوا تھا اور فاطمہ کی ڈولی رکے وہ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ فاطمہ مجھے بہت پیاری تھی۔ جب سنتی وداع ہوئی تھی تب بھی میرا جی اتنا دکھی نہیں ہوا تھا۔ مگر جب فاطمہ میرے گلے لگ کر روئی ہے تو آنسو نہ جانے کہاں سے آنکھوں میں آ گئے۔ بیٹی! باپ کے گھر مہمان ہی ہوتی ہے۔ بابل کا گھر چھوڑتے تھوڑے

اُسے کتنا دُکھ ہوتا ہے۔ وہ آنگن جس میں اُس نے اپنے دیپوں سے جگمگا دیا تھا
گڑیاں کھیلی تھیں۔ ماں سے پٹی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ مل کر ہنسی بولی تھی اس
سے چھوٹ رہا تھا۔ فاطمہ کے جانے کے بعد میں بہت دنوں اُداس رہا تھا۔
جیسے وہ شیر دل کی نہیں میری اپنی بیٹی ہو۔ جیسے وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔
وہ زندگی میں اپنے پن کا احساس آج کہاں ہے؟ کیا میں الوداع کا حصہ
نہ تھا؟

پُل کے اُس پار محبت کی گرمی تھی۔ روشن چہرے تھے اور زندہ رہنے کا
ولولہ تھا۔ شاید اُس پُل پہ سے گزرتے ہوئے تلوار کی دھار سے ہی بار ایک بار
پہ میری رُوح کٹ گئی۔ اور میرا وجود یہاں آ گیا مگر رُوح کہاں ہے؟ اور وہ
سب کیوں پُل کے اُس پار رہ گئے ہیں۔ ماں کیٹھے کی گلیوں میں شیر دل کیا
اکیلا خوش ہوگا۔ میرے گھر با حویلی کے دالانوں میں کیا اب بھی وہ اُسی طرح قندیلیں
جلتی بجھتی ہوں گی۔ کیا میرے بابا ان کا دل سوگوار نہیں ہوگا۔ مگر
کس طاقت نے مجھے ماں کیٹھے سے الگ کر دیا ہے؟ وہ طاقت کون سی تھی؟
اسے کس نے بنایا ہے؟ یہ کیا پاگل پن تھا؟ میں اور شیر دل ایک ہی مٹی سے
پیدا ہوئے تھے۔ غلام نبی نے اور میں نے بابا سے اکٹھے پڑھا ہے۔ ہم سب
کے جسموں پہ اور پیشانیوں پہ اور ہاتھوں پہ اس الاؤ کی جلتی لکڑیوں کے داغ
تھے۔ ہم نے ایک ہی فضا میں سانس لیا ہے۔ ایک سی باتیں سوچی ہیں۔ ہم ہر

تھے۔ جنہوں نے کسی آدرش کی خاطر نہیں۔ بس یونہی ہم سے ہمارے چھوٹے چھوٹے بیٹے، پوتے چھین لیے۔ نہر کے کنارے سے لے کر علی والی تک کے کھیت چھین لیے اور ان پر مجھ کا نیلا آکاش چھین لیا اور پل کے راستے ہم سب کو ایک ایسے اجنبی دیس میں دھکیل دیا جہاں کچھ بھی تو اپنا نہیں۔

بسنتی کے سسرال کا گاؤں اس پل سے بہت دور تھا۔ اور بلونت سنگھ فکرمند تھا۔ میں نے اُسے کہا تم مجھے تو ان کیڑے سے نکال کر لیے جاتے ہو مگر بسنتی کو اس دیس سے جب مانو کر وہ اس زمین کا ایک ٹکڑا ہے وہ اکیلی نہیں۔ اُس کا چچا شیر دل ہے۔ ولاور علی اُس کا خیال رکھے گا وہ کسی غیر دیس میں تو نہیں اور بلونت سنگھ نے کہا تھا "باپو تم تو پاگل ہو۔ یہ شیر دل، یہ ولاور علی یہ سب ہمارے دشمن ہیں۔ ہمارے مذہب کے دشمن ہیں ہمارے آدرش کے لاگو ہیں۔ یہ ہمارے کوئی نہیں ہیں۔ تم کو کبھی سمجھ نہیں آئے گی کہ یہ دیس بیگانہ ہے۔ بسنتی کی عزت کا سوال ہے۔"

اور میں آج بھی سوچتا ہوں مگر سمجھنے کا نام پاگل پن ہے کہ اگر شیر دل اور ولاور علی ہمارے دشمن تھے تو پھر دوست کون تھا؟ اگر وہ دھرم کے بیری تھے تو پھر گوردوارے میں بیٹھ کر گرنتھ صاحب کا پاٹھ اتنے احترام سے کس طرح سنتے تھے اور بلونت سنگھ کی یہ بات تو مجھے اب بھی سمجھ نہیں آئی کہ آدرش کیا ہے۔ میں نے اپنا اخلاق جلالی پڑھی تھی جس نے

اور شیر دل نے اور دلاور علی نے اور امراؤ سنگھ نے اور دیپال سنگھ نے سب نے حافظہ کو اکٹھے پڑھا تھا۔ پرانی کتابوں میں اس آدرش کا ذکر کیوں نہیں تھا بابا! اس نے ہم سے یہ بات جان بوجھ کر چھپائی تھی۔ وہ کونسا عذر تھا کہ ہماری اولاد نے ہم سے علیحدہ اُسے پا لیا۔ اور اب شیر دل کا جوان سال شاہ دل اور دلاور علی کا جوان بخت اور میرا بلونت سنگھ اس کے لیے لڑ مرنے کو تیار ہے؟ یہ آدرش کی بات مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔

میرا جی بسنتی کو دیکھنے کو کیا کیا چاہتا ہے میرا دل فاطمہ کو دیکھنے کو کیسا کیسا تڑپتا ہے مگر کتنے بہت سے سال گزر گئے پر بھی وہ مجھے نظر نہیں آئیں۔ اور نہ کوئی کبھی انہیں سسرال سے وداع کرا کے نہیں لایا گیا ؟ میری فاطمہ نے دہلیز پر کتنے پھیرے لیے ہوں گے۔ حویلی کے بام تا بام کتنی بار جھانکا ہوگا۔ پر اسے کبھی کوئی ویر باگ اٹھائے پہاڑ جیسے گھوڑے پر سوار راہ پر اپنے پیچھے گرد کے بادل بناتا پیکے گھر کی خیر صلاح کی خبر لاتا دکھائی نہ دیا ہوگا۔ اس نے کتنی بار گھی کو ساس سے چوری کی مٹی کے کٹورے میں ڈھانپا ہوگا کہ شاید کسی گھڑی ویر آجائے اور وہ اسے چوری کھلائے۔ اس نے کتنی بار گھی کو سنبھال کر رکھا ہوگا کہ بھائی کے چاولوں پر گرم گرم ڈال کر کھلائے گی۔ کتنی بار اس نے خواب میں وہ بولیاں دیکھی ہوں گی جن میں شاہ دل اس کے لیے پیکے کی سوغات لایا ہوگا۔ پر اس نے خواہ

پر کوئی منحوس پرچھائیں پڑ گئی اور فاطمہ کو ملنے شادو دل پل کے اس پار سے کبھی نہ
آیا۔ جس طرح بسنتی کو ملنے بلونت نہ جا سکا۔ بسنتی نے پنگھٹ پر گھڑا رکھ کر کتنے
ماہیوں کو اس شوق سے دیکھا ہو گا۔ کہ شاید یہ اس کا ماں جایا ہو۔ اس نے
کتنی بار کوّے کو منڈیر سے اڑایا ہو گا، یا پھر اس سے چوری کھلانے کا وعدہ
کیا ہو گا۔ روٹیاں پکاتے ہیں جب آٹا گرا ہو گا، تو اس نے آس لگائی ہوگی اور
دھڑکتے دل سے چرخہ کاتتی انتظار کرتی رہی ہوگی۔ ہر آہٹ پر چونک
چونک گئی ہوگی۔ ڈیوڑھی میں جھانکا ہوگا۔ حویلی میں آنے والے ہر کہار کا منہ
اس امید پر تکتی رہی ہوگی کہ شاید کوئی اسے بلونت کے آنے کی خبر سنائے تو
کیا فاطمہ اور بسنتی اب تک جیتی ہوں گی ؟

وہ دونوں آج بھی اپنے اپنے سسرال کے گھروں میں ہوں گی۔ اور گھی
کے چومکھے دیپ جلانے کی تیاریاں کر رہی ہوں گی۔ پر شیر دل کا بیٹا شادو دل
پل کے اس پار سے کبھی اپنی بہن کو ملنے نہیں آیا اور میرا بلونت سنگھ بسنتی
کو بھول کر بھی تو یاد نہیں کرتا۔ اس کو شاید ہی پتہ ہو کہ وہ دعا کی ماں بنی میری
بہو بڑے چاؤ سے میرا گھر کو گئی۔ بیتے چپکے سے میری ساری قوتیں جواب
دے گئی ہیں۔ میرے بازوؤں میں تو اس دن ہی کوئی طاقت نہ رہی تھی جب
چودھریوں کے جوانوں نے للکار کر کہا تھا۔ اب ان آنکھوں سے ان کیڑوں کا
سراغ بھی چھن جائے گا۔

ماں کھیڑا میرے دل کی دنیا ہے وہ میرے دل کی آبادی ہے میرے خوں میں میرا گاؤں ہے۔ کون مجھ سے ماں کھیڑا خالی کرا سکتا ہے اور پھر بھی شیرول کے برادری والوں نے میری حویلی کے سامنے للکار کر کہا تھا کہ اب تم فوراً اسے خالی کر دو۔ اس دن شیرول چھپ کر میرے پاس آیا تھا اور کتنی دیر ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خاموش بیٹھے رہے تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کوئی بات ہی نہ ہو۔ شیرول میری طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ جیسے مجھ سے آنکھ ملاتے ہوئے ڈرتا ہو اور شرمندہ ہو۔ پھر رات کے اندھیرے میں جب حویلی میں خاموشی تھی اور میرے گھر کی عورتیں اندر کوٹھڑیوں میں کنڈیاں چڑھا کر بیٹھی ہوئی تھیں دلاور علی میرے پاس آیا تھا۔ وہ بھی خاموش تھا۔ گھر میں خاموشی دیکھ کر اسے وحشت ہو رہی تھی۔ بار بار پہلو بدل رہا تھا ہم نے بچپن اکٹھے گزارا تھا۔ درختوں پر اُلٹے چڑھنا سیکھا تھا۔ ڈھاب میں مل کر تیرتے رہے تھے۔ گھوڑوں پر چڑھ کر اپنی تسلی کرواتے شکاری کتوں کے ساتھ اکٹھے شکار کھیلنے جایا کرتے تھے۔ ہمارے بیاہ بھی ساتھ ساتھ ہوئے تھے۔ ہمارے پاس جو زندگی بھی تھی اس میں سب کا حصّہ تھا۔ اور آج کسی غیبی طاقت نے اُسے بدلنا چاہا تھا۔ دلاور علی جب بھی میری حویلی میں آتا سب سے پہلے لجنت کی ماں کو پکار کر سنت سری اکال کہتا۔ ایک زندگی کے بعد جب ہمارے بالوں میں خاکستری رنگ گھل رہا تھا اور ہماری آنکھوں کی

روشنی کمزور ہو رہی تھی۔ ہم نئے آداب و اصول سیکھنے کے ناقابل تھے۔ دلاور علی کو
ایک اجنبی کی طرح اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ وہ پلنگ کی
پائنتی آکر یوں بیٹھ گیا تھا جیسے اب یہاں سے مر کر ہی اٹھے گا۔ اس کے چہرے
پر مایوسی اور شرمندگی کی تحریریں میں نے اندھیرے میں پڑھ لیں۔ میں نے اپنے
خالی ہاتھ میں اس کا ہاتھ لینا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ پرے کر لیا اور مجھ سے
لپٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہے اور وہ مجھ سے
بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس اندھیرے اور خاموشی میں جب دور کے
گاؤں سے نعروں اور شور کی آوازیں آ رہی تھیں، اور مال کھیڑے کی گلیوں
میں جب کبھی تیز بھاگتے قدموں کی چاپ گونج اٹھتی تھی اور کبھی بہت سے
حیوانوں کے بندھے ہوئے اور بے فکری سے چلنے کی صدائیں آتیں۔ میں نے
اندر سے بوتلیں نکالیں اور ہم مدھم سی روشنی میں مل کر وہ پرانی شراب پیتے رہے
جو ہم سب کو بہت پسند تھی۔ کوٹھڑیوں کے اندر سے بچوں کے رونے
کی گھٹی گھٹی آوازیں آتیں اور ہم تینوں آدمی ایک دم چونک پڑتے۔

وہ میرے ساتھ شیر دل اور دلاور علی کی آخری شام تھی۔ پھر آس پاس کے
گاؤں سے لوگ ٹولیاں بنا کر اس پل کے پاس جمع ہونے لگے۔ سامان کے ڈھیر،
روتے بچوں، غمزدہ بوڑھی عورتوں اور بیوہ سہاگنوں کے گروہ پل کی طرف بڑھنے
لگے۔ میں سارا دن اس سرکنڈوں کی دیواروں سے محفوظ رہا تھا پر انہیں دیکھنے

دیکھتا رہا۔ بسنتی کی ماں نے مجھے کئی بار اندر بلایا، مگر مجھے وہ کس شے سے ڈرا رہی تھی؟ اس شہر کی بھیڑ میں مجھے کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر میرا اپنا گاؤں، دریا کے کنارے پر جھکے ہوئے درختوں تلے بندھی کشتی اور اس پاس تیرتے کنول کے پھول، پانی کے ساتھ ساتھ ریتوں کے ڈھیروں پر پھیلتی دھوپ اور پھر جھلکتے صاف شفاف پانی میں تیرتا اپنے گاؤں کا عکس یہی سب کچھ تو تھا جس سے میری زندگی تھی۔ یہ سادگی جس میں کھیت ہیں، گھر ہیں اور پانی کے کناروں کو چھوتا ہوا نیلا آکاش ہے اور برگد کے قریب گوردوارہ تھا۔ اس سادگی سے مجھے کون علیحدہ کر سکتا تھا۔ وہاں شیر دل تھا، دلاور علی تھا۔ اور پھر بھی میں اس قافلے میں شریک ہو گیا۔ میں نے بسنتی کے بیٹے شیر دل کو کچھ نہیں کہا۔ میں اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں یہ کہتا کہ شیر دل بسنتی کا خیال رکھنا، اس کا گاؤں ڈوب رہا ہے اور تم اسے وہاں سے لا کر پل کے اس پار جانے والوں میں شامل کر دو تو وہ یقیناً ناراض ہو جاتا۔ اور اس لیے میں چپکے سے پل پر آ گیا۔ ہمارے اردگرد دوسرے خاندان کے افراد ان کی آنکھوں میں حیا اور جن کی باتوں میں لحاظ ہوتا تھا کھڑے زور زور سے ہنستے اور قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے جیسے میں اور ہمارے گھرانے کی عورتیں انہیں نظر ہی نہ آ رہی ہوں۔ گلی میں ماسیوں اور چاچیوں کو دیکھ کر سلام کرنے اور ادب سے ایک طرف کھڑے ہو جانے والے جوان آج

کو کھسکا کر ایک طرف کر دو۔ دھوپ تیز ہو تو اس کوٹھڑی میں بھر جاتی ہے اور پھر اذیت ناک گرمی ہوتی ہے۔ وہ ٹھنڈے سائے کہاں ہیں۔ رہٹ کے گیت کے ساتھ میٹھی ہوا کہیں نہیں ہے اور پھر المناک تنہائی۔ یہ اکیلا پن۔ بلونت سنگھ کی ماں اچھی تھی جو ان کھیڑے سے باہر نہ آسکی۔ جتنی ساڑھے زری دو بیگھ زمین کا ٹکڑا تھی اُسی میں سما گئی۔ جس گھر میں اس کی ڈولی آئی تھی۔ وہاں سے وہ مر کر ہی نکلی۔ چند دنوں بچے مجھے گھیرے رہتے۔ انورادھا، شام، جگدیش سبھی میرے گرد رہتے۔ پھر ان کے سکول کھل گئے اور بہو نے انہیں مجھ سے علیحدہ کر لیا۔ بلونت سنگھ کے اپنے کام ہیں۔ نہ جانے وہ کاروبار کیا ہے؟ اگر میں اس سے پوچھوں بھی تو اسے بتانے کا وقت کہاں سے ملے گا۔ کبھی کبھار کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر کہتا ہے۔ باپو کیا حال ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ آپ کا خیال تو رکھتی ہے۔ کبھی کسی کو بلانا ہو، کسی شے کی بھی چاہ ہو تو اس بٹن کو دبا دیا کریں۔

یہ بٹن دباتا ہوں، مگر نہ تو شیر دل آسکتا ہے اور نہ ہی دلاور علی۔ امداد سنگھ اور کبیر سنگھ کوئی بھی تو نہیں آتا۔ اور مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ بھلا اس گھنٹی کے بجانے سے مل سکتی ہیں۔

باہر کی دنیا کے اور میرے درمیان صرف اس کھڑکی کا ناطہ ہے میں نے اپنے اوپر سارے دروازے بند کیے ہیں۔ صرف یہی اک کھڑکی ہے اور

آن چیزوں سے کبھی بھی گزر پانا مذاق ہے جو انسانوں میں رہ کے دیکھے ہیں؟ صبح سے شام
تک رنگینی، ہلڑ بازی، انسانوں کی قطاریں جیسے انسان نہ ہوں چیونٹیاں ہوں۔ اس
آدمی کا نشان نہیں، ہر چہرہ حیران ہے، ہر دل ویران ہے۔ یہ بیگانگی اور یہ تنہائی
یہ اکیلاپن۔ یہ اماوس کی رات سارا سمے اس دنیا پر چھائی ہے۔ چاند
سورج ستارے کہاں ڈوب گئے ہیں۔

شمبھو ناتھ کہتا ہے میرا بلونت سنگھ بہت بڑا آدمی ہے۔ آدمی کی بڑائی کیا
ہے؟ کس شے سے ہے؟ بلونت سنگھ کے پاس لوگ آتے رہتے ہیں۔ ایک
بھیڑ سی سارا وقت لگی رہتی ہے۔ موٹریں آتی ہیں جاتی ہیں۔ لان میں کرسیاں
بچھتی ہیں، میز بچھتے ہیں۔ روشنیاں ہوتی ہیں، بجھتی ہیں۔ اجیت کور بھی مصروف
رہتی ہے اور پھر کبھی کبھار ادھر سے گزرتے گزرتے میرے کمرے میں جھانک کر
کہتی ہے بابو آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ بھلا مجھے کس چیز کی ضرورت
ہو سکتی ہے؟ ضروریات زندگی کے ساتھ ہوتی ہیں۔

اندراوتی کی آنکھوں میں میری بیٹی کی آنکھوں کی سی نرمی ہے اور آواز میں
ویسی ہی مٹھاس۔ ان کے بیٹے کا روایتی حسن ڈولی کے پردوں کے پیچھے جھک کر
چھپ گیا۔ اندراوتی میں اس کی ایک کرن بھی نہیں۔ ایک تیزی ہے اور ایک
سختی ہے۔ میری کھڑکی کے قریب سے گزرتے گزرتے ایک دن کہنے لگی۔ بابو
یہ میرے دوست ہیں سردار نریندر سنگھ۔ ہیں نئے آتے۔ سر سے پاؤں تک

دیکھا پھر اُدھر، ادھر دیکھا۔ میں اتنی بدلی ہوئی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے
کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں ———————————— کہاں سے بچھڑ
ہیں سے گزر رہا ہوں۔ جس میں آگ ہے تو کسی پر جلا نہیں پاتی۔ جس میں دُکھ
تو ہے پر دل کھول کر چلا نہیں سکتا۔ جس میں محبت کی آرزو تو ہے پر اتنی شدید نہیں
میرے حواس کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ کونسی دُنیا ہے کہ انسان انسان سے
جُدا ہے۔

روتا۔ روتا۔

پانی کی ایک بوند برسا دے۔ یہ صحرا ہے۔

روحیں اس پل کے پار رہ گئی ہیں کیا۔ یا ریزہ ریزہ ہو کر اس تیز دھار
والے حبِّ الٰہی کے پل پر کٹ کر گر گئی ہیں۔

انسان اتنے کھوکھلے کیوں ہیں؟

اب تو بہت دنوں سے کبیر سنگھ ادھر نہیں آیا اور آئے بھی کیوں آئے
بلونت سنگھ سے بہت امید تھی۔ اپنے خاندان کا آدمی گاؤں کا ناطہ۔ اِن
کبیرے کا رشتہ انسانیت کی برادری۔ اسے بیکاری میں کسی نوکری کی تلاش
تھی۔ بلونت سنگھ سے میں نے خود کہا مگر کبیر سنگھ کا کوئی کام نہ بن سکا۔ وہ سارا
دن موٹروں کے پاس والے گندے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ اس کے کھیتوں کا
سونا اور گندم کی بالیاں۔ اس کے دھان کے لہلہاتے کھیت سب وہاں چھوڑے

میں ہوں اور اس دُنیا کے اور اُس دُنیا کے درمیان ایک پُل ہے۔ جو ابھی تک میں
اس پر گزرنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ کیا ہم سب مر کر کسی نئے جنم سے گزر
رہے ہیں۔ اجیت کور نے کیسر سنگھ کو دیکھا تو کہنے لگی۔ باپو آپ اس گندے
آدمی کو ہر روز اپنے کمرے میں بٹھا لیتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ہماری عزت
کا سوال ہے۔

اور پھر کیسر سنگھ کبھی اس طرف نہیں آیا۔

کیا میں کبھی پُل کے اُس پار نہیں تھا۔ یہ سب سپنا تھا۔ میں سدا سے اس
کوٹھڑی میں قید تھا۔ جس میں کیسر سنگھ کی گندگی داخل نہیں ہو سکتی۔ پُرانے دنوں
کے ساتھی نہیں آسکتے۔ جنتی کا پُل کے پار رہ جانا عزت کا سوال تھا۔ کیسر سنگھ
کا میرے کمرے میں آنا عزت کا سوال ہے؟ آخر عزت کیا شے ہے؟

کبھی کبھار میرے دل کے اندر کوئی شے اُبلنے لگتی ہے۔ ٹوٹنے کی صدائیں
آتی ہیں۔ وہ کیا شے ہے؟

کیا ابھی کچھ باقی ہے؟

اور اب تو مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ ہر شے دھندلا گئی ہے۔ ذہن سے نقش
مٹتے جاتے ہیں۔ نام ہیں مگر صورتیں نہیں۔ سائے ہیں وجود نہیں۔ جب اندھیرا
گہرا ہوتا ہے تو اس کی ظلمتیں سطح کو چھو کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے شیر دل اور دلاور علی
کے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہوں اور اُس کے اُبلتے ہوئے دل سے ٹکڑے

پر ٹھنڈک پانی بن کر گرتی ہے پھر یہ دیے بھی بجھتے چلے جاتے ہیں۔ کھنڈر میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ پر آج نہ جانے کیوں الوداع کے جانے پہ مجھے یہ سب باتیں کیوں یاد آ رہی ہیں۔ میں تو پُل کے اس پار ہوں۔

حدِ نظر تک یادوں کے کارواں اس وقت کے پُل پر سے گزر رہے ہیں یہاں سے بھی شیر دل اور دلاور علی پیچھے رہ جائیں گے۔ مجھے گلے سے لگا کر رخصت کر دیں گے اور میری رُوح ریزہ ریزہ کٹ کٹ کر اس تیز دھار والے پُل پر سے نیچے گر جائے گی۔ کھوکھلا وجود دوسری طرف چلا جائے گا۔ جہاں اُس کا باہر کی دُنیا سے تعلق صرف ایک کھڑکی کے ذریعے ہے۔

بن باس

پرندے تیز تیز پر مارتے اُڑتے جاتے ہیں اور دھوپ پیلی ہو کر آچیل کے بڑے تالاب کی سیڑھیوں پر اُتر آتی ہے۔ گرد و پیش کے کلس کا رنگ ڈوبتی کرنوں میں سنہری مائل سفید رنگ رہا ہے اور بڑے میدان سے دوسری طرف میلہ بکھرنے لگا ہے، اب تھوڑی دیر میں دسہروں کو آگ لگا دی جائے گی۔ لوگ شور کریں گے، ڈر کر دور بھاگیں گے اور شام کے نیلے دھندلکے میں چنگاریاں اُترتی ہوئی پھلجھڑیاں دکھیں گی۔ دیر تک آگ کے شعلے اُٹھیں گے۔ اور لوگوں کے چہرے اس آگ کی روشنی میں بڑے بھیانک لگیں گے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک راون کا روپ دھارے سیتا کو جدائی سے ولاپ کرتے دیکھنے اور دوسری بار بن باس بھوگتے پا کر خوش ہونے یہاں آیا ہو۔

بن باس کتنی کٹھن بات ہے۔ پر کسی کے بس میں تو کچھ نہیں۔ کون اپنی خوشی سے اُسے قبول کرتا ہے؟

بھائی کہا کرتے تھے "بی بی یہ سارا وقت خواب سے کیوں دیکھتی ہو یہ

پیار جواب نہیں مانگتا ہے یہ رونق جو تمہارے گرد نظر آ رہی ہے یہ سب بجھتے کم ہو
جائے گی۔ وقت ہر شے میں کمی کر دیتا ہے۔ پر یہ بربادی اتنی آہستہ ہوتی ہے
کہ ہم اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔" آج بھائی کہاں ہیں؟ اگر تم شبو کی
یاس کو اٹھائے جاسوس کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلنے والی ہما جا سکتی اور
منجیوں کہیں ڈھونڈ سکتی تو ہیں کہتی۔ جا کر پوچھو تو سہی۔ یہ دکھ ہیں کمی کیوں نہیں
ہوتی۔ برسوں بوجھ اٹھائے اور کٹھن راہوں سے گزرنے پر بھی انسان پیچھے
کیوں دیکھتا ہے سکھ کی آس کیوں کرتا ہے۔ روشنی سے اتنا پیار کیوں کرتا
ہے؟"

سیتا جی نے یوں ہاں بجھ کر بس یہی دعا کیوں کی تھی کہ وہ رام چندر
سے مل سکیں۔ کیا مصیبت انسان کو اتنا سخت نہیں کر دیتی کہ وہ اچھے دنوں
کی امید ہی چھوڑ دے۔ اندھیرے سے آخر پیار کیوں نہیں ہو سکتا۔ آخر کیوں؟
آم کے درخت میں اس سال سے پھول آ رہے ہیں جس سال منی پیدا ہوئی
تھی۔ رُت بدلتی ہے تو شاخیں پھولوں سے بھر جاتی ہیں اور پیڑ پھلوں کے بوجھ
سے جھک جاتا ہے۔ پیڑ اور دھرتی کا سمبندھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس کی
جڑیں زمین میں اور گہری گڑتی چلی جاتی ہیں۔ اس رشتے کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔

منی اب بڑی ہو گئی ہے۔ سال کتنے دبے پاؤں میرے قریب سے
نکلتے چلے گئے ہیں۔

آج بڑی ماں نے گوپال سے کہا تھا: "کاکا بہو اور بچوں کو ذرا دسہرے میں گھما لا۔ کتنے برس سے وہ اس گاؤں سے باہر ہی نہیں گئی۔"

گوپال نے بڑی تیزی سے کہا تھا: "ماں تُو نے یہ بھی کہا کب تھا۔ یہ برسوں سے کہیں نہیں گئی تو میرا کیا دوش ہے بھلا اس میں کسی کا دوش ہو سکتا ہے جب کوئی مجھے بہو کہتا ہے تو لگتا ہے گالی دے رہا ہو۔ برسوں سے سُن رہی ہوں، اس رات سے سُنتی آئی ہوں۔ جب گوپال نے مجھے اس آنگن میں دھکیلا تھا اور چوکی پر بیٹھی ہوئی بڑی ماں سے کہا تھا۔

"ماں دیکھ تیرے لیے بہو لایا ہوں، پانچ اور ستر۔ آج جتنی لڑکیاں ہمارے ہاتھ لگیں، اُن میں سب سے اچھی ہے۔" اور دیے کی لَو کو اونچا کر کے ماں میری طرف آئی تھی۔ جھجک اور خوف سے میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میلوں ننگے پاؤں چل کر مجھ میں اُنگلی اٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ میں اُن کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنگن میں بندھی گائے اور بھینس ٹکر ٹکر مجھے تکتی رہی تھیں اور چارہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ماں نے سر سے پاؤں تک کئی بار مجھے دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

"تو اگر اچھے کام کرتا تو آج یہ حال نہ ہوتا میرا۔ دیکھ چولہا جھونکتے جھونکتے میری آنکھیں اندھی ہو چلی ہیں۔ اور ساری کہاریوں نے فصل پر اناج ملنے کی وجہ سے ہمارے گھر آنا بند کر دیا ہے۔ بتا مجھ سے یہ گھر کا بوجھ

کیسے سنبھالے گا۔ کھیتی باڑی کریں تو کیا ہی سکھ ہو سب کو مجھے۔"

گوپال نے کہا۔" دیکھ تو سہی۔ اب مہریوں کہاریوں کے نخرے اٹھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ یہ جو تیری داسی ہے۔ بس اس سے چکی پسوا، پانی بھروا، جو مزدوری کروا۔ میرا اس کا کیا علاقہ۔ میں نے تجھے بہو لا دی ہے۔"

سارے سنگھاروں میں بھولیں آئیں۔ نہ کوئی باجہ بجا نہ کسی نے ڈھولک پر تھاپ دے کر گیت گائے نہ ناچنے والیوں نے سوانگ بھرے اور نہ گوٹے ملے متکا کر نقلیں کیں۔

میرے دھول سے اٹے ہوئے بالوں میں نہ کسی نے تیل ڈالا۔ نہ کسی نائن نے سنگھار کیا۔ کورے ہاتھوں اور اجڑی مانگ سے میں سہاگن بن گئی۔ کسی نے دروازے پر میرے سر سے تیل ماش نہ وارے اور بڑی ماں نے گوپال کی بات سن کر یوں میری طرف دیکھا گویا میں مصیبت ہوں۔ جیسے اس کا پوتا کہیں سے اٹھا لایا ہے۔ پھر وہ اسی طرح ہاتھ میں پیسے دہ چوکے میں چلی گئی اور مجھ سے کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ بہو کا کیسا سواگت ہو رہا تھا؟

تب سے آج تک میں یہی سوچا کرتی ہوں۔ میں بن باس بھوگ رہی ہوں۔ اور میں سنگھاروں میں قید ہوں۔ چھوٹے اکھاڑتے، بیڑیاں پیتے، جھولوں والے ایک دوسرے سے گالی گلوچ کر رہے ہیں۔ اور گدھوں پر سامان اتنے زور سے پٹختے ہیں۔ جیسے گدھے لکڑی کے ہوں۔ رام سبھا کی تحریں

ایک طرف کھڑی ہیں اور رُوپ دھارنے والے لڑکے چمکیلے کپڑوں کی پروا کیے بنا ملائی کی قلفیاں اور چٹنی والے پکوڑے کھا رہے ہیں۔ دُودھ اور چٹنی کے دھبے ان رنگ برنگے پوشاکوں پر کوڑھ کے داغ لگتے ہیں۔ مُنّی کھڑی انھیں تکتی جا رہی ہے۔ اُسے اس بات کا ہوش نہیں کہ وہ گُم ہو جائے گی۔ ہوش ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جسے گُم ہونا ہو وہ بھرے گھر سے کھو جاتا ہے۔

گُریاں اُسے کھینچ رہا ہے اور دونوں لڑکے ٹھٹک کر روتے ہوئے بیچنے والے کو دیکھ کر چیز کے لیے ضد کرنے لگتے ہیں! یہ میلہ ہے۔

مائیں بچوں سے بے پروا بھیڑ میں دھکّے کھا کر اِدھر اُدھر ہو جاتی ہیں اور چھوٹے بچے ایک ایک چہرے کو تکتے زور زور سے روتے آگے ہی آگے بھاگتے جاتے ہیں۔ بھلا میلے میں بچھڑنے والے کہیں پھر ملتے ہیں؟ یہ جُگ جنم جنم کے لیے چاہنے والوں کے درمیان اوٹ بن جاتا ہے۔ وہ صورتیں جن پر ہم سارا کچھ لُٹا دیں۔ اس آس پر کہ ہم انھیں ایک بار پھر دیکھ سکیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ راستے بھروں پر آتا جاتا اُٹھنے والے کیڑوں کے قدموں کے نشانوں کی طرح ہمارے پیچھے مٹ جاتے ہیں۔ ہم جن راہوں سے چل کر آتے ہیں اُن سے لوٹ نہیں سکتے۔ کوئی بھی تو واپس نہیں آتا۔ اور میلے کی بھیڑ آگے ہی آگے چلتی رہتی ہے۔

"وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا" بھیا کہا کرتے تھے۔ "بی بی جو لمحہ بیت
جاتا ہے وہ بیت جاتا ہے، وہ دُھول ہی ہو جاتا ہے" جب میں پڑھتے ہوئے بے
دھیانی سے کام لیتی اور گڑیا گھر کو سجانے میں اسکول سے آ کر سہیلیوں کے
ساتھ لگی رہتی تو بھیا مجھے سمجھایا کرتے تھے۔

یہ گڑیا گھر مجھے بابا نے لاکر دیا تھا۔ بابا یہ کھلونا میرے لیے کسی نمائش
میں سے خرید کر لائے تھے۔ منی دونوں ہاتھوں سے اپنی بڑی سی کپڑے
کی گڑیا سنبھالے کھڑی ہے۔ گڑیا اوپر میز کو دیکھ رہی ہے اور منی جھانک
جھانک کر کھڑکی میں سے اپنی گڑیا دیکھتی ہے۔ دونوں لڑکے اداسی سے
بُت بنے ہوئے ہر چہرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ منی کی
آنکھوں میں اپنی گڑیا کے لیے کتنا پیار ہے۔ کپڑے کے جوڑے سے منڈ
پیلے ڈھنگے رنگوں سے ناک اور آنکھیں بنی ہیں۔ ناک میں نتھلی ہے۔ گوٹے
لگی چُنری سر پر رکھے اپنے لہنگے کو سنبھالے یہ چنچل، لگتا ہے، ابھی ناچے
گی۔ آنچل کے تالاب کے کنارے ہو کر کھیتوں میں سے ہمارا راستہ گزرا
کرتا ہے۔ زندگی کا کارواں چلتا ہی رہتا ہے۔ سیدھے ٹیڑھے راستوں اور
اُلجھی پگڈنڈیوں سے کسی منزل پر پہنچنے کی تمنا بھی ہو تو بھی سدا چلتے رہنا
پڑتا ہے۔ سدا سدا، چاہے پاؤں زخمی ہوں اور دل میں کچھ نہ ہو۔

شام کا نیلا دھندلکا اور نیچے اتر آیا ہے۔ شاید میں نہ جانے کیوں مجھے

بے حد اداس کر دیتی ہیں۔ آکاش پر اکیلا تارا دھڑکتا کانپتا۔ دیے کی لو کی طرح تھرتھراتا ہے۔ اور نیلاہٹ کے خالی سمندر میں اس کی تنہائی مجھے اپنے بن باس کی یاد دلا دیتی ہے۔ انسانوں کے اس ویرانے میں میں تنہا پیڑ کی طرح ہوں جس پر نہ پھول آتے ہیں اور نہ پھل۔

یہ تارا مجھے اس جہاز کی یاد دلاتا ہے جس میں بھائی سمندر پار گئے تھے وہ اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ جب دور دیس کو جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ تو ماں کی آواز میں آنسوؤں کی دُھندھ تھی۔ مگر وہ بڑی تسلی سے چیزیں ٹھیک کرتی اور دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ ابا ہر طرح کے انتظامات میں لگے تھے اور بھیا اُداس تھے۔ آپا چپ چاپ گم سم آنگن میں دبے پاؤں چلتی اِدھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ میں سارے گھر میں چہکتی پھرتی تھی۔ چوٹ جب تک نہ لگے زخم کی تکلیف کا کیا پتہ چلتا ہے۔

بندرگاہ تک ہم سب انھیں پہنچانے گئے تھے۔ بھیا بھائی کا سامان رکھوانے، کاغذ ٹھیک کرنے کیلئے لمبے پُل پر آجا رہے تھے۔ اور میں جنگلے پر جھکی ٹھاٹھیں مارتے سبزی مائل پانی کو دیکھتی بھائی سے پوچھ رہی تھی: یہ پانی ایسا کیوں ہے۔ اس پر تیل کے دھبے کیوں ہیں، کشتیاں کیوں ہیں۔ بہت کیوں ہیں اور اونچی نیچی لہروں پر کشتیاں ڈولتی ہیں تو جھول نہیں آتا کیا؟ سوالوں سے پریشان ہو کر بھائی کہہ رہے تھے۔ جب تو بڑی ہو جائے گی تو ساری

باتیں آپ سے آپ معلوم ہو جائیں گی بی بی۔"

اور آج مجھے معلوم ہے۔ جس کشتی کے چپو نہ ہوں وہ ڈوب جاتی ہے۔ کشتیاں ساحل پر بھی ڈوب جاتی ہیں۔ پانی کی ایک لہر بھی انہیں ڈبونے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ بڑے ہونے پر سب باتوں کا پتہ چلا ہے تو بھائی نہیں ہیں۔

پھر جہاز کی سیٹیاں سنائی دیں اور بابا نے بھائی کو گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر اچھا جان سپرد رحمٰن کہا تھا۔ بیتا بھائی سے لپٹ گئے تھے۔ آپا بڑے کمزور دل کی بات بات پر رو دینے والی تھی۔ آنسو ہچکیوں سے روتے دیکھ کر بھائی نے کہا تھا "بی بی کو دیکھو کیسی خوش ہے۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ دو سال میں تو میں لوٹ آؤں گا۔ کوئی میں سدا کے لیے بچھڑ رہا ہوں؟" پھر مجھے سینے سے لگا کر بولے "بی بی میں تیرے لیے پیرس سے تحفے لاؤں گا۔ ہاں تو مجھے خط لکھتی رہا کرنا" اور میں نے زور سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر جب آخری سیٹی سنائی دی تو وہ بڑے سکون سے بہت لاپروائی سے قدم اٹھاتے جیسے کہیں قریب ہی جا رہے ہوں چلے گئے۔ جب تک جہاز نظر آتا رہا ہم رومال ہلاتے رہے۔ پھر شام کے دھندلکوں میں جب گودی کی ساری روشنیوں کا عکس پانی کی لہروں میں ڈولنے لگا اور جہاز کی بتی آہستہ آہستہ اسی طرح کانپتی ہوئی اوجھل ہو گئی اور اس کے بعد ساری روشنیاں میرے گرد سدا کے لیے ڈوب گئیں۔ لہروں میں سے کبھی

کوئی کرن نہیں نکلی۔

میں اماں سے لپٹ کر کتنی زور سے چیخ پڑی تھی میرے دل میں
کوئی کہہ رہا تھا۔ اب یہ صورت پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ اب تو بھابی کو بھی
دیکھ نہ سکے گی۔ میرا دل زور زور سے کانپ رہا تھا جیسے مغرب میں خالی
آکاش پر پہلا تارا نیلے دھندلکے سے اوپر تھرتھراتا اور ڈرتا ہے۔ دور
باغوں میں رات کی سیاہی اپنے پر پھیلا رہی ہے۔ گوپال نے دونوں
لڑکوں کو کندھوں پر بٹھا لیا ہے اور وہ کھیتوں کے درمیان پتلی لکیروں
کی سی پگڈنڈیوں پر ہم سے آگے آگے جا رہا ہے اور منی دھیرے دھیرے
چل رہی ہے۔ پانی کے نالوں کو پھلانگ کر وہ دس کھیت پرے ہمارا
انتظار کرے گا۔ اور دونوں لڑکوں کو راون کی کہانی سنائے گا۔ اسے کیا معلوم
بھیا ان کے پیچھے آ رہی ہے اور وہ خود راون ہے۔

منی مجھ سے کہتی ہے "ماں سروپ کے بابا نے اسے دسہرے پر
بڑے اچھے رنگ والے کپڑے بھیجے ہیں۔ ریشمی ہیں۔ ہاتھ لگانے سے
بہت اچھے لگتے ہیں۔ ماں میرے کوئی بابا نہیں ہیں۔ جو مجھے ایسی اچھی
چیزیں دے سکیں۔ ماں تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ میلہ اچھا نہیں لگا تھا۔ کیا تم
تھک گئی ہو ماں؟"

"ہاں منی میں تھک گئی ہوں۔ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ مجھے بہت

چلنا پڑا ہے۔"

"کوئی نہیں بوڑھی ہو گئی" منی بڑے یقین سے میری طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ "تم تو دیوی کی مورتی لگتی ہو ماں" بڑی ماں کی بہی کہتی ہے۔"

منی کو کیا معلوم مجھے کتنا چلنا پڑا ہے۔ ایک زندگی سے دوسری زندگی کا فاصلہ کتنا بہت ہوتا ہے۔ اور جب انسان بیٹھ جاتا ہے، اس کے سن میں کوئی آشنا نہیں رہتی، تب وہ پوچھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ منگلاؤں کی راہوں پہ بچھڑے ہوؤں کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ میرا من خالی ہے، میں تشنہ ہوں۔ پھر بھی دکھ کا ناتا کتنا اٹوٹ ہے گہرا اور پکا۔ کبھی ساتھ نہ چھوڑنے والا۔

منی پھر پوچھ رہی ہے۔ "ماں کیا ہمارے کوئی بابا نہیں؟"

میں اس سے کیا کہوں۔ میں اسے کیا جواب دوں۔ دوراہے پر کھڑی سوچ رہی ہوں۔

بھیا مجھے کتنے پیارے تھے پر میں ان سے ڈرتی بھی بہت تھی۔ وہ گھر میں گھستے تو چیزیں خود بخود سر پہ آ جاتیں۔ چال میں ٹھہراؤ اور ہنسنے کی آواز میں روک کی کوشش ہوتی۔ جب میں ان کے قریب کھڑی ہوتی تو لگتا دنیا میں ان سے لمبے قد کا کوئی نہیں ہو سکتا۔ سنبھل کر چلنے اور بیٹھنے سے بات کرنے والے میرے بھیا کتنے اچھے لگتے تھے۔ صاف سیدھی لکیریں۔ نہ

صفحے گندے کرتے اور نہ ہاتھوں میں سیاہی بھرتے تھے۔ مجھے کہتے "بی بی! جب
تو بڑی ہو جائے گی تو تو بھی ایسا ہی لکھا کرے گی" سیدھی سطریں اور ہار جیسے
کے بھیا آج مجھے دیکھیں تو کیا کہیں؟ میرے نصیب کے لکھے پر اتنی سیاہی
ہے کہ سارے صفحے پر ایک بھی تو سیدھی لائن دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے تو کبھی
لکھنا نہ آیا۔

ان دنوں گڑیا گھر سجا کر میں سوچا کرتی تھی۔ ہم اس میں رہ سکتے ہیں۔ اماں
اور ابا اور میں بھیا اور بھائی اور آپا بھی بس یہاں رہیں گے۔ زندگی رس بھرا
گیت ہے۔ کسی شے کی ضرورت نہیں کوئی کمی نہیں۔

بھیا کی شادی ہوئی تو میں نے کہا تھا ہمارا گھر جنت ہے مکمل اور آسمانی
جنت۔ ان دنوں اگر میں دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو سمجھ ہی نہ سکتی کہ
کیا مانگا ہوں۔ آج کی طرح میں نے خدا سے کچھ نہیں مانگا۔ سکھ اور دکھ کی انتہا
زندگی کے بیچ میں ایک ہی قدم پر ہے۔

بھائی سمندر پار چلے گئے اور میرے جنت کے خواب چور چور ہو
گئے۔ ساری زندگی کرچیں نوکیلے کناروں والے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح
ادھر اُدھر پھیل کر گزرنے والوں کو زخمی کر رہی ہیں۔ سب کے پاؤں معذور ہو
گئے ہیں۔ راہ کی دوسری طرف جانے والا کوئی بھی تو نہیں رہا۔ راستہ یوں
سُونا ہے جیسے شمشان میں سے ہو کر گزرتا ہو۔ دُور دور تک کوئی نہیں۔

ہیں۔ مرد زور زور سے باتیں کرتے ہنستے میرے اور منی کے پاس سے گزر
رہے ہیں۔ عورتیں اپنے اچھے کپڑے پہنے دوپٹوں کو سنبھالتی ذرا ذرا
سے گھونگھٹ ماتھوں تک سرکائے میلے میں خریدی مٹھائیوں کی پوٹلیاں
ہاتھوں میں پکڑے بچوں کو کندھوں سے چپٹائے ننگے پاؤں تیز تیز چل
رہی ہیں ان کے جوتے دوپٹوں کے پلوؤں میں بندھے ان کے پیچھے جھول
رہے ہیں۔ زمین اور جسم کا گہرا رشتہ ہے۔ اس کے اور انسان کے درمیان
کوئی پردہ کیوں ہو؟

دور چلتے لوگ سفید دھبے لگ رہے ہیں۔ اکتارہ والا ایک سادھو
سنگراؤں جانے والی راہ پر جاتے پیچھے مڑ گیا ہے۔ اس کی آواز میں
کتنا درد ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے جب روشنی کی تمنا باقی رہتی ہے اس
کے تاروں کی جھنکار مجھے سنائی نہیں دیتی صرف گیت کے بول ہوا کے ساتھ
کبھی کبھار میرے کانوں میں پڑ جاتے ہیں۔

"ماں تم چپ کیوں ہو؟ کوئی بات کرو، مجھے ڈر لگتا ہے۔" منی بڑھتے
اندھیرے میں میرے ہاتھ کو اور زور سے پکڑنے کی کوشش میں اپنی گڑیا
کو سنبھال نہیں سکتی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ رہی ہے۔ اسے
کوئی اور سوال پوچھنے کا ہوش نہیں۔

منی کو بڑے ہونے پر آپ سے آپ پتہ چل جائے گا کہ اندھیرے

سے ڈرنا بیکار ہے۔ جب اس کا جادو چل جاتا ہے، پھر کچھ نہیں بنتا۔ بھائی کہا کرتے تھے "بی بی پانی میں زور ہے، پہاڑ سے رستہ خود بنا لیتا ہے" مجھے ان دنوں میں یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی، گہرائی میں زور کہاں سے آتا ہے۔ حالات کا دھارا اپنا راستہ خود پیدا کر لیتا ہے۔ بڑی ماں جب مجھے پکارتی ہیں "تو یہیں پھلکاری کر رہی تھی، کہاں سر کھپائے ہوئے ہے" "جی" کہتی ہوں، ہر کام کو اتنی ہی جلد نپٹانے کی کوشش کرتی ہوں کہ مصروف رہوں اور اپنے ساتھ اکیلے ہونے، سوچنے بچارنے کا وقت نہ مل سکے۔

جب سے تھا تو سوچ رہتی اب سوچ سے ڈرتے نہیں۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ یہ کمی کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کبھی کچھ نہیں ہوتا اور کبھی کچھ۔ آج آنکھیں بند کرتی ہوں تو دل کہتا ہے "وہ سب ابھی آئیں گے اور مجھے دیکھتے ہی کہیں گے "بی بی یہ کیا بہروپ ہے۔ پھلکاری تمہارے سر پہ ذرا اچھی نہیں لگتی۔ اتار اس کو پرے کر، یہ دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔ چھوڑ دے سارے کام، ادھر ہمارے پاس بیٹھ، چھٹیاں کتنی کم ہوتی ہیں اور پھر گزر کتنی تیزی سے جاتی ہیں۔ جب ہم گھر آیا کریں تو بس تو کہیں بھی نہ جایا کر۔"

بڑے کمرے میں صوفوں پر بیٹھے تصویروں کی طرف دیکھتے باتیں کرتے چائے پیتے آتش دان کے سامنے آگ تاپتے۔ جب ہم سب زور زور سے

قمقمے لگاتے تو اماں سوئی سوئی آواز میں کہتیں "صبح بھی اٹھنا ہے اب سو
جاؤ بچو۔" تو بھیا زور سے پکار کر جواب دیتے۔ "اماں گھر سے دُور ہی تو
بستے ہیں۔ سارا سال اُداس ہو کر سویا کرتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔
سو ہی جائیں گے اماں۔" اور میں سوچا کرتی تھی۔ خوابوں کی طرح یہ ساری
باتیں دُھول میں مل جائیں گی۔ محبت کے سہارے جو جنت آباد کی ہے اس
پہ اس طرح گرد و غبار چھا جائے گا کہ کہیں بھی شادابی نظر نہیں آئے گی ہم
تصویروں کی طرح حقیقت کی پرچھائیں ہیں۔ میرا دل تو سدا سے باولا تھا
اُلٹی باتیں سوچنے والا اور بڑا ہی مورکھ۔

دل سدا سے انہونی باتوں کے سپنے دیکھتا اور یونہی دھڑکتا ہے جب
اس سے بات کرتی ہوں تو کہتا ہے۔ "آخر تیرا کیا جاتا ہے بی بی! سپنوں پہ
تو کسی کا اختیار نہیں اور پھر ان میں پلنے میں کیا بُرائی ہے۔ کہ کھلے کواڑوں
کے اندر کسی دن وہ سب آ جائیں جن کا تمہیں انتظار ہے۔"

"میں کہتی ہوں میرے لیے سوائے اندھیکار کے کچھ باقی نہیں رہا۔"

دل کہتا ہے۔ "نا امید ہونا بہت بڑا پاپ ہے۔" پر امید
آخر کس سے کروں گی؟

منی میرا آنچل کھینچے پوچھ رہی ہے۔ "ماں بتا ہمارے ماما جانے
گھر کیوں نہیں آتے۔ کیا دیوالی پر ہم ماما کے پاس نہیں جائیں گے ماں؟

ساری لڑکیاں ہی تو جا رہی ہیں۔ ماں میرا دل اب اس گاؤں میں نہیں لگتا میرا
دل میلے میں بھی نہیں لگا۔ بس میرا جی تو اداس ہے۔ میں ماما کے گھر جاؤں گا
کس سے پوچھوں۔ اس کے ماما کا گھر کس جگہ ہے۔ بہت سے گاؤں سے باہر
سارے گاؤں مجھے گڑیا گھر لگتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ گاؤں
بھی رچا ہوا ہے۔ سب کچھ پہچانا ہی ہے۔

اور پھر یہ ہوتا: جانے کیوں بھٹکتی ہی رہتی ہے۔ ویسی چیزوں کو
ڈھونڈتی پھرتی ہے جو پہلے کبھی دیکھی تھیں۔ ایسی آوازوں کو سننے کی آس
لیے جو پہلے کبھی سنائی دی تھیں۔ سر پر گوبر کے ٹوکرے اٹھاتے اٹھاتے
دودھ بلوتے اپلے تھاپتے نہ جانے کیوں چند مہینوں سے میرا دل بجھا
دھڑکا کرتا تھا۔ جوہڑ میں اپنا آپ جاتی تو کبھی خوش ہوتی اور مجھے سارے
باجوں کے سُر اپنے قریب آتے جان پڑتے۔ مجھے اپنے سے دُور
لے جاتے ہوئے۔ پر اب مجھے معلوم ہے جہاں وہ سب ہیں۔ وہ دیس
میری پہنچ سے باہر ہے۔ شہر اور گاؤں کو جانے والے راستوں کی طرف رخ
سارے ہی راستے ایک دوسرے کو کاٹتے گزرتے ہیں۔ کہانیوں کے
اس شہر کا کھوج لگا کر میں کیا کروں۔

آباد گھروں کے کھلے کواڑوں سے اندر جلتے دیوں کی کانپتی روشنیاں
پریوں کے دیس کی تصویریں سی جان پڑتی ہیں۔ گڑیاں اور لڑکے ہیں اور تختی

اب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ سرقندوں کے ریشمی اوڑھنے ہوا میں پھڑپھڑا رہے ہیں۔ ہوا اپنا ریشمی آنچل سنبھالے دھیرے دھیرے سونے لگی ہے۔

اکیلے سے دو ہوں تو راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

تمنی کہتی ہے "ماں میں تھک گئی ہوں۔ مجھ سے اب اور نہیں چلا جاتا۔ لڑکے رو رہے ہیں اور ان کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی ہیں۔ رنگ ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ ہم راہ سے ذرا ہٹ کر ایک کھیت کی اونچی منڈیر پر بیٹھ گئے ہیں۔ تمنی نے میری گود میں اپنا سر رکھ لیا ہے۔ گوپال کہہ رہا ہے "دیکھو تو سہی عورتیں اتنی بیوقوف ہیں آج کتنے بچے گم ہو گئے ہیں۔ میلے میں انہیں ہوش ہی نہیں رہتا کہ سنبھال سکیں، پاگلوں کی طرح رام لیلا کی راس دیکھتے دیکھتے اپنے بچوں سے بچھڑ جاتی ہیں —"

"میلے کے بنا بھی تو بچے ماؤں سے بچھڑ جاتے ہیں۔" میں اس کی طرف دیکھے بنا تمنی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہوں۔

"تم کبھی بھول بھی سکو گی اس بات کو کہ نہیں۔ وہ وقت اور تھا یہ اور ہے۔" گوپال ہولے سے کہتا ہے۔

گوپال کو کیسے سمجھاؤں کہ وقت کبھی اور نہیں تھا۔ اور انسان کے نصیب میں دکھ اس لیے ہے کہ وہ بھول نہیں سکتا۔ میری یاد میں وہ زمانہ

اسی طرح زندہ ہے۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ ملک آزاد ہو گیا تھا۔ ملک بٹ
گیا تھا۔ امّاں اور ابا نے کہا یہ سارے لوگ پاگل ہیں۔ جو لڑ رہے ہیں۔ وہ گھر
دین کو بسانے جاتے ہیں۔ بھلا اتنے اپنوں کے درمیان بھی کبھی کسی کو کوئی
دکھ پہنچ سکتا ہے۔ امّاں ابا کتنے بھولے تھے کیونکہ دکھ تو سدا اپنوں ہی سے
ملتے ہیں۔ اس پریشانی کی کیا اصلیت ہے۔ جو بیگانوں کے ہاتھوں ہمیں
پہنچتی ہے۔ ساری زندگی نے اپنی خوبصورتی کھو دی اور ہر شے کا چہرہ
خون کے غبار میں چھپ گیا۔ بھگوان۔ گرو اور اللہ کے نام پر دان دینے
والوں نے ایک دوسرے کے گلے پر تلواریں چلائیں۔ بہنوں بیٹیوں کے
بیٹے کٹ مرنے والے عورت کی عزت اور عصمت کو جھوٹا بول سمجھنے لگے
حیا اور اپنوں کے لفظ صدیوں کی بیڑیوں کی طرح اس آزادی اور بٹوارے
میں کٹ گئے اور جیتے جاگتے ہنستے والوں کے رشتے موں میں دھواں بن
کر مل گئے۔ امّاں نے ابا سے کہا تھا "ہم بھی دونوں لڑکیوں کو لے کر
چلتے ہیں، میرا جی تو ہول کھاتا ہے۔ اس وقت کسی پر بھروسہ کرنا
بیکار ہے۔"

اور ابا نے اپنی اسی "نانیت" سے کہا تھا "بی بی کی امّاں تم بھی عام
لوگوں کی طرح ناحق جان گھلاتی ہو۔ بھلا ہمیں کوئی تکلیف ہو سکتی ہے۔ بٹوارے
کے بعد چار روز تھا شور تو چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں سب

ٹھیک ہو جائے گا، سب کچھ۔

امّاں جان سے لگی ہیں تو ایسے حساب سے خون ہو جایا کرتا ہے، یہ
جس دن سے ہو رہیں ہیں۔ جان کے ساتھ عزت کا خطرہ ہے۔ مسلمان
لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ میری مانو تو ہم سب کو بھیا کے پاس بھیج دو۔"
بابا نے ذرا ہوں پر جو دشت گاؤں سے آؤ۔ وہ لوگ بھاگتے پھرتے
ہیں۔ گاڑیاں کی گاڑیاں کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔ ایسے میں جانا اور
بھی زیادہ خطرے کی بات ہے۔ تم فکر نہ کرو خاموشی سے اپنے گھر میں ہو
خدا ہماری حفاظت کرے گا" بابا حالات کی وجہ سے پریشان ہو گئے
مگر انھوں نے وقت کے گزرنے پر سوائے خدا کے صبر و ثبات کے اور
کسی کی مدد کا راستہ نہیں واسطہ نہیں دیا۔ یوں وقت تو کب کا گزر چکا تھا بابا
کی بھول ایسی تھی کہ انھوں نے پرانی زندگی اور قدروں کا سہارا لیا تھا۔ اور
اسی بھول کے بدلے تو جب گوپال بھیا مجھے گھسیٹ کر گھر سے باہر لا رہا تھا۔
میں نے بابا کے سفید سر کو نالی کے کنارے پڑے دیکھا۔ ان کا جسم نالی
میں تھا۔ بند آنکھوں اور خون آلود سر کو بھول کر وہ جانے کس طاقت سے
پرارتھنا کر رہے تھے۔ دعا کے قبول ہونے کا وقت تھا بھلا؟ اماں کے سینے
سے ایک چمکتا ہوا برچھا آر پار ہو گیا تھا اور وہ اسی جگہ گر گئیں۔ جب ان
انھوں نے خدا سے اپنی حفاظت اور عزت کے محفوظ رہنے کی دعا مانگی

تھی۔ آپا کی چیخیں آج بھی مجھے آندھی کے شور میں کبھی کبھار سنائی دے جاتی ہیں۔ پر آج کی طرح تب بھی میں کیا کر سکتی تھی۔ گرپال سب پیچھے پیچھے جاتا تھا۔ میرے سر پر چھتری نہ تھی۔ پر مجھے ان راہوں پر بھیا کے ملنے کی آس کب تھی۔ اگر بھیا میرے پاس ہوتے تو بھلا کوئی مجھے چھو سکتا۔ کوئی یوں ننگے سر مجھے جنم بھومی کی ان راہوں پر گھسیٹ سکتا تھا۔ جہاں کا ہر ذرہ مجھے پیارا تھا۔ ان راہوں پر میرے بابا کا خون گرا ہے، اس دھول میں اُن کا سفید سر گھسیٹا گیا تھا۔ وہ کہاں دبی ہے؟ اگر اس دھول کی ایک جھلک دیکھ سکوں تو آج بھی اس کو ماتھے پر چڑھاؤں۔ وہ مٹی مجھ سے تو خوش قسمت ہے!

مجھے اپنے بابا سے کتنی باتیں بھی کرنا تھیں۔ ماں کو میں نے کتنا ستایا تھا۔ بھیا اور بھابی کو کتنا تنگ کیا گیا تھا اور جب میرا وجود ڈولی کے بجائے گھر آنگن تک کھینچا گیا تو کوئی ماں باپ نہیں تھا۔ جس سے میں رو رو کر التجا کرتی کہ بابل کا دیس چھوٹ رہا تھا اور کوئی مجھے وداع نہیں کر رہا تھا۔

دکھ سہنے کے بعد اگر سکھ کی آس ہو۔ دور کوئی امید ہو تو دکھ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور میرا راستہ کبھی نہ کٹ سکا۔ کیا بھولوں اور کیا یاد کروں گرپال۔ تو نے تو کبھی مجھے پیچھے مُڑ کر دیکھنے بھی نہیں دیا۔

چڑھی ماں کی مار، گرپال کی گالیاں، بھوک کی سختیاں میں نے دُور تک سہے

ویسے ہی طرح، اس آس کی طرف دیکھ کر برداشت کر لی تھیں۔ شاید بھائی اور
بھیا! مجھے بھی وہاں کمرے تلے ہوئے سنگھراؤں میں آ جائیں۔ بیچ میں بڑی ماں
کی طرف دیکھ، بڑی تھکے ادا دوں گی۔ اور توریال کی طرف دیکھ یا اپنے بھیا کے
ساتھ چلی جاؤں گی۔ اس دن ہم نے کھیتوں میں کھیلتی ہوا گیت گانے لگی۔
اور سارے گاؤں میں خوشیاں ہوں گی۔ انسان اپنے کو ساری کائنات کا مرکز
کیوں سمجھتا ہے نہ جانے کیوں؟ جب تک اندھیرے سے آنکھیں مانوس
نہیں ہوتیں۔ انسان اجالے کے لیے آنکھیں پھیلاتا رہتا ہے اور سپنے دیکھتا
ہے۔ امیدیں اور وشواسوں کی طرح دل سے لگا کر چکر لگاتی رہتی ہیں۔ تنگی
پیدا ہوئی ہے تو میرے سپنوں کی کڑیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ دل کے گرد
آشاؤں کا گھیرا بکھر گیا۔ میں نے سپنوں میں جاگنا شروع کر دیا۔ منگلاؤں کے
گیتوں میں کبھی کبھار میرا ایک بول بھی گونج اٹھتا۔

جب دونوں ملکوں میں صلح ہوئی تو توریال بہت اداس تھا۔ سہما سہما
اور پریشان، بڑی ماں اور وہ چوکے میں بیٹھے ہوئے جانے کیا کیا
باتیں کیا کرتے۔ پر مجھ سے دونوں کچھ نہ کہتے۔ ان دنوں تمتی پاگل چلتی تھی۔
اور توتلی باتیں کرتی تھی۔ خبریں زور شور سے گھومتی ہیں اور پھر گھوڑے کی
طرح بیٹھ گئیں۔ مجھے کوئی امن بھینے نہ آئی۔

پھر میں نے سنا، اس کے گاؤں سے دو سپاہی کے ساتھ سپاہی

لڑکیوں کو ڈھونڈھ کر لیے جا رہے ہیں۔ کس دیس میں کھو گئے؟ کہاں ان لوگوں کے درمیان؟ ان دنوں میں نے بھی سوچا تھا۔ شاید بھیا اور بھابی بھی مجھے ڈھونڈنے آئیں گے۔ جادو کے شہر کے دروازوں کے باہر وہ کب سے کھڑے۔۔۔ وہ دیکھ رہے ہوں گے۔ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے جانا چاہیے۔ ضرور۔ میں ہر روز اپنی امیدوں کی پوٹلی کی گرہیں باندھتی اور اس لگائے گلی کے موڑ کی طرف دیکھتی رہتی۔

اس سال سردیوں میں ہمارے سنگراؤں میں سپاہی مجھے بھی لینے آئے ہیں بھیا اور بھابی کی بیٹی بننے کے ساتھ ساتھ منّی کی ماں بھی ہوں اور جیسے سوچا جائے یہ کون لوگ ہیں۔ وہ کون دیس ہو۔ زندگی میں پہلی بار میرا یقین ڈگمگا گیا۔ سپنوں کا شہر دھواں بن کر میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ میری جڑیں سنگراؤں کی زمین میں گہری ہو گئی ہیں۔ سوچتی ہوں مرجھانا اور برباد ہونا کسے اچھا لگتا ہے۔ ہر کسی لڑکی کو اپنے گھر سے وداع ہو کر سسرال جانا ہوتا ہے۔ ہر دلہن بیاہ کر کہیں نہ کہیں جاتی ہے۔ میرے بیاہ میں بھیا اور بھابی نہ ملے تو کیا ہوا۔ کرپال نے میرے لیے لاشوں کا فرش بچھایا تھا۔ خون سے مانگ میں سرخی کی تھیں۔ شہر کے شہر جلا کر روشنیاں کی تھیں۔ لوگ چیختے چلاتے بھاگتے میری شادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ ساری فضا میں شعلے، راجوں کے مطابق دھونیں اور آگ اور خون کی بو تھی۔ مجھے وہ سنگراؤں لایا تھا۔

یہاں کھیتوں کے درمیان پکے گھروں کو ٹھڑی جیب میری باقی زندگی بیتنے والی تھی۔ اپلوں کے نیلے دھوئیں سے بھرے گھر میں۔

میں کتنی دیر اس کتاب کے حرفوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ جو گرپال استے برسوں بعد منی کو پڑھانے کے لیے لایا تھا اور لفظ میری آنکھوں پہ دھندلے ہو گئے تھے۔ مجھے وہ ساری کہانیاں یاد آ گئی تھیں۔ جو بھیا اور بھائی نے مجھے سنائی تھیں۔ اور میں کہا تھا۔ "بی بی اس سے بھی اچھی کہانیاں تو اپنے میں ہیں۔ بس تو ذرا بڑی ہو جا پھر دیکھنا سکتے ہے کی باتیں پڑھنے کی۔"

کہانیوں کی شہزادی کی طرح جب ڈری مجھے بیاہ کے آئی تب تو میں چپ تھی کسی اور کے ساتھ کیوں جا رہی بھلا؟ مجھے لانے اور وداع کرانے بھیا اور بھائی کیوں نہیں آئے؟ میں دل ہی دل میں بھیا اور بھائی سے روٹھ گئی ہوں ان سے آج تک خفا ہوں۔

منی جب میرے پاس لیٹتی ہے۔ اور مجھ سے پوچھتی ہے: "ماں تم دیوالی میں بھی ماما کے گھر کیوں نہیں جاتیں۔ ماں تمہیں کبھی کوئی مٹھائی کیوں نہیں بھیجتا؟"

ماما کبھی گھر سے ہی نہیں نکلے منی۔ تیرے ماما مجھے کبھی وداع کرانے نہیں آئے۔ بھلا زندگی میں کسے اتنی فرصت ہوتی ہے کہ کسی کو ڈھونڈتا پھرے ہوئے بچھڑے سہارے ڈھونڈ لیتی ہیں۔ بھیا کے بچے اب منی کے

برابر پڑے ہوں گے۔ وہ جب اپنی ماں سے ماما کے گھر کی باتیں پوچھتے ہوں گے۔ تو اسے چپ رو کر یا دھیان ہٹانے کے لیے ان سے ادھر اُدھر کی باتیں نہیں کرنی پڑتی ہوں گی۔ کبھی کبھار دل میں کہانیاں ہوتی ہیں پر زبان پر ایک لفظ نہیں آتا۔ گلی کی بہوئیں جب نیم کی چھاؤں میں چرخے کاتتی گیت گاتی ہیں تو میں چپ رہتی ہوں۔ ہمارے آنگن میں کتنی رونق ہوتی ہے۔ ملنے کے گیتوں میں کتنا رس ہے۔ رُتیں بدلتی ہیں۔ سال بہ سال کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو اُن کے باپ بھائی وداع کرانے آتے ہیں۔ تب آشا، رکھیا، پریوا اور چندر کے پاؤں زمین پر نہیں لگتے۔ وہ ہر ایک سے گلے مل کر اٹکے جاتی ہیں۔ ان کے بول گیت لگتے ہیں۔ رُتیں بدلتی رہتی ہیں۔

لڑکیاں کوٹھے سے اُڑا کر اپنے ویروں کے آنے کا پوچھتی ہیں۔ میرا دل گلے کے قریب یونہی دھڑکنے لگتا ہے اور کلیجے کے قریب ایک ٹس سے میں ہوتی ہے۔ مانو پھٹ جائے گی۔ میں کوے کو اُڑانے کے لیے ہاتھ اٹھاؤں تو بے جان ہو کر ہاتھ میرے پہلو میں گر جاتا ہے۔

بڑی ماں کو مجھ سے آس بندھ گئی۔ جب میں نے اپنی پچھلی زندگی سے سارے ناتے توڑ لیے تو میرا اور بڑی ماں کا ناتا اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ میں

اس کی گھنٹی دیوی بن گئی ہوں۔ میرے ہاتھ کا ثبوت وہ بڑے چاؤ سے
لوگوں کو دکھاتی ہے اور دوسری عورتیں جب اس سے اپنی بہوؤں کے
گلے کرتی ہیں تو وہ میری باتیں کر کے ان کا دل اور بھی جلاتی ہے۔

کھیتوں میں گھومتی دھان کی خوشبو اور سبز گندمی بالوں کی باس
دور تک پھیلے دھوئیں میں مل کر ایک گیت بن جاتے۔ اُن پر جھکائے
دکھ کے تاروں سے میرا "گاؤں" اور شہر کا عشق لہروں میں بل کھاتا پانی سے
اس کے بول ہوں۔ اگر بیلوں کے پیچھے سر پر پانی کے گھڑے اٹھائے
کسانوں کے پیچھے کسی دن گھوڑے پر سوار ایک جوان میرے گاؤں
کے سامنے آن کر اترے اور میں چاہا کہ کر اس سے لپٹ جاؤں۔ یہ
دروازے میں کھڑی کھڑی میلوں تک راہ تکا کرتی ہوں۔ آخر ان کے
مرنے کے بعد ان کی لاشوں کو اٹھانے مجھے کب تک گھومنا پڑے گا؟
ان انجان راہوں کو دیکھتے دیکھتے تو آپ سے آپ میری آنکھوں میں آنسو
آ جاتے ہیں۔ گھنٹی کے سر پر اگر یہ آنسو گر گئے تو وہ گھبرا کر اٹھے گی۔ اور
پوچھے گی۔ "ماں! تم رو رہی کیوں ہو؟" میں اس سے اپنا دکھ کیسے
کہوں؟

گھنٹی اٹھ بیٹھی ماں۔ تمہاری آنکھیں بھیگی ہوئی کیوں ہیں؟ تم
پرسوں کی رات بھی روتی رہی ماں۔ کیا تم تھک گئی ہو؟"

گوپال نے ـــــ دونوں بچوں کو کندھے پر اٹھا لیا ہے۔ منی اور میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ سیتا جی نے دوسری بار بن باس پر جانے کے بدلے راون کے گھر کو قبول کر لیا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آنے لگی کہ میں دوسری بار کسی بے یقینی کا سہارا لے کر اندھیکار سے باہر قدم دھر سکوں ؟

تنگی کی سار دو روشنیاں پتنگے شمع کی طرح مجھ سے دور بھٹکتی ہیں مگر پھر بھی مجھے اس اندھیرے سے پیار نہیں ہو پاتا۔ نہ جانے کیوں ؟

مجھے چلتے ہی جانا ہے۔ تھکن میرے انگ انگ میں دکھن بن کر پھیلی ہے۔ پر پھر بھی مجھے چلتے ہی جانا ہے۔ چلتے ہی رہنا ہے۔ زندگی کے میلے میں باسی اور بن باسی سب قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں اور میں قدم بڑھاتی سوچتی ہی رہتی ہوں کبھی بھائی اور بھیا بھی میرے لیے اداس ہوتے ہوں گے ؟

سب سے زیادہ ڈر تو مجھے منی سے لگتا ہے۔ وہ پھر کل مجھ سے یہ سوال پوچھے گی۔ اور پھر کوئی بھی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکے گا۔ نہ گوپال نہ میں اور نہ شاید جگ کی ماں۔

کئی سوال ایسے کیوں ہوتے ہیں۔ اتنے کٹھن اور ایسے مشکل جن کا جواب کوئی بھی نہ دے سکے۔

سردیوں کی لمبی راتوں میں دکھ الاؤ جلا کر بیتے سپنوں کو بلاتا اور کہا یا

سنتا ہے۔ کہانیاں بھلا کچی ہو سکتی ہیں۔ من بڑا ہٹیلا ہے۔ اسے بیتے دن
نہ جانے کیوں یاد آتے ہیں؟

— گاؤں سے پرے بھی کوئی شہر ہے کیا؟

گاؤں کی اونچی نیچی گلیوں میں گوبر اور مٹی کی اس اناج کی باس کے
ساتھ ہی زندگی کے دھارے کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔

آج کا دن بھی ختم ہو گیا۔ ہمارے جیونوں کی طرح دن ختم ہو جاتے ہیں
جانے ابھی کتنا راستہ باقی ہے؟

آگ کا رُوپ

جب ہماری بھینس لگاتی تو کچھ دنوں پر ماں کے میکے کے راستے سے ہم اچھے باخبر رہتے تھے۔ ماں کے میکے سے کوئی بھی آتا تو ہمارے گھر ماں کی خیر سکھ پوچھنے اور پیغام لینے کے لیے دو گھڑی ضرور رکتا۔ گرمیاں ہوتیں تو ماں گڑ کا شربت بنا کر پلاتی اور میری دادی سے پوچھ کر کوئی بھی دو گھڑی تک بیٹھے نیم کی چھاؤں میں بچھی چارپائی پر بیٹھے مہمان سے ضرور بات کرتی۔ وہ بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور جاتے سمے اچھا بی بی رب کے حوالے کہہ کر صافا جھاڑ کر کندھے پر ڈال کر ہاتھ میں پکڑی گٹھڑی کو پیچھے لٹکا کر جب حویلی کے دروازے میں سے نکلتا تو ماں ٹھنڈا سانس بھر کر ہولے ہولے چلتی دادی کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور کتنی ہی دیر اداس رہتی تھی۔ ہمارا گاؤں ویسے بھی میرے ننھیال کے گاؤں سے دور پر شہر سے نزدیک تھا اور پھر پڑتا بھی راہ میں تھا۔ مہینے میں ایک آدھ دفعہ کوئی نہ کوئی ضرور ہی ہمارے آنگن میں آتا۔

رب سب کا بھلا کرے اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ چنن ہماری لگتی لگاتی
تو کچھ نہ تھی۔ جب اس کا باپ یہاں سے ملنے ہمارے آنگن میں آیا تو رو پڑا۔ اس
کی بیوی چنن اور کرتار کو چھوڑ کر سنتو کے دن بجھے مر گئی تھی۔ بھلا بھیا تو اسے
کوئی خاص دکھ نہ تھا۔ پر ایک دوپہر وہ باہر گئی تو گاؤں کے کھیتوں کے درمیان
بہتے نالے پر سے پھلانگتے ہوئے اس نے اشیر سنار کی بہن کیسری کو دیکھا۔
کیسری کو مرے ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ اور ان دنوں تو چنن کی ماں کا
بیاہ بھی نہ ہوا تھا۔ کیسری دو دھوا تھی۔ جب مری ہے اور کہتے ہیں کہ ماں کے
میکے میں ان دنوں اس سے بڑھ کر خوب کسی عورت کی نہ تھی۔ جیسے کپڑوں
میں وہ ہیرے کی کنی کی طرح لگتی تھی۔ دوسرے گاؤں سے جوان اسے دیکھنے
آیا کرتے تھے۔ مگر وہ تو بڑی ابھاگن تھی۔ سہاگنیں اس کے سائے سے بچتی
ہیں۔ اور اشیر سنار اگر اسے کبھی گلی میں پھلانگتے دیکھ لیتا تو دکھ میں تپے
دھان کی طرح کڑھتا۔ اس بیچارے کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ اپنی بہن کا کیا کرے
وہ اس سے زیادہ سے زیادہ کام لیتا۔ گھر میں اس کی بھابی مہاجنوں کی طرح
پلنگ پر چڑھی بیٹھی اس پر حکم چلاتی اور سارا دن اس اکیلی کو کرنا پڑتا۔ سر
میں سے جوئیں نکالنے کی فرصت کہاں سے تو اسے ملتی نہ تھی۔ کپڑے میلے چیکٹ
ہو جاتے پر اسے صاف کپڑے پہننے کون دیتا تھا۔ ایک دن پتا لگا تھا
کیسری مر گئی ہے نہ دکھ نہ کوئی بیماری۔ اسے شمشان لے کر چار آدمی گئے

اُنھوں نے آکر بتایا کہ چتا میں سے بچّے کے رونے کی آواز آتی تھی۔ رام رام
پر ایسی بات کون مانتا ہے۔ پھر وقت بیت کر بہت کچھ بھلا دیتا ہے۔
کیسری کو دیکھ کر چھنّن کی ماں جو بوڑھی ہے تو بھونک کر بیمار پڑ گئی۔ حکیم جی
کی دوا دارو سے تو وہ اُٹھنے والا نہیں تھا۔ جتن کرانے والوں کے آتے
آتے آٹھویں پھر اس نے دم دے دیا۔ دُور نزدیک چھنّن کا اور کوئی نہ تھا۔
کرتار ابھی چھوٹا تھا بھی چھنّن سے ایک سال چھوٹا۔ آٹھ سال کا تو ہوگا ہی۔
میری دادی ویسے تو بڑی کراری عورت ہے۔ نہ کسی کی سُننے والی نہ کسی
سے دبنے والی۔ اس نے کبھی کسی کی منّت بھی نہیں مانی۔ پر چھنّن کے
باپ کو روتا دیکھ کر وہ بھی پاس آ بیٹھی۔ پھر کہنے لگی: "دیا تو پریشان نہ ہو،
رب کا دیا میرے گھر سب کچھ ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں۔ تیرے بچے میرے
پوتے پوتیوں کے ساتھ اپنا نصیب ہی کھائیں گے۔ ان کی ماں مر گئی تو تیرے
مقدر کا لکھا ہے۔ جب تک تو دوسرا گھر کرکے اپنا گھر آباد کرے۔ بیشک
تو اپنے بچوں کو ہمارے پاس چھوڑ جا۔ تب تک یہ ذرا سیانے بھی ہو جائیں
گے۔" اور یوں چھنّن اور کرتار ہمارے گھر میں آگئے۔

کرتار بڑا تیز اور ہوشیار تھا۔ بچپن سے بڑا ہی الگ طرح کا اور چلبلا۔
چھنّن کچھی کچھی سی اور دھیرج والی۔ جیسے بجھتے الاؤ میں نہ بجھنے والی چنگاری سی
ہو۔ دُبلی دُبلی اور سہمی سہمی سی جیسی اکثر لڑکیاں جن کی مائیں بچپن میں مر جاتی ہیں۔

ہوتی ہیں۔ کرتار اس سے ایسا سلوک کرتا جیسے وہ اس کی چھوٹی بہن ہو۔ اس
کی شکل پر ایسی ویرانی تھی جسے دیکھ کر رونا آجائے۔ میری ماں کو وہ پیا کہتی
اور کوٹھڑیوں دالانوں میں اس کے پیچھے پھرتی رہتی۔ دادی اگر اسے پیار سے
بھی بلاتی تو وہ رونے لگتی۔ اسے گڑیاں کھیلنے کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ پر اسے
کپڑوں کے کاٹنے اور رنگین کترنیں ڈھیروں جمع کرتی رہتی اور پھر جب گرمی
کی ویرانی دوپہر میں چیلیں ٹک ٹک لگانے لگ جاتیں وہ جا کے پچھلے
کمرے کی ذرا سی منڈیر کے سائے میں اکیلی بیٹھی رہتی۔ رنگین اور الگ
الگ رنگوں کی ڈھیریاں لگاتی رہتی۔ گلی محلے کی عورتیں جب نیم تلے چرخے
کاتنے بیٹھتیں تو اسے دیکھ کر کہتیں۔ رب کرے کسی لڑکی کی ماں نہ مرے۔

وہ بولتی بھی بہت کم تھی۔ پہلے پہل تو دادی اسے کام نہ بتاتی یہی سمجھ
کر کہ ابھی دکھ نیا ہے۔ اور لڑکی ہونے کے ناتے چنن کو اپنی ماں سے بہت
پیار ہوگا۔ پھر جب وقت ہوتے ہوتے آگے کھسکنے لگا تو چوٹ جیسے
پرانی ہونے لگی ہو۔ دادی کبھی کبھار آپ ہی آپ دانت پیس کر کہتی۔ اچھی
مصیبت ہے لڑکی کیا ہے سیاپا ہے۔ جہان ہے تو دس سال کی لڑکیاں
گھر سنبھال لیتی ہیں۔ یہ ابھی کونوں میں بیٹھی رہتی ہے۔ پھر میری ماں سے
کہتی کرلیے ایک تو ہے اسے سارا دن اپنے پیچھے پھراتی رہتی۔ بھلا
کوئی کام بتانے تو یہ تیرے ساتھ سے اترے۔ یوں چنن پہ کبھی بھی ماں اور

دادی کا تھوڑا جھگڑا ہو جاتا۔

رات کو جب ساری حویلیوں کے لڑکے لڑکیاں باہر جا کر آنکھ مچولی یا دھوپ چھاؤں کھیلتے تو وہ اپنی ویران اور خالی شکل لیے عورتوں کے جھمگھٹ میں ماں کے ساتھ ہی لگی رہتی۔ کبھی کبھار کوئی ہمسائی بات کرتے کرتے کہتی: "بہنی تیج کور تو نے تو اس لڑکی کو اپنا سایہ بنا لیا ہے۔ اس کو کہہ جب کر بچوں کے ساتھ کھیلے۔ اس کے سنگ کی لڑکیاں ہیں ان میں جا ملے ہنسے بولے۔"

اور ماں اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہتی: "نہیں بہن یہ تو بس کملی ہے اس کا بہت دکھ کرتی ہے۔ ہماری باتیں کیا سمجھے گی تم قصہ چھوڑا کرو۔" اور یوں بالیں ابھی چھوٹی ہی تھی جب عورتوں کی باتیں سنتی اور ان میں الجھی بیٹھی۔

گاؤں میں سکول چار جماعتوں تک کا ہی تھا اور پھر آٹھ کوس چل کر شہر کے مدرسے میں جانا پڑتا۔ گرمیاں ہوتیں تو تاروں کی چھاؤں میں روٹیاں باندھ کر اور بستے سر پہ رکھ کر چل پڑتے۔ دوپہر گزارنے کے لیے باپو نے اپنے ایک جان پہچان والے کے گھر پر ٹھکانہ بنا دیا تھا۔ دن ڈھلے چلتے تو تارے نکلے گھر پہنچتے۔ روٹی کھا کر باہر چلے جاتے۔ سردیاں ہوتیں تو بھی دن کے چڑھنے کے ساتھ ماں پراٹھے پکا کر رومالوں میں باندھ دیتی اور سورج کی پہلی کرنیں ابھی نتھا سنگھ کے باغ سے پرے ہی ہوتیں۔ سبز میز

پٹڑی پر گرم ہونے کے لیے ہم دوڑ لگاتے اور پھر تھک جاتے اور تھکے
ہوئے چلنے لگتے۔ شام کو جب گھر پہنچتے تو صرف ماں جاگتی ہوتی۔ کبھی
وہ سر پر ہاتھ پھیر کر سینے سے لگا کر پیار کر لیتی اور کبھی جلدی سے اور دن کو
میں وہ پکی روٹی دے کر روٹی ٹھنڈی کو گرمانے کے لیے اس کے ساتھ
بیٹھ جاتی۔

اور اس طرح میں آٹھویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا جب
میں نے دوبارہ چھٹن کو دیکھا ہے۔ اتنے سالوں میں چھٹن کا باپو بھی مر گیا تھا۔
اور وہ دونوں بہن بھائی سو دے کبھی کبھار اپنے ایک برادری کے چاچے کو
ملنے جانے کے بہانے ہمارے پاس ہی رہتے تھے۔ کرتار تو میرے جتنا ہی لمبا
تھا بلکہ مجھ سے دو انگل نکلتا ہوا ہی ہوگا۔ گبھرو جوان جس نے میرے باپو
کا سارا بوجھ اپنے پر اٹھا لیا تھا۔ بیل بیمار ہوتے تو کرتار ہی ان کی دوا کرتا۔
میری چھوٹی بہنیں ماندی ہوتیں تو حکیم کے پاس وہی انھیں لے جاتا۔ دادی
کہتی "کام ہر کسی کا پیارا ہوتا ہے۔ میرے اکیلے پوت کے ساتھ جس طرح
کرتار بازو بن کر رہا ہے وہ۔ مجھے تو وہی اچھا لگتا ہے۔"

خیر تو جب میں نے چھٹن کو دوبارہ دیکھا ہے تو وہ کوئی بھرپور جوان تو
تب بھی نہ تھی۔ پر تیزی سے والوں سے کوٹھڑیوں میں جاتی اور کوٹھڑی
سے آنگن میں کاموں میں لگی پھرتی۔ مجھے وہ اچھی لگتی۔ پہلے کی طرح اب اس

کی ناک مُڑی تُڑی سی تھی۔ اس کے موٹے ہونٹوں کے کنارے جیسے بھوسے
چہرے میں کچھ چھپ گئے تھے اور گہری سُرخ چُنری موٹے کھدر کی ہونے پر
بھی بھلی لگتی تھی۔ اُس کا رنگ سانولے سے کچھ اور نکھر کر گندمی کے قریب
قریب ہو گیا تھا۔ اُس نے اب ہنسنا سیکھ لیا تھا اور اس کی شکل کی ویرانی
کبھی کبھی کی مسکراہٹ میں بڑی اداس لگتی۔ جیسے آندھی اور بارش میں بھیگے بن
پر غبار کے اوپر سے اچانک دھوپ کا دھارا سا چمکنے لگا۔

اُس کے انداز میں وہ رکھ رکھاؤ نہیں تھا جو اس کی عمر کی عام لڑکیوں
میں ہوتا ہے۔ پر یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ میرے لیے وہ کوئی بیگانی
تو نہ تھی۔ ہم سمجھئے بہت سال اُس گھر میں اکٹھے گزار رہے تھے۔ اپنے
گاؤں میں ہی اگر کسی لڑکی سے بات کرو تو وہ سمٹ جائے گی گھونگھٹ شرم
سے جھک کر اپنی چُنری کو دانتوں میں پکڑنے لگے گی یا پھر بھاگ جائے گی
چھپنے کے لیے۔ وانو تو میں تو تھا ہی یہیں۔ اُسے کیا پتہ تھا میں نے آٹھویں
جماعت کا امتحان دے دیا ہے اور ناول بھی پڑھنے لگا تھا۔ ڈھلی رات
تک جب میں سرہانے سرسوں کے تیل کا دیا جلا کر کتاب پڑھتا رہتا تو وانو
اچانک کروٹ بدل کر آنکھیں کھول لیتی اور میری طرف دیکھ کر کہتی بھاؤ!
کتنی رات چلی گئی ہے۔ اب بس کر۔ کیوں اتنا سر کھپاتا ہے۔"
وانو کہتی۔ "کیا کام تو کرنا تھا اب چھٹیاں ہیں بھلا اب کیوں پڑھتا ہے۔"

اور میں ان دونوں کی بات کا جواب دیے بنا یوں مسکراتا جیسے اس اُتم دو یا کا اُن دونوں جاہل عورتوں کو کیا پتہ ہے۔ اگر جٹھانی کبھی کبھار مجھ سے بات کر لیا کرتی تو شاید جو ہوا ہے وہ کبھی نہ ہوتا۔ مگر اُسے تو سرے سے میرے ہونے ہی سے انکار تھا جیسے میں اُسے دکھائی نہیں دے رہا ہوں جیسے اس گھر میں کہیں تھا ہی نہیں۔ کرتار سنگھ کے گھر آتا تو وہ اس کے آگے پیچھے پھرتی، بھاڈو کہتے کہتے اس کا منہ سوکھتا تھا۔ اس کے لیے روٹی لیے جاتی ہے۔ دوڑ دوڑ کر اس کے کام کر رہی ہے۔ اُسے پنکھا جھل رہی ہے پچھلے پہل میں نے سوچا آخر میں اس کا ماں جایا نہیں ہوں نا اس لیے مجھ سے یہ فرق ہے۔ پر جب جوگندر آتا تب بھی وہ ایسے ہی اس کے آگے رہتی جاتی۔ اُسے پانی پلاتی پھر رہی ہے۔ اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے جوگندر چوتھی جماعت سے ہی اُٹھ بیٹھا تھا اس کا دل کتابوں میں نہیں لگتا تھا۔ وہ کھیتوں میں ہل چلاتا اور کافی وقت نہر میں تیراکی میں لگا رہتا اُونچے اُونچے پل پر سے پانی میں کود جاتا اور ایسی ڈبکیوں سے جب ان میلے دیکھ کر بھی دہل آئے وہ تیر کر پار کر جاتا۔ کشتی لڑنے میں دُور دُور تک اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جانوروں کی بیماریوں کا چھوٹا موٹا حکیم تھا۔ معمولی شُد بُد ہو اُسے ہو گئی تھی تو اس نے علاجوں کی ایک کتاب منگوالی تھی۔ گاؤں میں کسی کا بیل بیمار ہو، کسی کی گائے کو تکلیف

جو لوگ بجائے ہمارے جوگندر کے پاس آتے اور میں اوپر نیچے تخت پر دیوتا
کی طرح بیٹھا مسکراتا رہتا اور وہ دالان میں نیچے پلنگ پر لیٹا ناول پڑھتا رہتا۔
عورتیں بہت پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے مجھ سے بات کرتے ہوئے
ذرا جھجکتی تھیں۔

نتیجہ نکلا تو پاس ہو گیا۔ اور پھر نویں جماعت میں میں ہوسٹل میں
رہنے لگا۔

چھٹیوں میں میں گھر آتا تو تھوڑے سے طور طریقے شہر والوں کے
سیکھ گیا تھا۔ روز چلنے میں جو وقت لگتا تھا۔ وہ میں نے پڑھنے سے بچا کر
شہر گھومنے میں گزارنا شروع کر دیا۔ ان دنوں میں نے تانک جھانک سیکھی
لڑکیوں کی باتیں سنیں۔ اور بائیسکوپ کے لیے اچھے بہانے
پیسے لینے کے طریقے بھی آزمائے۔

چمن کو دیکھ کر لگا جیسے میں کسی بائیسکوپ میں کام کرنے والی ایکٹ
ریس کو دیکھ رہا ہوں۔ تم سب لوگ جو یہ قصہ سن رہے ہو سوچو گے کہ میں
ان دنوں اس عجب خوبصورت والی چمن پر مرا جا رہا تھا پر میں اتنے
سالوں کے بعد آج بھی سوگند کھاتا ہوں کہ مجھے وہ کبھی ایسی نہیں لگی کہ
میں اس پر مرتا۔ شام ہو رہی تھی۔ سردیوں کی خاموش چپ چاپ
سی اداس شام جب دھواں نیلی دھاریوں میں پھیلتا ہوا آکاش کی طرف

جاتا ہوا ذرا بھی خوشی نہیں دیتا۔ کرتارا اور جوگندر ماں کے پاس چپکے سے
بیٹھے تھے۔ چھنّو دودھ کی چاٹیاں ماں کے پاس رکھ رہی تھی۔ منّی جواب
ذرا بڑی ہو گئی تھی بار بار چھنّو کی چنری کا پلّو پکڑ کر کھینچتی اور کہتی: "ہمیں بھی
گڈی کے لیے کترن کاٹ دے۔" میں آنگن میں اندھیرے میں کھڑا رہا
اور تصویر کی طرح وہ گھڑی سب کے دل کے اندر کہیں اتر گئی۔ وہ سارے
خوش تھے۔ خوش اور مگن۔ کوٹھے کے اندر گائیاں اور بھینسیں کھڑی
تھیں اور ناند میں منہ مار رہی تھیں۔ زور زور سے سانس لے کر وہ کبھی
کبھی ایک دوسری کے سر سے سر ٹکراتیں تو گھنگرو بج اٹھتے اور پھر
تیزی سے چارے پر منہ مارنے کی آواز آتی۔ اپلوں کی آگ اس شام
کو کتنی خوش رنگ لگتی تھی اور کبھی کبھی اوپر سے چمکتے برتنوں پر چمک
کے ساتوں رنگ شعلوں کے ساتھ بھڑک اٹھتے۔ پھر نیم پر بیٹھی سردی
میں ٹھٹھری کوئی چڑیا زور سے چوں چوں کرنے لگی۔ پتوں میں کھڑ کھڑ ہوئی
اور پھر پھڑپھڑا کے سر پر سے چکر کاٹتا ہوا دوبارہ شاخوں میں جا چھپا
اور میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ آلو کا گھر [illegible] ہوتا تو اچھا نہیں ہوتا۔
پھر میں نے سوچا میں پڑھا لکھا آدمی ہوں یہ جاہل عورتوں کے دھندے
میں ان میں کیوں پڑوں۔ دوسرے دالان میں سے دادی نے کہا
"کرتیے چھنّو ذرا گڈو تو دے جا۔" چھنّو کے بچے کو دنی ہوئی منّی بھی چپ

گئی۔ کرتار اپنی بہن کو دیکھتا رہا اور اس کے جانے کے بعد بڑے اکھا: "بوا چنتی تو اب جوان ہو گئی ہے۔"

اور ماں نے کہا: "ویر تو کیوں فکر کرتا ہے۔ واہ گرو آپ ہی کوئی سبب بنائے گا۔ مجھے تو زور اس کی فکر ہے۔ مجھے تو جس طرح منتی ہے اسی طرح چنتی ہے۔"

کرتار چوکے میں سے اٹھ کر باہر کی طرف آیا تو یہ یا ابھی آنگن میں کھڑا تھا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔ جیسے خاموش اور ٹھہرے ہوئے پانی میں میں نے پتھر مارا ہو۔ جوگندر میرے گلے سے لگ گیا۔ کرتار بھی مجھے پیار سے ملا۔ منتی کو دو تی ہوئی آ کر میری ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ ماں نے مجھے کلیجے سے لگایا۔ میرا منہ چوما۔ ایک پل آنسو بہتا گئی۔ دادی نے کہا "میا دو ذرا جلدی آ جاتے اتنی رات گئے آنے میں کیا مزہ آیا۔ اوپر سے سردی ہے اور ہوا بانگ کے چل رہی ہے۔" پھر وہ سارے میرے گرد بیٹھ گئے اور مجھ سے شہر کی باتیں سننے لگے۔ چنتی ادھر اُدھر کاموں میں لگی تھی۔ سب پر اداسی، جیسے میرا آنا اور نہ آنا اس کے لیے کوئی فرق نہ ڈالتا ہو۔ باپو اسی دن کسی کام سے امبور گیا تھا۔ کرتار بیلوں کی کھرلی پر سونے کے لیے چلا گیا۔ جوگندر اور ہم دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے آنگن سے

اندھیرے میں گم ہو گئے۔ پھر میں نے گلی کے نکڑ پر ان کے گانے کی آواز سنی جو خاموش گلیوں میں گونج رہی تھی۔ گلی میں سے کوئی سادھو سنگر ان کے نام، رام کے نام کا گیت پڑھتا تھا اور پھر ہر طرف ایسی چپ ہوتی جیسے پتہ نہیں کیا ہونے والا ہو۔ دادی نے مٹی کے تیل کا ذرا سا ٹمٹماتا دیا جلایا جو لمبے دالان کے ایک طاق میں جلتا رہا۔ ماں اور منی ایک کوٹھڑی میں سو گئیں۔ دادی سب سے پچھلی کوٹھری میں جس میں اناج اور مٹکے رکھے تھے، چلی گئی۔ اُسے بہت سردی لگتی تھی۔ میں نے کہا "مجھے زیادہ سردی نہیں لگتی۔ میں دالان میں ہی سوؤں گا۔"

پھر گرج کے ساتھ بادل سے اولے برسے اور تڑ تڑ دالان کے دروازوں سے ٹکرانے لگے۔ ماں کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر بولی "بیٹا تجھے سردی لگتی ہوگی اندر آجا میرے پاس۔" میں نے کہا "نہیں ماں تو ذرا فکر نہ کر میں بالکل ٹھیک ہوں تو بے فکر ہو کر سو۔"

ہوا گونج کے ساتھ چلتی تھی اور نیم کی شاخیں شاخیں دالان کے باہر اپنا سر مارنے لگی۔ مجھے لگا جیسے آتو چیخ رہے ہوں اور شمشان سے مرنے والوں کی آتمائیں اندر آنے کا کہہ رہی ہوں۔ خالی گلیوں میں بھیگے ہوئے پتے ایک ہول دلانے والی آواز کے ساتھ اڑتے اور شور کرتے۔ میں ڈرنے لگا مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں کیوں نہ ماں کے کہنے پر اندر چلا گیا۔

سدا سے تو یہ طریقہ تھا کہ چھٹن دادی کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں سوتی تھی اُسے کوئی پرائی لڑکی بھی تو نہیں سمجھتا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ ہمارے ساتھ تھی پھر دادی اپنی سختی کے باوجود اسے پیار کرتی تھی "بے ماں کی لڑکی تھی"۔

ہمارا گھر یوں تھا ایک لمبائی کے سرے پر سے دُوسری لمبائی شروع ہوتی ہے۔ ایک طرف دالان ہے اور کوٹھڑیاں ہیں اور آخری کوٹھڑی کے ساتھ ساتھ دُوسری طرف پھر کوٹھڑیاں ہیں اور دالان ہیں۔ دونوں دالانوں میں ایک دروازہ ہے۔ جو کھلا رہتا ہے۔ اناج کی کوٹھڑی جس میں دادی سوتی تھی۔ اس کے بالکل دُوسری طرف آخر میں ایک بڑی کوٹھڑی تھی جس میں صندوق اور بستے بھرے گھڑے کے ڈھیر ہیں۔ بڑے صندوقوں کے اُوپر کی طرف چھوٹے اور پھر اس سے چھوٹے ایک چوٹی سی بنتی جاتی ہے۔ بڑی چیزوں کے اوپر چھوٹی چیزیں رکھنے کا شوق عورتوں کو کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

مجھے سردی زیادہ لگ رہی تھی۔ اندھیرے میں میں نے دُوسرے دالان کا دروازہ ڈھونڈا اور دُوسری طرف نکل گیا۔ دُوسری طرف سوائے صندوقوں کے باقی کوٹھڑیاں الم غلم چیزوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں کسی میں فواڑی پلنگ ہیں کسی میں کرنی سے گھر کے سوکھے سڑے ہزاروں حصہ

چیز۔ اُن دنوں مجھے کیا خبر تھی جب میں نے ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا جس
میں دیا مدّھم جل رہا تھا تو اندر میں نے چھین کو بے سُدھ سوئے ہوئے دیکھا۔ باہر
کے مقابلے میں اندر گرمی تھی اور ہوا کا شور بھی کم تھا اور نیم میں سے آ تو کی
چیخیں کم سنائی دیتی تھیں۔ اُس کے گرد رنگ برنگ کی کترنیں پھیلی تھیں اور
ایک ادھ سلا گڑیا کا کرتا بھی پڑا تھا۔

میں نے اپنا سانس روک کر آہستہ سے کہا "چھّن"۔

اُس کا سانولا رنگ جواب نکھر کر پک آیا تھا اور گندمی ہو چلا تھا جیسے
سونا ہو۔ دیے کی روشنی پڑتی تو میں شعلے کی طرح کانپتا لگتا تھا۔ اور تب
میں نے اُسے قریب سے دیکھا۔ اُس کی ناک جو کبھی زمانے میں بس ذرا سی ابھرا
کرتی تھی اونچی اور بڑی اچھی تھی۔ نتھنے سانس کے ساتھ ساتھ پھولتے تھے۔

جوان عورت بڑا مدھر سپنا ہے۔

اُس کے بال بہت کالے تھے اور ماتھا کھلا تھا۔ جیسے ہمارے یہاں
اچھے نصیب والوں کا ہوتا ہے۔ مجھے لگا وہ سوئی ہوئی نہیں۔ یونہی مجھے
دیکھ کر سوتی بن گئی ہے اور اس کی آنکھیں۔ میں بند آنکھوں کی بات کر رہا
ہوں۔ کھلی آنکھوں کی نہیں۔ تم نے کھلی آنکھوں والا جاگتا ہوا سپنے جیسا
رُوپ دیکھا ہوگا۔ اور پھر میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا ہے چھین ذرا بھی تو
اچھی نہیں تھی۔ اگر تم اُسے گھر میں چلتے پھرتے دیکھ لیتے تو کبھی بھی اس

کی طرف نہ دیکھتے۔ پر میری بات تو دوسری ہے۔

کوٹھڑی کے دروازے کو میں نے ہولے ہولے بند کرنا چاہا تو کواڑ
چوں چوں کرنے لگے۔ میرا سانس یوں چل رہا تھا جیسے تیز آگ سے پتیلے
میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ پسینہ میرے سر کے بالوں میں سے گرم بوندوں
کی طرح نکلا اور سامنے پہنے پسینے سے۔ مذاق بنانے اور دوسرا حق پاس رکھنے
رکھے چھتی ہی تو سو رہی تھی چھتی ہے ہی۔ بہت دنوں سے جانتا تھا جو
ماں کے پیچھے پیچھے دالانوں اور کوٹھڑیوں میں پھرتی تھی میں نے پھونک
مار کر دیا بجھا دیا اور چھتی کے کھلے ماتھے کا نصیب بھی بجھ گیا۔ میرے
ذہن میں نادان سے فقرے۔ بانیکر پیپ کی تصویریں اور لڑکیوں کی باتیں
بٹ گئیں۔ جیسے بہت سی چیزیں گڈمڈ ہو جائیں جیسے زمین کے نیچے
گائے نے ایک سینگ کا بوجھ دوسرے سینگ پر بدل لیا ہو جیسے دیے
کا تیل جلتے جلتے کم ہوتا ہے اور لو مدھم ہوتی ہے ویسے میں نے
اپنے سامنے چھتی کو مدھم ہوتے اور پھر گھٹتے اور پچکتے دیکھا ہے۔ اس
کا بجھنا میں نے نہیں دیکھا۔

چھتی کو اس کے بعد میں نے مسکراتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ کام کرتے
ہوئے جیسے پسینے میں چل رہی ہو۔ مجھے ہوا پر تیرتی ہوئی لگتی۔ دن بدن
اس کا وجود جیسے کم ہو رہا ہو۔ دادی کہتی چھتی تجھے ایک دم سے کیا ہو گیا

ہے۔ مجھ اکیلی پر تو جوانی نہیں آئی۔ پتہ نہیں کیا سایہ ہے کہ ہر شے کو گرا دیتی
ہے۔ پھر ماں سے کہتی۔ "کرپے میں کہتی ہوں اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے
کی سوچ واہ گورو کرے اپنے گھر جائے۔" اور میں باہر گھومتا پھرتا رات
کے پہیے دیکھتے دیکھتے یہی سوچتا اب چھیّن کا کیا ہو گا۔ اب میرا کیا ہو گا؟
مگر سب سے حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو یوں ہی رب کے
سپرد کر دیا تھا۔ کیوں آخر کیوں؟

چھیّن اکثر دادی کے ساتھ سوتی تھی نا۔ مگر پتہ نہیں اس میں یہ ہمت
کہاں سے آگئی تھی کہ وہ چھپیوں پھر میں کئی دفعہ مجھے ملنے آئی۔

جب میں اس سے پوچھتا چھیّن بتا تو میں تجھے اچھا بھی لگتا ہوں کہ نہیں
تو وہ کبھی جواب نہ دیتی۔"

اور یوں ہے کہ اس نے ان دنوں بہت کم باتیں کی ہیں۔ ان دنوں
میں نے پہلی اور آخری بار یہ جانا کہ عورت کا ایک روپ آگ بھی ہے۔ وہ
گرم لاوے کی طرح میرے چاروں طرف بہہ گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ اس
کے بعد چھیّن نہیں رہی تھی۔ اس کا وجود۔ مگر میں تو یہ کتابوں اور پڑھی ہوئی
سیکھی ہوئی باتوں کی مدد سے چھیّن کو ایک سوال کی طرح حل کرنے کی کوشش
کر رہا ہوں۔ بھلا ایسی کوششوں میں کبھی کوئی کامیاب ہوا ہے۔

اس کی شکل پر پھیلتی زردی جب بڑھتی گئی تو کرتار کہنے لگا: "ہوں تجھے

دن اُسے چاچے کے یہاں نہ بھیج دیں۔ جس دن بتاری نے گرنار کو کسی کام سے اجبور جانا پڑ گیا۔ چٹن کو پہنچانے جوگندر گیا۔

میں نے سوچا تھا اس کے جانے کے بعد میں پریشان ہو جاؤں گا، حیران۔ جیسے ناولوں میں ہوتا ہے مگر کچھ بھی تو نہ ہوا۔ منتی اور میں سارا دن گائے کے نئے بچھڑے میں لگے رہے۔ شام کو وہ زور زور سے روتی رہی اور چٹن کو یاد کرتی رہی۔ دادی نے کئی بار کہا "بلے کتنی اداس ہے۔" اور ماں چوکے میں بیٹھی برتن مانجھتی کہنے لگی۔ "پتہ نہیں چٹن کو بیاہ کر میرا کیا بنے گا۔"

پتہ نہیں دونوں کس کام میں لگے تھے کہ گرنار اور جوگندر کو نہیں، باپو نے چٹن کو لینے مجھے بھیجا۔

میں راستے بھر میں کیا کیا کہانیاں بنتا گیا۔ چٹن اگر سب کے سامنے نہیں تو دل میں مجھے دیکھ کر ضرور خوش ہو گی اور پتہ نہیں کیا کچھ۔ سوچ کی بھی عجیب منطق۔

چٹن کے چہرے پر زردی اور زیادہ تھی۔ اس نے پیلے رنگ کا ڈنگھائی کا رنگی چاچی کا دیا ہوا سوٹ پہنا تو اس کی شکل پر سونا سا پھیل گیا۔ مگر وہ پرانی ویرانی اس کی آنکھوں میں پھر لوٹ آئی تھی۔ جب ہم گھوڑیوں پر چڑھنے ہیں تو چاچی نے کہا "اچھا کاکی جیتے جی سے کے میلے

ہیں۔ تو آئی تھی تو چار دن گئی تھی۔ وہ گھر اور یہ گھر دو تو۔ ہاں نہیں واہ گرو
کرے تیرا نصیب چنگا ہو۔ رب کسی نیک کے متھے لگائے" چاچے نے
کہا "سمجھاؤ ہم تو اس گھر ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ورنہ تم جانو
اولاد کسی کو بھی دو۔ ۔ میں ہوتی۔ پر ہم سوچتے ہیں جب کرم سنگھ ان
بچوں کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں جیتے جی دے گیا تو ہم کون ہیں دخل دینے والے"
میں جواب دینا چاہتا تھا مگر مجھ سے کچھ بولا نہ گیا۔ اور چھنو نے زور
سے گھوڑی کی لگام کھینچی۔ گھوڑی نے ایک چکر لگایا اور پھر گاؤں کے
باہر راہ پر سرپٹ دوڑ گئی۔ میں نے بھی "اچھا چاچا جی پیری پونا" کہہ کر
اس کے پیچھے اپنی گھوڑی دوڑا دی۔ نہر کی پٹڑی پر میں نے اسے جا لیا
"تم نے یہ کیا کیا تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اور وہ اتنے زور سے ہنسی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ اسے اتنے سالوں
تک میں نے کبھی اس زور سے ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ پھر میں نے جی ہی
جی میں سوچا یہ خوشی بھری ہی ہوگی۔

پھر میں نے کہا "چھنو آج میں کتنا خوش ہوں۔ کیا تم خوش نہیں ہو" اور پھر
مجھ کو بادل کے ٹکڑوں، ٹھنڈی دھوپ اور سُنی ہوئی باتوں کا ایک دھارا سا آیا۔
میں بار بار بے تکی باتیں دہرانے لگا۔ ایسی باتیں جو شاید وہ سمجھتی تھی
اور نہر کی لہروں کی طرح سُن رہی تھی۔

میں نے پھر پوچھا چیتن کیا تم خوش ہو کرتار اور جوگندر کی جگہ تمہیں میں
بیٹھنے آیا ہوں۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا، صرف بڑی گہری نظروں سے
جو نہ ویران تھیں اور نہ خالی۔ جن میں نہ محبت تھی اور نہ ہی نفرت بلکہ ایک
عجیب شے تھی۔ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ وہ کیا شے تھی اور مجھے لگ رہا تھا
جیسے میں کالی موت کی دیوی کی آنکھوں میں جھانک رہا ہوں۔ اس نے
مجھے دیکھا۔

میں ڈر کر چپ نہیں رہتا۔ اصول ہے اگر ڈر کر چپ رہو تو دل بیٹھنے
لگتا ہے۔ اندھیرے میں اپنی آواز بھی دوسرے ساتھی کی طرح سہارا
بنتی ہے اور یوں اس سے ڈر کر میں نے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا
مگر میں بولنے لگا۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے گیتوں کے بول اونچی آواز سے
دہرانے شروع کیے۔ بول پتھر کی طرح میرے گلے میں اٹکتے مگر میں ان
پتھروں کو نگلتا رہا۔

دوپہر کا سورج بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ ابھی ہمارا آدھا راہ
باقی تھا۔ درختوں کے سائے ہم پر سے اور ہم سایوں میں سے گزرتے
گئے۔ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کیا چیتن سے میں عشق کر رہا
تھا۔ میں نے شہر میں سنا تھا کہ لڑکیاں بہت خوش ہوتی ہیں اگر
ان سے محبت کے بول کہو تو مگر جس ناول میں میں سفر کر رہا تھا۔ اس میں

لڑکی جاہل تھی اور محبت کرنے کے طریقے سے بے خبر۔

میں نے کہا چھتن اگر تم کتابیں پڑھو تو کتنی سی باتیں تمھیں پتہ چل جائیں مگر چھتن نے میری بات کا جواب گھوڑی سے نیچے اتر کر دیا۔ دور دور پر کا سبزہ جلا ہوا تھا جیسے ہریالی کو کسی نے آگ میں ڈبو کر نکالا ہو۔ سامنے میں بھی آگ سی تھی۔ پاؤں میں بھی گرمی تھی۔ ہر شے تپ رہی تھی۔ ابھی تین چار کوس راہ باقی تھی۔ نہر کے کنارے اونچے نیچے راہ پر کبھی گھوڑیوں کے پاؤں ڈول جاتے اور ہم گرتے گرتے بچتے۔

میں نے گھوڑیاں اس کرشے کے پیچھا شے باندھ دیں جو راہ سے ذرا دور بہت کرتا ہوا تھا۔ اور پتہ نہیں کیوں اب اس میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ میں دماغ پر زور دیتا ہوں پر مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اور چھتن نے تب کیا باتیں کی تھیں۔ مگر اتنا یاد ہے چھتن باتیں کرتے کرتے چیخ پڑی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس کے آنسوؤں کا رنگ ان کتروں جیسا ہے جن کو وہ جانے کیوں اکٹھا کرتی رہتی تھی۔ شاید اسے مجھ سے محبت تھی۔ شاید ان آنسوؤں میں خون تھا۔ پھر ایک دم وہ اٹھی اور کہنے لگی: بے گرمی لگتی ہے میں نہالوں اور اس سے پہلے کہ میں اٹھتا وہ بھاگ کر کھیتوں کی شذریا پھلانگتی ہوئی نہر کے کنارے تھی۔ میں نے کہا چھتن میں آتا ہوں۔ صبر کرو۔ اس نے کپڑے اتارتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور نہر میں کود گئی۔

کئی دنوں بعد جہاں سڑکیں ملتی ہیں ایک ڈھانچہ ملا۔ مگر اس پر کپڑے
تھے۔ پھر ہم سب نے کرتار کو سمجھایا "واہگرو جی کا جیسا نصیب بنا تھا"
پر اور بہت سی باتوں کی طرح مجھے پتہ نہیں چلتا۔ چیتن کا مجھے کچھ
پتہ نہیں چلتا۔ ہر انسان دوسرے کے لیے ایک اندھیرا ہے۔

کیا ہو اگر وہ باتیں مجھے یاد آجائیں وہ آخری باتیں جو راہ سے دور
ہٹتے ہوئے اس کوٹھے میں میں نے اور چیتن نے کی تھیں۔ مگر ان دنوں
کی طرح آج بھی دماغ میں یادیں اور آوازیں رنگ اور کترنیں لہریوں
کی طرح ایک دوسرے میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس الجھے ہوئے تانے
بانے میں سے میں ایک تاگا کیسے نکالوں — "سادھو سن کا مان بتا گرو"

سونے کا ذرّہ

بارش کی بڑی بڑی بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر آ کر گرتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی باہر کھڑا ہے جسے تھوڑی دیر کے بعد مجھے بلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں چونک پڑتا ہوں اور گزری گھڑیوں سے بچھڑے مدتوں پہلے بند ہوئے دروازے چپکے چپکے کھلتے ہیں۔ کیوں بلقیس کیا تم اب تک یہاں کھڑی ہو؟

یہ سایے سے میری آنکھوں کے سامنے کیوں گزر رہے ہیں۔ رات خاموش ہے اور منّا ابھی سویا ہے۔ پتہ نہیں صبح کب ہوگی۔ وقت یوں کیوں بیتتا ہے جیسے گھسٹ رہا ہو۔ بھکاری کی طرح دامن پھیلائے سڑک کے کنارے چلتے ہوئے وہ مجھ سے کیا مانگتا ہے۔ میں تو پہلے ہی تہی داماں ہوں۔ میرے دل میں ایک یاد نہیں یاد کا سایہ نہیں۔ تپتی دھوپ ہے تپش ہے اور ٹھہرنے کو ایک مقام نہیں ہے یا کسی نے میرے دل کے اندر رکنا چاہا ہے۔ میں نے اسے باہر دھکیل

دیا ہے۔ بلقیس بانو جو شے میرے پاس نہیں ہے تمہیں کہاں سے دوں۔ میں مجبور ہوں بلقیس بانو۔ تم ماضی کے ایوانوں میں اکیلی کب تک گھومتی رہو گی۔ اس بند دروازے سے لگ کر کب تک کھڑی رہو گی۔ مگر کھڑکی کے شیشوں پر بارش کی بوندیں آن کر گلتی ہی جاتی ہیں۔ کون مسلسل وقفوں کے بعد ترک گریہ کو اڑ دھڑ دھڑا رہا ہے۔ میرے دل کے بند دروازے کے باہر یہ کون ہے؟

پھر صبح ہو گی تو منا جاگے گا، اور سب سے پہلے بھاگ کر میری طرف آئے گا۔ اپنی نیند کے بعد شفاف آنکھوں کو میری طرف اٹھا کر کہے گا، "چچا جان کہانی سنائیں وہی جس میں ایک پری ہوتی ہے اور ٹرک کے ساتھ پانی کے نیچے چلی جاتی ہے۔"

"مجھے تو وہی کہانی نہیں آتی منے، جس میں ٹرک پانی کے نیچے چلا جائے۔"

"آتی ہے، آتی ہے۔" وہ اپنے پھولوں کی پنکھڑی کے سے ہاتھ سے میرے زمانے کے بوجھ تلے جھکے کندھے کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہے گا، سنائیں۔"

"نہیں منے روز تو تم مجھ سے کہانی سنتے ہو، آج تم سناؤ۔" اور اسے اپنے سرد دل کے ساتھ لگا کر کہوں گا۔ "مجھے تو آتی بھی نہیں کوئی

کہانی ابس ایک آتی ہے۔ وہ جھک کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہے گا۔ جو تمہیں سے سارا وقت پیار کی بھیک مانگتی ہیں جب سارے سہارے چھوٹ گئے ہیں تو میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا ہے تمہارے دل میں کوئی سایہ نہیں۔ وہ مجھے ٹھکراتا نہیں اور چند برس بعد اوروں کی طرح میرے دل کی راہ گزر پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ کر کبھی دوسرے راستے سے خوشی، زندگی اور پیار کی کہانیوں کی طرف لوٹ نہیں جائے گا۔ میں جو ابھی چالیس کی حدوں کو بھی نہیں چھو پایا، میں ایک راہ گزر کیوں بن گیا ہوں؟

تمہیں تو ایک ہی کہانی آتی ہے۔ ایک بطخ کا بچہ ہوتا ہے اس کی ماں کہیں چلی جاتی ہے۔ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ مر جاتا ہے۔ اکیلے رہ جانے سے مر جانے تک کا راستہ کتنا مختصر ہے۔ تمہارے نزدیک یہ فاصلہ کچھ بھی نہیں۔ پر یقین جانو پیار نے مدتوں کے بند زنگ آلود دروازوں کو کھول کر یہ تم کیوں آتی ہو؟ میرے دل کے کواڑوں کو مت دھڑ دھڑاؤ۔ جب یہ دروازے کھل گئے تو تم مجھے اور اسما کو اندھیری راتوں میں آنکھ مچولی کھیلتے بھی دیکھ لو گی۔ اور تمہیں دکھ ہو گا۔ تم غلط کہتی ہو کہ تم دوسری عورتوں سے الگ ہو، بلند ہو، عظیم ہو۔ عورت نہ بلندی ہے نہ عظمت۔ عورت تو بس ایک نور ہے جس سے آنکھیں

چند ہو جاتی ہیں۔ عورت تو روشنی ہے جو اندھیری راتوں کو یادوں
کے دئیوں میں جلتی ہے۔ عورت ایک خوشبو ہے جسے پکڑنے کی ناکام
کوشش میں نے اسما خانم ہی کی تھی۔

تم چونک کر پوچھتی ہو کون اسما خانم؟ اور کیا تم نے اسما کا نام سنتے
ہی تمہارا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ ہر عورت یہ کیوں چاہتی ہے کہ وہی
مرد کی زندگی میں پہلا اور آخری نور ہو، جس کے بعد دیے بجھ جائیں
ستارہ دانی میں روشنی نہ رہے۔ پتہ نہیں اسما کو میں نے چاہا بھی تھا کہ نہیں
یا یہ دل کے حاشیوں کی جلن تھی، جو آخر کیا تھا۔ جب میں اور اسما اور بھیا
ساتھ کھیلتے تھے تو وہ سدا میری ساتھی تھی۔ ہم نے پریوں کی کہانیاں
اکٹھے پڑھی ہیں۔ شہزادیوں کی مصیبتوں پر مل کر آنسو بہائے ہیں۔ گرمیوں
کے تاروں بھرے آسمان کے نیچے خوش گوار ہوا میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے
میں نے اسے کبھی پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم دونوں سدا ایک
دوسرے کو بچاتے، وہ روتی تو میں ہی اسے چپ کراتا۔ جب بھیا
دوسرے شہر چلے گئے تو ہم ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ یہ
نہیں کہ اسے دیکھے بنا مجھے چین نہیں آتا تھا، پر ہم دونوں اکٹھے رہتے
بلقیس بانو! اگر بچپن کی یادیں وصل میں ڈھل سکتی ہیں تو میں اسما خانم کو
بھلا دوں گا، پتہ نہیں وہ دن جب یاد آتے ہیں تو میرا دل یوں بیٹھے سی

بنچے کیوں بیٹھنے لگتا ہے۔ جیسے سمندر کی تہہ میں اُتر کر اپنے پیارے ساتھیوں کے ساتھ ناچے گا؟ جب میں گھر سے دُور شہر کے بورڈنگ اسکول میں چلا گیا تو بھیا بسی بڑے امتحان سے فارغ ہو کر گھر آ گئے تھے، اسما رنگ برنگ کی چنریاں اوڑھتی اور ان سے بہت ادب سے بولتی تھی۔ مجھے اس کے اس بھروپ پر ہنسی آیا کرتی تھی۔ ہم دونوں ابھی تک بچپن کے ساتھی تھے۔

"کیا کہا، کہانی بھی تو عام کہانیوں جیسی ہے۔" نہیں بلقیس بانو یہ کہانی عام نہیں۔ یہ کہانی میری ہے۔ مُنّے کی کہانی کی طرح جس میں ایک بچہ اکیلا رہ جاتا ہے، اور پھر مرجاتا ہے۔ میں بھی اکیلا رہ گیا، بھیا ہوشیار تھے، مجھ سے بڑے تھے اور عورت کے دل کو ہاتھ میں لانے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ پر یہ کوئی مجھے سمجھا نہیں سکا۔ بلقیس بانو کہ اسما کیسے بدل گئی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں! ہم نے کبھی ایک دوسرے سے وعدے نہیں کیے تھے، ساری عمر نبھانے کی باتیں نہیں کی تھیں، پر میری زندگی اس کے بنا سونی ہو گئی۔ میرا دل آج تک ویران ہے۔ صرف اسما کے قدموں کے نشان ہیں۔ جو اس راہ گزر کے ایک طرف ایک امانت کی طرح میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ کیا کہتی ہو بلقیس بانو! ایک بول، ایک نگاہ، ایک لفظ، کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

تم کہہ رہی ہو میں جذباتی ہو گیا ہوں۔ میں نے تمہاری محبت کی قدر نہیں کی۔ میں مجبور تھا بلقیس بانو، جو کچھ بھی دل میں تھا۔ میں نے شادی کے تحفے کے طور پر اسما کے قدموں میں رکھ دیا۔ میں نے اسے کیا دیا تھا آج تو یاد نہیں پڑتا۔ جب باہر بارش ہو رہی ہو اور تیز ہوا درختوں میں روتی چلاتی پھرتی ہو تو تم اندر کیوں نہیں آجاتیں۔ کھڑکی کے باہر کھڑی تم ان پھولوں میں ایک پھول لگتی ہو جو ڈرا سہا ہوا ہو۔ پھول جس کی پتیوں پر بارش کی بوندیں ٹپک رہی ہوں۔

جب اسی کے دروازے کھل ہی گئے ہیں تو بھلا تم خود کیوں اندر نہیں چلی آتیں۔ میری ماں کے سامنے خواب ٹوٹ گئے اور میرے دل کی راہ گزر پہ بکھر گئے۔ اسی لیے تو کوئی بھی یہاں سے نہیں گزرتا۔ یہ کرچیں اتنی باریک ہیں کہ ایک بار چبھ جائیں تو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ پر نکالنے کی کوشش کرو تو اور بھی گہری چلی جاتی ہیں۔ بلقیس بانو کیا تم اس نوک کو ابھی تک اپنے دل کے کونے پر محسوس نہیں کر سکتیں۔

ماں ان دنوں کتنی اداس رہا کرتی تھی۔ اسے میری زندگی کی ناکامی کا افسوس تھا پتہ نہیں وہ بھی میری طرح اسما پہ صرف میرا حق سمجھتی تھی۔ ماں بہت بھولی تھی اور بڑی دکھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ

عورت ہوا اور خوشبو کی طرح بھلا کسی ایک کے ساتھ اپنا رشتہ تو
نہیں باندھ سکتی نا اور پھر خواب کون سے سچے ہوتے ہیں۔ خوابوں
کی تعبیریں ہمیشہ الٹی ہوتی ہیں۔ میں نے اور ماں نے جو خواب مل کر
دیکھے تھے وہ غلط نکلے۔ اور میں نے ٹوٹے ہوئے اپنے دل کی تختی
پر وہ تصویریں مٹا دیں جن کے رنگ کچے تھے اور جو حاشیے سے لے
کر سارے کاغذ کی لمبائی پر پھیلی ہوئی تھیں۔

تب یورپ سے آنے کے بعد پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تھا۔
تمہاری شوخی جو اب بجھے ہوئے انگارے کی طرح روشنی کا ذرا سا
نشان چھوڑ کر مٹ چکی ہے، ان دنوں آتش ان میں لپکتے شعلے کی طرح
تھی اور پھر وہ میرے دامن سے آ لگی۔ تمہاری نگاہیں جو ہر وقت میرا
تعاقب کیا کرتی تھیں۔ تمہارے خیال جو کسی وقت بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے
تھے، ہسپتال کے پلنگ پر لیٹے لیٹے میں نے اپنے اکیلے دل کا سہارا
تم میں ڈھونڈا۔ مجھے سہارے کی تلاش تھی، صرف سہارے کی۔ ان
دنوں میرا کوئی گھر نہیں تھا اور جہاز سے اتر کر میں اپنے ڈھیروں سامان
کے پاس ٹیکسی والوں کی باتوں کے شور میں سوچ رہا تھا کہ میں کہاں
جا سکتا ہوں، وہ سارے جن کو میری ضرورت تھی، جنہیں میری محبت کی
ضرورت تھی گنج کلیسا کے دوسری طرف انگاروں سے دہکتی زمین پر بھسم ہو چکے

تھے۔ میرے دل میں صورتیں محفوظ تھیں، نام نہ تھے۔ جس دوست کا
خط میں لایا تھا وہاں جانے پر تم مجھے ملی تھیں۔ تم نے مجھے سہارا دیا ہے۔
ہم دونوں سمندر کے کنارے خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ تمہارے
قریب ہونے سے میرا دل کافی شاد تھا۔ تمہاری نگاہوں سے نکلتی روشنی
میں مجھے اپنی بچھڑی بہنوں اور ماں کی نگاہوں کی ٹھنڈک محسوس ہوا کرتی
میں نے کبھی تمہیں اس سے زیادہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ ان
دنوں بھی آج کی طرح میرا دل اجاڑ تھا۔ ان جنگلے ویرانوں میں بہار
کے پھول اُگتے تو کیسے؟

بلقیس بانو! میں تو تمہارے بھائی کا دوست اور تمہارا مہمان تھا۔
اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے اگر تم نے اندھیری راتوں اور تیر کی طرح
جسم میں لگنے والی ٹھنڈی ہواؤں میں میرے کمرے کے باہر دعائیں کی
ہیں۔ میں خود سے تندرست ہونے کی کوشش کیوں کرتا۔ میرے
لیے اس دنیا میں کیا تھا؟ مگر تمہاری نگاہیں مجھے ان سب کی یاد دلایا
کرتی تھیں جو اب موت کی وادی سے اس طرف مجھے پھر کبھی نہ مل
سکیں گے۔

ٹھیک کہتی ہو، ایک طرح سے تو تم نے مجھے بچا لیا ہے۔ پر کیا ہی
اچھا ہوتا اگر تم مجھے ان دنوں سہارا نہ دیتیں۔ عورت صرف سہارا دے

سکتی ہے محبت نہیں۔ عورت کو خود بھی شاید سہارے کی ضرورت ہوتی ہے
مگر مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں غلط باتیں کہہ رہا ہوں تو تم مجھے معاف کر دو،
بلقیس اس ٹھنڈی اور اندھیری رات کے بعد جب تم نے روشنی میں بھی
میرا سہارا چاہا تو مجھے بتاؤ میں انکار نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس رات تو مجھے
معلوم ہوا تھا کہ میں تمہاری صورت میں اپنی بہنوں کی نہیں اسما کی صورت
کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ تمہاری ہنسی میں مجھے اس کی ہنسی کی آہٹ سنائی
دیا کرتی تھی۔ اسما میری کوئی نہ تھی اور اسی لیے اپنے آپ سے پیچھا چھڑانے
کے لیے میں نے تمہیں بھی پرے دھکیل دیا۔ میں تمہارے ہاں سے چلا آیا۔
میں مہینوں چھوٹے شہروں، گندے ہوٹلوں اور عام آدمیوں میں بیٹھ کر اپنے
آپ کو پرے دھکیلتا رہا۔ جو ہوا مجھے اس کا افسوس تھا میں اپنے کو سزا
دے رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو گم کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔

ایک دن کہیں سے پھرتے پھراتے بھیا مل گئے۔ اسما کو ان کے
ساتھ دیکھ کر بھی میں پہچان نہ سکا۔ اس کی صورت پر پہلے سے زیادہ نرمی
آسودگی تھی اور اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر جب وہ میری طرف دیکھتی
تو میرے لیے بھی وہاں وہی پیار ہوتا۔ زمین کی طرح اس نے اپنی آغوش
کھول کر مجھے بھی اپنے پھولوں میں جگہ دے دی۔ کیا میں وہ جگہ پا کر خوش
ہوں، اور اب تک میں یہ جان نہیں سکا، سمجھ نہیں سکا بلقیس بانو کہ

عورت جب ماں بنتی ہے تو اتنی بلند کیوں ہو جاتی ہے، اتنی اونچی اور مقدس کہ تم ان بلندیوں کے سایے میں بیٹھ کر سکون حاصل کر سکو، اپنے دکھ، درد بھلا سکو۔

بہت دنوں بعد تمھارا خط آیا، نہ جانے کس طرح تم نے میرا کھوج نکال لیا تھا اور لکھا تھا:

"جب تم گئے ہو تو میں بالکل ہی اکیلی تھی۔ مجھے کوئی کام نہ تھا۔ ہوا میں خوشبو سے بھرے جھونکے میرے گرد تیرتے تھے اور چڑیوں پہ پتے اچانک بے قرار ہو کر جاگ اٹھتے تھے۔ میں نے بادلوں بھرے آسمان کو دیکھا جس پر سفید گھٹنے تم کو رک کر تمھیں جاتا دیکھتے رہتے تھے اور ہوا کی ہلکی سی جنبش سے میرے کھلے بال پریشان ہو رہے تھے، میں نے جھک کر تمھیں دیکھا۔ مگر وہ لمبی اور چمکتی سڑک تمھارے جانے کے بعد آہیں بھرتی رہی اور بادلوں کا دل کتنی دیر تک بیٹا رہا، اور تمھارے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ چاہت کے ان کہے بول میں جادو ہے، ساری دنیا ویسی ہی ہے۔ گرد و غبار اور خوشبو سے بھری ہوئی

پر میرے لیے اس میں کچھ نہیں اور اب یہ چاہت
ایک بے کس، بے پناہ وجود کی طرح مجھ سے باہر
چکر لگا رہی ہے۔ اس کے لیے سارے دروازے
بند ہو چکے ہیں اور زمانے کی دن رات کھلی نگاہوں
کے سامنے اس کا عریاں وجود میرے لیے کسی
خوشی کا باعث تو نہیں؟

میں تمہیں کیسے سمجھاؤں طلقیس بانو کہ اس خط کے بعد میرے لیے
کہیں قرار نہیں رہا۔ تم تو ایک دوپہر کو اپنی باکھولی میں اکیلی تھیں، پر یہ
اکیلا پن، یہ سونا پن میرا مقدر ہے۔

آج جب سایوں کا میلہ سا لگ رہا ہے اور بارش کی دھند میں تم
پرانے دنوں کی طرح میری کھڑکی کے باہر کھڑی ہو، مجھے بتاؤ میں اسما
خانم کو کیسے سمجھا دوں۔ منے کی ماں اسما کو نہیں۔ اپنے خوابوں کی اس اسما
کو جس کے ساتھ میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ جس کی یاد کو میں نعمت سی
سمجھ کر اپنے بورڈنگ سکول میں لایا تھا۔ آج رخصتی ہوئی ایک میں جب
نیند بھی نہیں آتی، میں منے کی کہانی کے لڑکے کی طرح اکیلا ہوں مگر اکیلے
رہ جانے سے مر جانے تک کا مختصر راستہ اتنی لمبی رات میں سے
ہو کر کہیں گزرتا ہے جس کی سحر کبھی نہیں ہوتی۔

اسما خانم! کاش تم میرے قریب ہوتیں اور میں اس بڑھتی تاریکی میں
تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تمھارے لمس کو اپنی تنہائی کے ساتھ محسوس
کر سکتا۔ کاش تم آ سکتیں اسما۔ آج گزرے برسوں کے سفر کی تھکاوٹ میرے
انگ انگ میں دیمک بن کر سما گئی ہے اور دو علاحدہ زندگیوں میں ایک
یاد کا سایہ اس گزری ہوئی سڑک پر چل رہا ہے۔ تم کہاں ہو اسما؟ جانتی ہو؟
تم کہاں ہو؟ میں نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا۔ زندگی روح بھی ہے اور
جسم بھی۔ اگر تم اور میں ساتھ ساتھ چلتے تو دونوں کی نجات ہو جاتی۔
تمھارے ہاتھ کے لمس کے لیے، تمھارے جسم کی اس پاگل کر دینے
والی خوشبو کے لیے، تمھاری سیاہ آنکھوں سے نکلتی ہوئی روشنی کے لیے یہ
انسان کتنا بے چین ہے۔ میں تمھیں چاہتا ہوں، یقین مانو۔

کھڑکی کے سامنے کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو میرے کمرے کی کھڑکی
نہیں دھڑ دھڑاتا۔ ہوا آم کے درختوں میں رو رہی ہے اور کوئل کی
کوک محبت کے زیر و بم کی طرح دور ہٹتی اور قریب آتی جاتی ہے۔
صبح منا آئے گا تو پھر کہانی کے لیے ضد کرے گا۔ اسے کیا معلوم
اس کا چچا خود ایک ایسی کہانی ہے جس کو کہنے کے لیے لفظ نہیں ہیں۔
اسے کیا پتہ کتنی کہانیاں ایسی بھی ہیں جو سنائی نہیں جا سکتیں۔ مجھے کی
محبت تو سونے کا ذرہ ہے جس کو میں نے زمانے کی ساری ریت

چھان کر وقت کے گزرتے دھارے سے نکالا ہے۔ پر مجھے کو احساس
معلوم ہے کہ یہ انمول ذرہ کتنا قیمتی ہے جب اس کی معصوم محبت کو
اس کی آنکھوں سے جھانکتے دیکھتا ہوں تو اپنا دامن پھیلا لیتا ہوں جب
بادل چھٹیں گے تارے چھپیں گے اور رنگوں بھرا سورج افق سے
سر نکالے گا اور پھر مٹتا جائے گا اور پھر ان گنت کہانیوں میں صرف
ایک کہانی باقی رہ جائے گی۔ مجھے کیسے بتاؤں کہ اکیلے رہ جانے سے
مر جانے تک کا فاصلہ بہت ہی طویل ہے اور اس راستے پر صرف
ایک نشان ہے۔ اس سونے کے ذرے کی روشنی کا نشان جو میں
نے وقت کے دھارے کی ریت چھان کر نکالا ہے پر پھر بھی وہ میرا نہیں
اور کبھی بھی اپنا نہیں، پھر بھی میرا کچھ بھی نہیں۔

دو خط

شمس منزل
نُور پور — جموں

عطیہ!
میری بڑی بیٹی گینی کی شادی ہوئی تو اتفاقاً پرانے کاغذات میں کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے تمھارے خط بھی مل گئے۔ اور بیس سال کے بعد اسی عزم و ہمت اور استقلال کی تصویر نگاہوں میں گھوم گئی جسے سب عطیہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ آج سے چھ سال پہلے کسی تپا نے ہم جماعت سے جسے تمہاری ذات میں بہت زیادہ دلچسپی تھی سُنا تھا کہ تم راول پنڈی میں ہو۔ بس اسی سہارے خط لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے بالوں کی سیاہی میں اب سفیدی گھل گئی ہے۔ میں نے زندگی کے نشیب و فراز سے کیا سیکھا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا پر وقت گزر گیا ہے۔ گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارا اُس سے کچھ سیکھنا یا نہ سیکھنا کتنا بے معنی لگتا ہے۔ مگر

جو میں پُوچھنے چلا تھا وہ تو بھول ہی گیا۔ کیا اب تک تم عورت کو ماتھے کی بندیا اور مانگ کا سیندور بنانے کے ساتھ ساتھ اُسے اُن سب بندھنوں سے اُونچا اُٹھانا چاہتی ہو یا تم نے اپنی نجات کی راہیں تعیّن کر لی ہیں؟ تم تو کہا کرتی تھیں تم کسی روشن مسند رہیں جانداروں کے سامنے اپنی آرتی اُتاروں گی۔ کیا اب تک پُوجا کا تھال لیے گھوم رہی ہو۔ یا کسی دیوتا کے چرنوں کی اشیرباد سے تمھارا دل روشن ہو گیا ہے؟ عطیہ پُرانا ساتھی ہونے کے ناتے مجھے ان سب سوالوں کے جواب پانے کا حق ہے۔ زندگی کی دوڑ میں اوّل تو اتنا وقت نہیں تھا کہ انسان تھم کر رک کر پیچھے دیکھے پر جب پیچھے دیکھو تو ماضی کے خلاء میں صرف بہت پیاری اور عزیز صورتیں ہی دھندلی نظر آتی ہیں اور پھر بالوں میں کھلی سفیدی کے باوجود دل اُسی گرمی اور پیار سے دھڑکتا ہے جس کو محسوس کر کے جوانی میں نبضیں تیز ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ اور زیادہ لکھوں میں اپنے سوالوں کا جواب چاہتا ہوں۔

تمھارا بھولا بسرا ساتھی

ریاض شمس

ساوتری بھون
مری روڈ — راول پنڈی

ریاض

تمہارا اور اپنا بوڑھا ہو جانا — دونوں باتوں کو یاد کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ تمہاری آواز سے، تمہارے چلنے کے انداز سے، تمہاری نگاہوں سے ہر شے سے تو زندگی پکارا کرتی تھی۔ تم تو زندگی کا مجسمہ تھے یقین کرنا مجھے بڑا دکھ ہوا یہ جان کر کہ تم ایک ایسی عمارت کی طرح ہو گئے ہو جہاں وقت نے ان جانے ان دیکھے ہی اپنا تسلط جما لیا ہے حالاں کہ آج سے بیس سال پہلے میں سمجھتی تھی وقت تم سے شکست کھا جائے گا۔ تمہارے قہقہوں میں کتنا جوش اور ولولہ ہوا کرتا تھا۔ سب مجھے تمہارے گرد ہی ہنسی سب سے زیادہ بھاتی تھی جیسے پھول کے گرد اس کی ان دیکھی خوشبو کا ایک ہالہ سا رہتا ہے — ٹھیک ہی تو کہتے ہو وقت گزر جاتا ہے۔ پر نہ جانے کیوں ریاض سب کے لیے وقت گزر کر ایک اندھیری اماوس کی رات کیوں ہو گیا ہے؟ نہ جانے کیوں! سنسان ہولناک ویرانے میں مندر کے باہر آرتی کا تھال لیے بیٹھی میں نے کتنی پار تمہاری منتیں کر دوار کھلیں۔ کتنے زمانے گزر گئے اور پھر جب تیز آندھی کے تھپیڑوں سے مندر کا دوار کھلا اور میں نے ڈرتے ڈرتے

اندر قدم رکھا تو وہاں بھی اندھیرا تھا۔ جو امرتی کے خالی آسن پر رو رہی تھی۔ تب سے آج تک تھال اٹھائے اٹھائے میرے ہاتھ دکھ گئے ہیں مگر کوئی نہیں بتاتا کہ میں آرتی کہاں اتاروں اور اب تو مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دیوتاؤں کے پاؤں مٹی کے ہیں۔ کیلاش پربت پر کوئی نہیں رہتا اور اس سے پرے بھی خلا ہے۔ اس خلا کا احساس اور اس تھکن کی بے چارگی کا احساس ہی تو زندگی کا المیہ ہے۔ اس المیہ سے گھبرا کر انسان کبھی کبھار کسی دوسرے کے سہارے کی سوچا کرتا ہے۔ مگر جہاں اور بہت سی حسرتوں سے سینہ آباد ہے۔ وہاں ایک کی زیادتی یا کمی سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ پر ریاض تم مجھے آج سے بیس سال پہلے جانتے تھے۔ نئے لوگوں سے کچھ کہتے ہیں بہت گھبراتی ہوں۔ تم اگر میری بات سمجھو گے نہیں تو کم از کم چہرے کو ایک سوالیہ نشان تو نہیں بنالو گے نا جیسا میرے گرد یہ سب لوگ بنائے رہتے ہیں —— دنیا کو سنوارنے کی راہیں ایسی آسان نہ تھیں اور مجھ سے بہتر تو تم جانتے ہو کہ کبھی کبھار مشکلات میں جی الجھ جاتا ہے تو انسان کہتا ہے ”ہٹاؤ“ ”مارو گولی“ اس سارے خواب اور فلسفے اور نظریے کو بیڑا اپنا آپ بھی تو ہے اور میں بتاؤں جب میں نے یہ فیصلہ کیا تو وقت گزر چکا تھا۔ اور وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ ریاض وقت کبھی واپس نہیں آتا اور جو عورت بہت

استقلال اور بڑے عزم سے بڑھتی ہے کہ راستے سے بند یا اور آگ سے
بینڈ ور فوج کہ اُن میں ستارے سے بھرے گی شکست کی جاتی ہے ۔ میں
آج سے بیس سال پہلے کی عظیم عزم و استقلال کی تصویر جب تخیل میں سے یہ خود
نکل رہی ہوں تو میری آنکھوں میں نہیں میرے دل میں آنسو ہیں اور میرے
گرد پھیلا ہوا وہ ہولناک سناٹا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جس کو باہر کی گزشتہ
آوازیں مل کر بھی توڑ نہیں سکتیں۔ میری اس تنہائی کا کوئی ساتھی نہیں صرف
ایک عورت ہے جو پچھلے برسوں میں کبھی کبھار آتی تھی پر اب رات دن
میرا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ آج سے دس سال پہلے میں اس کے چہرے کی
طرف دیکھنے کو بھی تیار نہ تھی پر اب وہ حکم دیتی ہے میں مانتی ہوں میں
اس کی غلام بن گئی ہوں دراصل۔ جب خشک پتے بڑی بے چارگی سے ہر
چاروں طرف اُڑتے ہیں بگولے چلتے ہیں اور درختوں کی ننگی شاخوں پر
دھیرے دھیرے ختم رکھتی خزاں گیت گاتی ہے تو وہ رونے لگتی
ہے۔ اس کا حلق خشک سسکیوں سے گونجنے لگتا ہے۔ سفید ہوتے
بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی خلا میں تکتی وہ چپ چاپ بیٹھی آنسو بہاتی ہے
نہ جانے اس کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہیں۔ کیسی کیسی حسرتیں ہیں؟
میں کیا جانوں؟ پر اس کے ہوتے میں انجان بن کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اُن
ویران آنکھوں میں مجھے جھانکنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی کبھار وہ مجھے کہتی ہے

عطیہ بانو میرے پائل میں کتنے گیت تھے جو تمھاری وجہ سے مر گئے میری مانگ تمھاری وجہ سے اجڑ رہی ہے۔ میرے گلے میں کتنے بول بند کے بند ہی رہے تمھارے جرم پر لعنت ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے جو تم نے گزاری۔ کیا تم کو یہ وقت دوبارہ ملے گا کیا میں پھر سے بیتی زندگی واپس بلا سکتی ہوں۔ پھر میرے قریب بیٹھی یہ عورت واویلا کرنے، رونے اور سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ کبھی پہروں گھٹنوں میں سر دیے یوں بیٹھی رہتی ہے گویا مر گئی ہو۔ مگر اب تنہائی میں مجھے اس کی رفاقت بھی عزیز لگنے لگی ہے۔ میں جھنجھوڑ کر اسے جگا دیتی ہوں۔ اور یوں ان خشک بالوں ویران آنکھوں اور اجڑی صورت والی عورت کے ساتھ یہ دن گزر رہے ہیں۔

کوئی اور ہوتا تو میں کبھی اعترافِ شکست نہ کرتی مگر یہ تم ہو جس سے میں نے محبت نہیں کی مگر جس کی میں ہمیشہ عزت کرتی رہی ہوں۔ سچ لانا ریاض تمھیں اتنے برسوں کے بعد یہ جان کر دکھ تو نہیں ہوگا کہ میں نے تمھیں کبھی نہیں چاہا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ بس تم مجھے اتنے اچھے لگتے تھے کہ میں تمھاری جگہ دوسروں سے الگ رکھوں۔ تمھاری بے پناہ ہنسی اور زندگی سے بھرپور قہقہے۔ تمھاری اس ہنسی نے ہی تو مجھے زندگی کے اس ان دیکھے ہاتھ پر یقین کرنے پر مجبور کیا تھا جو بنانے بگاڑنے سنوارنے میں بس ایک اشارہ کرتا ہے۔ تسلیم بھی کیا کیا کرشمہ ساز یاں

کرتی ہے؟ تمھیں شکنی اور ساوتری اور سیتا تینوں بہنیں تو یاد ہوں گی جنھیں تم موٹر میں پہنچانے جایا کرتے تھے۔ تینوں کتنی خوبصورت تھیں، اونچی ناک جیسی بڑی روشن آنکھیں اور وہ ہنسی جیسے کہیں ہولے ہولے چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ سارے لڑکے تم سے کتنے جلتے تھے مگر تم ایک دن بھی اس بات پر فخریہ انداز سے اکڑ کر نہیں چلے۔ بس تمھاری ایسی ہی باتیں تو مجھے اچھی لگتی تھیں پر جب شکنی کی شادی ہوئی ہے اور ہماری جماعت کے اس گورے سے لڑکے نے بہت کمینگی سے ہنس کر کہا تھا "کیوں یار" اور تم نے اس کے منہ پہ اس زور سے مکا مارا تھا۔ وہ آج کل کیا کئی برس سے میرے گھر کے قریب ہی رہتا ہے مگر میں اسے پہچاننے کی کوشش نہیں کرتی۔ خیر یہ باتیں چھوڑو۔ ساوتری سنا ہے آج کل کالکا میں ہے اور سیتا اوٹاکمنڈ میں۔ وقت کتنا ظالم ہے یہ فاصلے بار پیدا ہو جاتے ہیں تو بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ پر وقت گزر جانے پر بھی جو باتیں ہمیں پیاری تھیں وہ ویسی ہی پیاری رہتی ہیں۔ شکنی کا اماوس کی رات کا گیت مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ دھنی گیت جو وہ آنکھیں بند کر کے ایک الہامی انداز سے گایا کرتی تھی۔

آج ساوتری بھون بارش کی دھند میں اور بھی دبیز اندھیرے میں ڈوب گیا ہے۔ کئی برس سے تو مجھے یوں لگنے لگا ہے جیسے چاند سورج

ستارے ایک ٹھنڈا گہرا مجھ میں اندھیرا پھیل گیا ہے اور میں خدا کی جنت
سے جس میں گرمی، روشنی، خوش چہرے ہوا اور زندگی تھی نیچے پھینک دی
گئی ہوں پر ابھی تک میرے پاؤں کسی تال کو نہیں چھو سکے۔ میں گر رہی
ہوں مسلسل گر رہی ہوں۔ اور نہ جانے کب تک گرتی ہی جاؤں۔ یہاں
تک کہ موت کے سرد آرام دہ پرسکون دھندلکے کو چھو لوں۔ کیوں ریاض
کیا موت کے دھندلکے کے بعد ایک نیا سویرا ہو گا؟

زندگی میں انسان کی تمنائیں کتنی محدود ہوتی ہیں۔ ایک گھر، اچھے ساتھی،
چند ملنے والے اور بس مجھے ہنسی آتی ہے کہ خداوند دنیا میں سے کبھی
مجھے کچھ نہ مل سکا۔ گھر کے نام پہ ساوتری بھون ہے جس کے چار پانچ کمرے
ہیں ہر ایک میں سفید سنگ مرمر کے ٹکڑے پر نہ جانے کتنے لوگوں کے
نام لکھے ہیں۔ اردو میں، ہندی میں، انگریزی میں۔ پیپل کا بڑا سا درخت
ہے جس کے پتے ہر وقت کف افسوس ملتے رہتے اور نہ جانے
کس کا ماتم کیا کرتے تھے۔ ایک الو اس کی گھنی شاخوں میں بیٹھا کبھی کبھی
اس زور سے کراہتا ہے کہ تنہائی کی عادی ہونے کے باوجود میں کانپ
جایا کرتی ہوں۔ سامنے چھوٹی سی بارہ دری ہے جس کے درمیان ایک ابھرا
ہوا ہون کنڈ ہو گا۔ مگر اب اس میں ایک ذلیل سا پودا جھانکتا ہے جس
میں نہ سامگری کی خوشبو ہے اور نہ ہی آگ کے شعلوں کی لپک اور چمک

اس پودے میں نہ پھول آتے ہیں اور نہ ہی خوبصورتی ہے۔ ایک زندگی کی جلن کے بعد جو شے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ شاید اس پودے کی طرح انسان کے چہرے پر اُجاڑ، ملائیت اور تنہائی کی سی بن جایا کرتی ہے۔ بارش کے دنوں میں پیپل پر پرندے چہچہاتے، آتو نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ ہوا کا ریلہ کانپتا، روتا، پتوں اور شاخوں پر سے گزرتا ہے۔ ساونری پھولوں کے سیاہ اور سفید فرش پہ پانی کی لہریں ہوا کے زور سے آتی ہیں۔ اور کروں میں نہ جانے کتنے سپید دان، کتنے بھیم، کتنے ارجن اور کتنے دریودھنوں کی روحیں کانپ اٹھتی ہیں:

زندگی کی تمام تر زیبائش محبت کبھی تھا۔ تو ایک ثانوی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ وقتی اور فنا ہونے والی۔ پھر بھی اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور میں نے سوچا تھا، میں ایک چٹان ہوں جس پہ سردی گرمی بارش طوفان اور آندھی کسی کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ چٹان جو دو دنیاؤں کے سنگم پہ ہے جس کی سرفلک بلندیاں تم کو افق کے اتنا نزدیک کر دیں گی، اتنا نزدیک کہ تم ہاتھ بڑھا کر آکاش کو چھو سکو گے۔ پر زندگی آکاش کو چھونے کی نہیں اپنے سوالوں کے جواب پانے کی کوشش ہے ایک اندھیرے سے کشمکش ہے۔ اُس کرن کی کھوج ہے جو خوشی اور زندگی ہے۔ پر ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہر ایک کو آگ میں سے

گزرنا پڑتا ہے۔ الگ الگ تاکہ جو کھوٹا ہے اور جو کھرا ہے وہ منجا ہو جائے۔
اور مجھے معلوم نہیں ریاض۔ اماوس کی رات کے اس دبیز مخملیں اندھیرے
میں اب مجھے معلوم نہیں کہ میں آگ کی محراب کے پار پہنچ گئی ہوں کہ نہیں؟
کوئی ایسی یاد نہیں کوئی ایسی حسرت نہیں جس کی تڑپ اس مسلسل دھڑکتے
دل سے الگ شمار کر سکوں۔ دوسروں کے لیے راہیں متعین کرتے کرتے
میں خود ہی بھٹک گئی۔ تم مجھے دیکھ کر کہا کرتے تھے "دنیا کی پہلی عورت
کے چہرے پر بھی صحت مندی۔ حسن۔ سادگی مل کر ایک ایسا ہی ملکوتی
سا کیف پیدا کرتی ہوں گی" اور آج دیکھو تو کہو گے۔ "دنیا کی آخری
عورت کے چہرے پر بھی ایسی ہی شکست اور ایسی ہی تنہائی کا کرب اور
ایسا ہی بے بسی کا رونا ہوتا ہوگا۔ شاید بجھے ہوئے آنسوؤں سے اس
کی آنکھیں بھی ایسی ہی چمکیلی مگر نور سے خالی ہوں گی۔
ریاض شاید تم آخری انسان ہو جو اس سارے کرب کو بڑے خاموش
طریقے سے سمجھ سکو گے کیونکہ تم سورج کی کرنوں کی طرح زندہ ہو اور زندگی
پھیلاتے ہو۔ تم افسوس نہ کرنا۔ کہ میں اب افسوس کرنے اور ہمدردی
حاصل کرنے کی منزل سے گزر گئی ہوں۔ میں جو سادتری بھبون میں کھیلی
رہتی۔ اپنے پہلے وجود کا ایک سایہ سا ہوں میرے لیے کوئی کچھ
نہیں کر سکتا۔ یہ مت سوچنا کہ میں خود رحمی میں مبتلا ہوں۔ "خود کردہ را

علاوہ نفرت میں جانتی ہوں میرے لیے نجات کی سب راہیں مسدود ہو چکی ہیں پھر بھی دل کے ویرانے میں خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی نہیں صرف ہوا کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ تم جانتے ہو میں نے دل میں کبھی کسی کو آنے ہی نہیں دیا۔ یہ دروازے میں نے اتنی مضبوطی سے بند کیے تھے کہ جب میں نے ایک زمانے کے بعد ان کو کھولنا چاہا تو ہاتھ زخمی ہو گئے مگر دروازے کھل نہ سکے۔ میں سدا اپنے آپ سے باہر قید رہی ہوں۔ اس قید نے میرے اعضا سے ساری گرمی اور ساری زندگی لے لی ہے۔

سدا کی خود غرض عطیہ آج بھی اپنے متعلق ہی سوچ رہی ہے یہی کہو گے نا۔ تو اب بتاؤ۔ گیتی کیسی ہے کیا اس کی آنکھوں میں زندگی اور نور ہے کیا اس کے گرد بھی قہقہے ایسے ہی تیرتے ہیں جیسے پھول کے گرد خوشبو۔ کیا وہ بھی آنکھیں بند کر کے "اماوس کی رات" گیت ویسے ہی گا سکتی ہے جیسے شگفتی گایا کرتی تھی۔ شگفتی کا یہ گیت تمہیں بہت پسند تھا نا۔ تم تو اُسے "اماوس کی رات" کہا کرتے تھے اور تمہاری بات کیسے پوری ہوئی اس عطیہ کو جسے تم بلند عظیم اور نہ جانے کیا کیا سمجھا کرتے تھے "اماوس کی رات" بننا پڑے۔ گہرے دبیز مخملیں نرم ٹھنڈے موت کے سے آرام دہ پُرسکون اندھیرے میں لپٹی تمہاری۔

عطیہ

لال آندھی

ویر سنگھ بوڑھا ہے تو کیا ہے، تو دس جوانوں پر بھاری ہے۔ ہمارے
گاؤں کی ساری رونق اس کے دم قدم سے ہے۔ آواز میں ایسی گرج
اور ہیبت ہے کہ مرغے کے سامنے ہاتھ رکھ کر کبڈیاں کھیلا کر کسی کو زور سے
پکارے تو پانچ میل تک پکارے چلنے والا اس کو سن لے گا۔ لاٹھی پر
چڑھا کر گھماتا ہے تو دیکھنے والے کی جان پر بن جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ
ہم میں سے کوئی بزدل ہے اور لڑنے سے ڈرتا ہو پر معلوم ہے ہنسی
ہنسی میں بھی اگر کسی نے ویر سنگھ کو کہہ دیا کہ لا پھر دیکھیں تیرا نشانہ
تو وہ سچ مچ اپنی جان گنوا بیٹھے گا۔ اس کے بال سفید ہیں اس کی لمبی داڑھی
سفید ہے اس کی بھنویں سفید ہیں مگر اس کا دل کتنا جوان ہے۔ جب ہم میں
سے کوئی اسے چاچا یا بابا کہنے کی کوشش کرے تو وہ اسے بری طرح
گھورتا ہے: "دیکھو جوان! بابا یا چاچا کہنا ہے تو کسی اور سے بات کرو۔
میں تو بس ویر سنگھ ہوں۔ ذرا ایشرا" پھر اس سے زیادہ اچھا کوئی

نہیں گاتا۔ پھر گورو کی بانیاں، جپ جی کی پوڑیاں، ایسی لہک لہک کر پڑھتا
ہے کہ گوردوارے میں اس کے بنا بات ہی نہیں بنتی۔ گرنتھ صاحب کے
سامنے آنکھیں بند کیے، ہاتھ جوڑے وہ کچھ ایسی درد بھری آواز سے شبد
پڑھتا ہے کہ سب کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مگر پرشاد بانٹنے
کے لیے اسے کہو تو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ منتیں کرو، خوشامدیں کرو،
واسطے دو، قسمیں دو بس سر کو ہلاتا رہے گا، منہ سے کچھ نہ کہے گا۔ شادی
بیاہ میں بھی کبھی نہیں جائے گا۔

کٹائی کے دن تھے۔ گھر سے ہی اداس۔ فصلیں تیار کھڑی تھیں
سنہری سی چمک جیسے کسی مٹیار کے حیا دار چہرے پر گھونگھٹ کی اوٹ
میں ہوتی ہے۔ کھیتوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہم سب اپنی اپنی فصلوں کی
رکھوالی کرنے کھیتوں کے کنارے چھوٹی چھوٹی پھوس کی جھونپڑیاں ڈالے
آن پڑے تھے۔ سارا دن بھی وہاں پر ہی گزرتا۔ ہم تین بھائی تھے۔ باری
باری سے آتے اور گھر چلے جاتے۔ مگر بشیرا اکیلا تھا۔ اس کے بھتیجے
اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بھائی مر چکے تھے۔ اس کا اپنا
کوئی بال بچہ نہ تھا اور اسی لیے وہ تنہا ہی اپنے کھیتوں کی رکھوالی کرتا تھا۔
اگر وہ اپنے کاموں میں بھی کسی کی مدد قبول کرنے کی بات آرام سے سن
سکتا تو شاید میں اسے مدد کرتا مگر یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

کسی نے کبھی کہا "لا ویشرے تیرا کام کر دیں" تو وہ کہتا "کیوں، اب میں بڑھا ہوگیا ہوں۔ میرے بازوؤں میں طاقت نہیں رہی کیا؟" پھر کھدر کے کھلے کرتے کی لمبی آستینیں اوپر چڑھا کر وہ اپنی باہیں دکھاتا جن میں مچھلیاں پڑ رہی ہوتیں اور اس لیے میں نے کبھی اسے اپنی مدد کی بات نہیں کہی۔

مگر کہانی کے جس دن کی بات کر رہا ہوں وہ دن بڑا ہی اداس تھا۔ اداس اور ڈراؤنا۔ آسمان پر سیاہ بادل نہ تھے۔ میلا گدلا غبار بھی نہ تھا۔ بس سفید بادل تھے، چھچھرے سفید جیسے تیتر کے پر۔ سورج کبھی ایک ٹکڑے میں گرتا اور کبھی دوسرے میں۔ اس کی روشنی اُلجھی اُلجھی سی تھی۔ کھیتوں کے کنارے اُگے درختوں سے جھونکے یوں گزر رہے تھے جیسے کوئی عورت بین نہ کر سکے اور چپکے چپکے آنسو بہاتی جائے۔ ایسے دن ہوتے ہیں جب کسی گزرتی برات کے باجوں کی آواز سن کر دل پانی میں ڈوبتی کشتی کی طرح ہوئے ہوئے خوش ہوکر جو ہیں تیرا چاہتا ہے پر تیر نہیں سکتا۔ اور ایک بوجھ کی طرح اور نیچے اور نیچے ان جانی زمینوں اور پاتال کی طرف کھنچتا ہے گانے کی کوشش کرو تو آواز نہیں نکلتی زور سے کسی کو للکارو۔ کسی کتے کو غلیل کھینچ کر پتھر مارو تو الٹا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے اور کسی کو لکڑی لگے بنا ہی رہ جاتی ہے۔ ہوا جب سراں سراں باجرے کے سنہرے سٹوں اور کھیتوں میں آدھے ڈوبے درختو

کے پتوں کو چھو کر گزرتی ہے۔ تو جی چاہتا ہے کاش نہ ہوتا جسم نہ ہوتے یہ
دنیا نہ ہوتی۔ دنیا کے دھندے نہ ہوتے۔ ایسی ان چاہی خواہشیں جی کو
گھیر لیتی ہیں جیسے ان کے پورے ہونے یا نہ ہونے پر ہی دم نکل جائے گا۔ اور
پھر ایسے دن چانن سنگھ کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ چانن ہمارا تو کچھ
نہیں تھا مگر بیشتر سنگھ کا بھتیجا تھا سگا۔ ماں جائے بھائی کا بیٹا۔ اسی
کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ برات مان کھیڑے سے آنے والی تھی۔ چاچا
نے سمدھی اپنے جیسے ڈھونڈے تھے زور اور زر والے۔ یوں بھی مان
کھیڑے کے سکھوں کا مقابلہ پنجاب میں بہت کم قبیلے کر سکتے تھے۔ مہاراجہ
رنجیت سنگھ نے اپنی لڑکی یہاں بیاہی تھی۔ ان کی بہادری کی دھوم دور
دور تک تھی۔ بانٹتے بخشتے کرتے ہوئے بھی ایک ایک کے پاس کم از کم
سو سو گھوڑے تھے۔ مان کھیڑے والوں کے ہاں رتھوں میں جتنے والے بیل
ہزار ہزار روپے کے تھے۔ سینگوں پر گھنگھرو، ٹیاں چڑھی ہوئیں۔ سفید رتھوں
کے رنگ برنگے پردوں کے پیچھے کبوتروں کی سی اونچی چھاتیوں والی سوانیاں
ٹیاریں جو چلیں تو زمین پھولوں کی طرح نرم پڑ جائے۔ گلابوں کی نزاکت والی
نرمی سے بات کرنے والی مان کھیڑے کی عورتوں کا مقابلہ بھی کون کر سکتا
ہے۔ حسن ان کے گھر کا غلام تھا، دولت پانی بھرتی تھی۔ اور وہاں چانن
سنگھ کی بسنت کور بیاہی جانے والی تھی۔

بسنتی کا قد اونچا تھا اور رنگ روئی کی طرح سفید۔ چلتی تو لگتا جیسے
پانی پہ تیر رہی ہے۔ کمر پہ گھڑا ٹکا کر جب گھاٹ سے پانی بھرنے جاتی
تو گاؤں کے جوان اسے چھپ چھپ کر دیکھتے مگر ان کھیڑے سے
بات ہونے کے بعد کسی کو ہمت ہی نہ پڑی کہ اس سے بات کرنے
کا ڈھنگ نکالے۔ ہمارے گاؤں کا سب سے چھیلا اور بہادر امر سنگھ
بھی دل چھوڑ گیا۔ ہم نے اس کا خوب مذاق بنایا تو کہنے لگا۔ یار اپنا
کیا جاتا ہے پر ان کھیڑے والوں کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے اور یہ
ان کی امانت ہے۔ جب گرو ہی ساتھ چھوڑ دے تو چیلے کیا کرسکتے ہیں
اس لیے ہم میں سے کسی نے سوائے بسنتی کو دور سے دیکھنے کے کبھی
آگے بڑھ کر بات کرنے کی ہمت نہیں کی۔ اور ایسے اس دن بسنتی کی
شادی ہو رہی تھی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا، یار خوب پیے
گئے، برات گھر کو جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا، دریاں بچھا کر ان پر نئے
سرے سے بچھا دی گئی۔ گاؤں کے سارے گھروں سے، برادری
میں سے صاف ستھرے بستر اکٹھے کر کے برات گھر کے کمرے میں
ڈھیر لگا دیا گیا۔ بڑے بڑے کڑاہ حلوے کے پک چکے تھے۔ جن پہ
گھی تیر رہا تھا۔ زمین کو کھود کر بھٹیوں کی طرح کے چولہے بنائے گئے
تھے جن پر نانبائی پراٹھے پکا رہے تھے۔ ایندھن کے ڈھیر لگے تھے۔ چا

ایشر سنگھ روز کی طرح آج زور زور سے ہنس رہا تھا۔ پچھواڑے کی
کوٹھڑی میں کبھی اندر جاتا کبھی باہر آتا۔ بیلوں کے پیچھے پیٹھوں پہ ہاتھ
پھیرتا۔ اور ہیر گانے لگتا۔ آج اس نے روز کی طرح پگڑی بہت اچھی
طرح نہیں باندھی ہوئی تھی۔ سفید بالوں کے گچھے اس کی گردن کے پیچھے
جوڑے پر برف کے گالوں کی طرح پڑے تھے۔ کُرتا ذرا میلا تھا۔ اس کے
ننگے پاؤں گرد سے اٹے ہوئے تھے جیسے عادت کے مطابق اس نے
آج تین چار بار انہیں دھویا نہ ہو۔ شام ابھی ڈھلی تھی مگر اس نے ٹوکے کو
صاف کرنا شروع کر دیا۔ چاچی روٹی لائی تو شوق سے رومال کھول کر جلدی
سے دیکھنے کی بجائے اس نے ایک طرف رکھ کر، وہ ٹوکے پر اسی طرح جھکا
رہا اور اتنے زور سے گانے لگا کہ وہ جل گئی اور بولی: "تجھے تو سارا وقت
یہ آگ لگی ہیر گانے سے فرصت نہیں ہوتی۔ کبھی کوئی کام کی بات تو نہیں
سنتے" اور ایشر سنگھ بڑی نرمی سے مڑ کر بولا: "ہیر تو تیرے سہاگ کی
کلی۔ ہیر تو زمین کی نرمی ہے گندم کی بالیں ہیں دانے کی طرح ہے۔ تو
مجھے کیا کہنے آئی ہے۔ جلدی بتا اگر کوئی کام نہیں تو جا جا کر چرخہ کات
مجھے گانے دے۔" وہ پھر اسی طرح ٹوکے پر جھک گیا۔ "آگ لگے تیرے
گلا اور تیری ہیر کو۔" چاچی چیخ کر بولی: "تو ہیر گا گا کر بھوت بن گیا ہے
میں کہتی ہوں روٹی کھا کر مجھے برتن دے تو میں گھر جاؤں۔ کیا اچار کر آئی ہوں۔"

"بیٹا! وہ گھڑی تیرے گھر سے کون سا کوئی زیوروں کا ڈبہ چھوڑ جائے گا۔
سُوت کے ڈھیر ہو ہیں کات کات کر لگاتی جا۔" ایشر نے اسی طرح
ڈھکے کی ہتھی کو ہاتھ میں لے کر اُسے گھماتے ہوئے کہا۔

"آگ لگے بیماری چرخے۔ دشمنوں کو چاٹ لے۔ میری زندگی میں سوائے
کاتنے کے کیا کام رہ گیا ہے۔"

"دیکھو میری طرف دیکھو اور سن یہ کبھی ایسی بات نہ کہیو بہو۔ کسی
کا اُن نہیں مانگتے اپنا بُرا ہو جاتا ہے۔" دین محمد ہاتھ میں بیڑی پکڑے تھا۔
بیڑی سلگا کی جیسے میری طرف تھی اور اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے وہ ذرا
یا جیسے ہو ذرا تکلی اور انگوٹھے کو دبانے سے اُس نے آنکھیں کھولے دیا وہ لگ
رہا تھا۔ جیسے ایک ایک ماں کا بیٹا کیا ہو۔ اور پھر اس نے بڑے زور سے
قہقہہ لگایا۔ اتنے زور سے کہ دین محمد ڈر گیا۔ "سن میں تجھے سناتا ہوں۔"

"میری آنکھیں کیا ہو گیا چھوٹ بولیں سے کون دیکھتے اور ملا دو ادی۔"

اور چاچی گالیاں دینی اٹھ کھڑی ہوئی "تُو تو سٹری ہو گیا ہے۔
ہر وقت ہیر۔ ہر گھڑی ہیر۔ ہیر سے تو نصیب سڑ گئے۔ جیسے روٹی کما کر
میں جاتی ہوں۔" مگر اب تو اس نے مجھے دیکھا۔ ہنس کر کہنے لگا "یہ لے
ہیرے نادگروں کی قسم ایسی دشمنی ہو گئی ہے کہ کیا کہوں۔ کوئی اتنے
یہ نہیں سمجھتا کہ یہ زمین ہیر ہی کی تو ہے۔ اگر اس ہیر کو پیار سے بونے

میرا جی چاہتا تھا بشیر سنگھ سے پوچھوں۔

جب سوہا سنگھ اور چودھری شریف کے گھروں سے پرلی طرف میں نے نظر کی تو بابو کمہار گدھے ہنکاتا کھیتوں کی منڈیروں سے اُدھر آ رہا تھا۔ میں نے زور سے آواز دی تو وہ کھڑا ہو گیا اُس کے گدھے اس طرح سر جھکائے ہوئے چلتے رہے۔ میں نے یونہی کہا "یار کیا ادا۔ بابے اوئے کہاں جائے گا؟" کہنے لگا "لال دین دیال نے بی بی بسنتی کے بیاہ میں رنا بھیجا ہے اور بدھائی بھی۔" "اچھا" میں نے یونہی بات کرنے کی خاطر کہا "تو پھر کیا کرو گے؟" ہنس کر اپنے دُور جاتے گدھوں کے پیچھے تیزی سے بھاگتا ہوا بولا "جا دو رات کی روٹی کھاؤں گا اور پھر اپنے گاؤں کو واپس۔ کیوں تُو نے کچھ بھیجا ہے؟" میں بنا جواب دیے لوٹ آیا اور اپنے کھیتوں کی طرف جاتے راستے زور زور سے ہُو ہُو کرنے لگا کہ گالھیاں سے سرکنڈوں کے نالوں پر سے گونج اٹھیں اور کوے اور چیلیں درختوں سے پھڑپھڑا کر اُڑ گئیں۔ ڈھولک کی ہلکی ہلکی آواز اتنی دور بھی آ رہی تھی جیسے ہوا کے جیسے کوئی خواب میں چلتے چلتے دبے قدموں رُک کر پھر چلنے لگے۔ ہوا کے رُخ سے آواز آتی اور پھر ختم ہو جاتی۔ میں نے سوچا بسنتی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھوڑی میری ماں کی پسند ... کی طرح شرما رہی ہو گی۔ کل اس کے مہندی لگے نازک پاؤں میں چھاجھریں پڑ رہی ہوں گی۔ جھکتے ماتھے پر ٹیکا ہو گا۔ نتھ

رنگین ہونٹوں کو بار بار چومے گی جو شہ سے اس کی گوری باہیں کلائیوں تک بھری ہوں گی - اور ان میں بنسے کیڑے ہوں گے۔ پھر اسے پیچھے کپڑے سے ڈھکی ڈولی میں بٹھایا جائے گا۔ اور ڈولی کہار اٹھائیں گے پھر بسنت کو جسے ہم سب پیار سے بسنتی کہتے تھے - ان کیڑے والوں کے ساتھ چلی جائے گی - اس گاؤں سے اس کا رشتہ بس یونہی سا رہ جائے گا۔ برات آنے کی تو باجے بجیں گے - اس کی ڈولی پر سے اَدھیاں روپے پیسے پھینکے جائیں گے۔ وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہے گی اور دیکھ نہ سکے گی - پھر جب مرے گی تو ان کیڑے کے شمشان میں اس کا چاندی کا جسم خیر راکھ بنے گا۔ اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے جھٹک دیے - سامنے سے میرا چھوٹا بھائی آ رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگا " بھا وڑ - میں یہ کہنے آیا ہوں کہ آج چانن سنگھ نے ہر گھر کا ایک آدمی مانگا ہے براتیوں کے سواگت کے لیے۔ تم جاؤ گے کہ میں چلا جاؤں؟ میں نے کہا " تم چلے جاؤ " وہ پھر کہنے لگا " تو کیا تم شام کو رات گھر روٹی کھانے نہیں آؤ گے " چانن سنگھ نے ہمارے سارے خاندان کو بلایا ہے۔

اور یکایک غکسی میرے ذہن پر بادلوں کی اندھی کی طرح چھا گئی میں کہیں جانا نہیں چاہتا تھا میں کسی بات کا جواب دینا بھی نہیں

چاہتا تھا۔ میں بنا اُس سے کچھ کہے ایک طرف کو مڑ گیا۔ سامنے سے
وینشر سنگھ آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہنسا اور بولا "کیوں محمد بخش بھیجی بابو کہا
کو جنگلی والوں کی طرح کھڑا کر کے کیا سوال جواب کرتے تھے؟" میں
نے کہا "اُس سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ سارا دن جانوروں کو
ہنکاتے ہم تم آدمی بھی جنگلی بن گئے ہیں" "کیا کہہ رہا تھا بابو؟" میں نے
جواب دیا: "وہ لالہ دین دیال کی طرف سے آٹا لاد کر جانے کے گھر
لایا ہے سنتی بی بی کے بیاہ پر بدھائی دینے آیا ہے۔" "اچھا" میں نے
کہا: "بھئی وینشر سنگھ ویسے بیاہ لے دوسروں کی کمائی کا دیں -
بدھائی کریں گے مگر کنیا کو دان بڑے کھلے دل سے دیتے ہیں۔ اب
دیکھو ان پانچ گدھوں پر پندرہ من تو جو گا۔ ویسے اگر لالہ دین دیال سے
پیسہ ویسے مانگو تو بیاج کے بنا بات نہ کرے گا مگر سمجھتا ہے کہ سنتی کے
بیاہ میں دینے سے تو پُن داں بن جائے گا۔ بس اپنی خوشی سے بھیج دیا
اور بدھائی سو الگ۔"

وینشر سنگھ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ آدمیوں کے چیخنے اور
پرندوں کی آوازوں سے جھاڑی کی ڈراؤنی صورتوں سے بھری بھولی لگتی
تھی۔ وینشر سنگھ کے بیل پھوس کے کوٹھے کے نیچے پڑے ہے چین

اور امرودوں کا شہد تھا۔ یہ آندھی ساری زندگی تھی۔ ایشر سنگھ نے اپنا منہ لپیٹ لیا اور سر کو گھٹنوں پر رکھ کر بے حس ہو گیا۔ میرا دل یونہی تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ بسنت کور کے بیاہ کے لیے سجائے گئے بات گھر میں جھنڈیاں اکھڑ جائیں گی۔ وردیوں پر مٹی آ پڑے گی۔ لوگ کھانا کھا رہے ہوں گے اور کرکری ریت ان کے دانتوں میں آئے گی۔ اچھا ہی ہوا میں کھانے نہیں گیا۔ چندر کور کے بیاہ پر بھی آندھی آئی تھی۔ پالیسی زبردست نہیں پیسہ بھی کتنی ہوتی ہے۔ اب مان کھیڑے والے آ رہے ہوں گے اور ساری رات چانن سنگھ دریاں بچھوا رہے گا۔ چندر اپنے گھر راضی خوشی ہے۔ اپنے بچوں میں گھری ہوئی اتنے بڑے گھر بار کو سنبھالنے والی بنی۔ میری وہ چھوٹی سی بہن جس کو میں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا کرتا تھا اور جس کے ہاتھ پر ایک دفعہ میں نے ایسا کاٹا تھا کہ اور نشانہ تھا۔ یہ بہنیں اور بیٹیاں ہی ساری زندگی کی خوبصورتی ہیں۔

ایشر سنگھ نے سر اوپر اٹھایا میری طرف دیکھا اور پھر اسی طرح گھٹنوں پر رکھ لیا۔ میں نے کہا کیا بات ہے۔ ایشر سنگھ کوئی بات کرو۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ کیسی بری رات آئی ہے۔ بیچارے چانن کی بسنتی کا بیاہ ہے اور ساری دنیا کی گرد اکٹھی ہو کر آج یہاں آ گئی ہے۔ یہ تو کسی شادی سے بھی زیادہ زور دار ہے جیسے لال

آندھی ہو۔"

"ہاں یہ لال آندھی ہی ہے۔" اس نے اسی طرح سر کو گھٹنوں سے اٹھائے بنا کہا۔

"ایشر یہ جھنی میں نے تو سدا یہی سنا ہے کہ لال آندھی اس وقت آتی ہے جب کسی بے گناہ کو قتل کیا جائے۔ واہ گرو خیر کرے بیچاری بسنتی کا بیاہ خیر خیریت سے ہو جائے۔"

دور سے چیخیں سنائی دے رہی تھیں ہوا بین کر رہی تھی پھر ایک آواز ان سب پر سے ہوتی ہوئی ہماری کوٹھڑی میں آئی جیسے دور بہت دور کسی نے کسی کو پکارا ہو۔ زور سے اور آخری بار کسی کا نام لیا ہو۔ سائیں سائیں کے شور درختوں اور کھیتوں کے ملے جلے شور میں۔ پھر یہ آواز ہم سے دور چلی گئی۔ ایشر ایک دم اٹھا جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے اسے اٹھایا ہو۔ اس کا چہرہ اس مٹی کی لالٹین میں مُردے کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی شکل دیکھ کر بڑا ڈر لگا۔ کھیس کو اپنے گرد لپیٹ کر پھیکے پاؤں وہ دروازے کی طرف بڑھا تو میں نے تیزی سے اٹھ کر اسے پکڑ لیا۔ "کہاں چلے ہو، کہاں چلے ہو۔" میں نے اس کے گرد اپنی بانہیں لپیٹتے ہوئے ہوئے کہا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ایک جھٹکا دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیتا۔

مگر بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھ کر اس نے کہا "یہ او ! تم نے
ہوئیں تھی مجھی کسی نے مجھے پکارا تھا۔ مجھے یاد تھا۔

"باہر لال آندھی چل رہی ہے اور میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔" میں
نے اسے بٹھاتے ہوئے کہا: "لال آندھی؟" ہاں، پہنچانے جانے کا تو
سارا کچھ خراب ہو گیا ہو گا۔ کاش کا سے میں لاری آندھی پہلے تو کبھی بھی نہیں
آئی تھی۔"

"جب بھی بے گناہ کا قتل ہوتا ہے تو ایسی آندھی ضرور آتی ہے۔
ایک بار پہلے بھی۔ ایک بار پہلے بھی آئی تھی ....."

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"میں نے کچھ کہا ہے۔ میں کچھ بولا ہوں۔" اس نے حیرت سے
میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تم نے تو ایسی کسی لال آندھیاں دیکھی ہوں گی کب کی بات کر
رہے ہو۔ پہلے کب آئی تھی ایسی آندھی کوئی بات کرو۔" بغیر کسے گئے
وہ اٹھا، دروازے سے گزرتے بیلوں کی ٹوپی پر ہاتھ پھیر کر بھینس
کی طرف گیا۔ اس کے سفید منہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے منہ
کے قریب کرتے ہوئے اسے چمکارنے اور پیار کرنے لگا۔

باہر آندھی کے شور سے گھبرا کر میں نے پھر کہا: "ہماری زندگی بھی کیا ہے۔ اس زمین کی خاطر جنگل میں بیٹھے ہیں مگر اب یہ کلی اُڑ جائے تو ہم بھی اس کے ساتھ اُڑ جائیں۔ کوئی شے نہیں رُک سکتی۔ کڑ کڑ کی آواز یوں آئی جیسے چیڑ کا بڑا درخت ٹوٹ کر گر گیا ہو۔

"ٹھیک کہتے ہو، زمین کی خاطر جنگل میں بیٹھے ہیں۔" ویر سنگھ نے میرے قریب سے ہو کر کہا۔ "گوربخش سنگھ، زمین کی محبت عورت کی محبت سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ عورت کے پیچھے دیوانے ہو تو وہ اور کچھ نہ سہی ایک میٹھی نظر سے تو دیکھ لیتی ہے نا۔ جسے تم ساری عمر یاد رکھ سکو۔ پر زمین ایسی بیری ہے کہ کبھی رانجھے کو جوگی کے بھیس میں دیکھ لے تو اسے ملے گی ہی نہیں، اس کی طرف دیکھے گی ہی نہیں۔"

"تم نے کبھی کسی عورت سے محبت کی ہے ویر سنگھ؟" میں نے باتیں کرنے کی خاطر اس سے پوچھا۔

"ہاں گوربخش سنگھ۔"

"کون تھی وہ ویر سنگھ؟"

وہ بھینس کے چمکیلے جسم پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے یادوں کی لہروں میں بہہ گیا ہو کہنے لگا۔ "تھی ایک۔ بڑی ہی ظالم، بڑی ہی ظالم، بڑی ہی ظالم۔ اتنی سخت کہ میں آج تک اس کے لیے

دیوانہ ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔ سارا کچھ زندگی کی ساری
دولت دل کا امن چین سارا اس کے لیے بھینٹ کر دیا۔ میں جب بہت
چھوٹا تھا۔ اور باپو کی انگلی پکڑ کر پھرا کرتا تھا تب سے اس کے پھندے
میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس کی خوشبو مجھے ان دنوں بھی پاگل کر دیتی تھی۔
گور جنس سگندھ بھی وہ خوشبو اس کی مٹی نکلنے کے بعد بھی بڑھ کر رہتی مست
کرنے والی۔ ہوش اڑا اس چین لینے والی۔"

"اس کا نام کیا تھا، وہ اب کہاں رہتی ہے؟"

اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا "گھبراتے کیوں ہو نام بھی
بتا دوں گا۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا اس کی چاہت میری رگوں میں
دیوانگی بن کر تیرنے لگی۔ اس کی چاہت جیتنے کے لیے اس کے پیار
کے ایک بول کے لیے میں نے کیا کیا نہیں کیا۔ جب میں کھیتوں میں
ہل چلا رہا ہوتا تو میری سانس تیز چلنے لگتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے وہ
درختوں کی اوٹ میں کھڑی مجھے جھانک رہی ہے۔ اس کے بالوں
سے بڑی خوشبو نکلتی ہوئی اس کا جسم خوشبو سے مہکتا ہوا۔ اتنی نازک
کہ لگتا چلے گی تو گر جائے گی۔ اپنے مہندی لگے ہاتھوں کی پوروں سے
درخت کو تھامے ہوئے وہ چھپ چھپ کر مجھے دیکھتی اور میں ساری
نظر میں اس کی جوانی پر لگائے پسینے میں بھیگا بیلوں کو زور زور سے ہانکے جاتا۔

دیوانہ بنا دیا۔

"وہ کون تھی اپشر سنگھ۔ وہ تیرے پیچھے کیسے پڑ سکتی تھی۔ گاؤں میں
اس کو روکنے والا کوئی نہ تھا کیا؟" میں نے اس عورت کے بیچ ہی میں
گویا سخت غصہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اور اس نے میری بات ان سنی کر کے کہا۔ مہر سنگھ وڈا ہو گیا تو وہ بھی
میری اس حالت پر ہنسنے لگا۔ لوگوں کے لیے یہ بات تو بس اب اتنی
عام سی ہو گئی تھی کہ میں دن رات کام کرتا ہوں اور چین اور سکھ مجھے
ملی ہی نہیں، جیسے کبھی نہیں تھکتا۔ مہر سنگھ اور میں مل کر کام کرتے تھے۔ وہ
میرے بازو برابر میرا سہارا تھا۔ مجھ سے بھی اونچا اور وڈا۔ چلتا تو زمین
دہلتی۔ اس کی ماں نے دودھ ملائی کھلا کھلا کر پالا تھا۔ اسے کہیں کھڑا
تو جیسے گھٹا چھا گئی ہو۔ ہنستا تو بس موہ لیتا۔ وہ میرے پاس ہوتا تو میں
درخت کے پیچھے اس کی آنکھوں سے بھی بے پرواہ ہو جاتا۔

"میرے تیسرے بھائی کے لڑکے بڑے جھگڑالو اور بڑے ہی ظالم
ہیں۔ ذرا اونچے ہوئے ہوش سنبھالا ہے تو مہر سنگھ سے الجھنے لگے
ہماری خوشیوں میں جیسے کسی نے سوراخ کر دیا ہو۔ ذرا ذرا سی باتوں
پر جھگڑا ہو جاتا کھیتوں کو پانی دینے پر۔ درختوں پر جو منڈیروں کے اوپر
لگے ہوئے تھے۔ یونہی۔ بات بے بات۔ وہ لڑنے لگتے مجھے تو

کچھ نہ کہتے مگر مہر سنگھ کو للکارتے تھے۔ سارا وقت لاٹھیوں کے سروں پر بلم تیز کرواتے اور اُسے چڑانے کے لیے ہنستے رہتے لوگوں نے ان کی صلح کروانے کی کوشش کی تو جھگڑا اور بڑھ گیا۔ مہر سنگھ بڑا ہی سنجیدہ تھا اور بڑا ہی دھیرج والا۔ بالکل باپو کی طرح کا۔ ان دنوں ماں بھی زندہ تھی۔ اُس نے رو رو کر جی ہلکان کر دیا۔ ہاں تو بیٹے۔ بیا ان کے باپ کو میرے بڑے بھائی کو گالیاں دیں۔ مگر بس یونہی بات بڑھتی گئی۔ اصل میں اُسے مہر سنگھ سے بڑا پیار تھا۔ جیسے وہ اس کا سگا اور باقی سوتیلے بیٹے ہوں۔ بوڑھی عورت تھی کھلم کھلا کہتی کہ کوئی بھی اُسے مہر سنگھ کی طرح پیارا نہیں۔ یہ سارے جھگڑے اصل میں اس پیار نے پیدا کیے تھے۔ پیار بڑی ظالم شے ہے جوان!

اور پھر ایک رات آئی۔ ایسی ہی ظالم اور خوفناک رات تھی۔ کھیتوں کو پانی لگانے کے وقت نہ جانے مجھے نیند کیوں آ گئی مہر سنگھ مجھے سوتا چھوڑ کر اکیلا ہی چلا گیا۔ اُس دن اُس نے اپنی کیسری پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ وہ اُچل کے میلے سے واپس آیا تھا۔ اُس کے سرانے موتیے کے ہار بھی پڑے تھے۔ اُس کی چارپائی کے پائے کے ساتھ گھنگھرو بھی جو وہ میلے سے لایا تھا۔ اس کی دادی نے اس سے پہلے دن اس کے کیس آپ دھوئے تھے اور ان میں اپنے ہاتھ سے

تیل لگایا تھا۔ میں اٹھا ہوں تو میری بیوی کہنے لگی مہر سنگھ پانی لگانے
چلا گیا ہے۔ کہتا تھا باپو اٹھے تو اسے کہنا میں اکیلا ہی کام کر لوں گا۔ میں
ذرا سا لیٹا ہوں تو آندھی آ گئی۔ لال آندھی۔ ہمارے صحن میں پیپل کا درخت
گڑگڑا کے ایک دم گر گیا۔ جیسے کسی نے اس کی جڑ پر چھری پھیر دی ہو۔
کوٹھے کی چھت اڑ گئی۔ میری بڑھیا ماں بے قرار ہو کر کہنے لگی۔ اندر سنگھو
وے اندر سنگھ جا تو بھی جا۔ مہر سنگھ اکیلا ہی چلا گیا ہے
کتنی کالی پیلی آندھی ہے۔ کتنی لال ہے۔ توبہ توبہ کرتار بھلی کرے۔ واہ
گرو خیر کرے۔ وہ زور زور سے شیشم ٹوٹنے لگی۔ میرے پاؤں اکھڑ رہے
تھے۔ زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ گلیوں گلیوں میں تو دیواروں کا سہارا لے
کر چلتا رہا مگر کھلی جگہ میں چلنا ناممکن ہو گیا۔ میں بیٹھ کر، بیٹھ کر آگے جانا
چاہتا تھا مگر دنیا کی ساری طاقتیں مل کر مجھے پیچھے دھکیل رہی تھیں۔
ہوا میں چیخیں تھیں، آندھیوں کی۔ جیسے ساری دنیا اجڑ گئی ہو۔ میں اکیلا
رہ گیا ہوں۔ درخت گر رہے تھے۔ کوٹھوں پر کی بھٹیوں کے ڈھیر تنکوں
کی طرح اڑتے پھرتے تھے۔ نہ جانے کیسی کیسی چیزیں میری راہ میں
کھڑی تھیں۔ جیسے پتھروں اور کانٹوں سے میری راہ بند ہو گئی ہو۔ پھر
میں نے ایک چیخ سنی تھی۔ بہت دور سے آئی ہوئی۔ ایک دردناک
چیخ۔ جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے بھاگنا چاہا تو کوئی سے

میرے پاؤں سے الجھ گئی۔ میں بہت زور سے گرا۔ میرا سر پھٹ گیا۔ خون اور تازہ مٹی کی گرد میرے چہرے پر مل گئی۔ اس رات ساری کی ساری میرے خلاف تھی۔ مجھے نہ جانے کن ہاتھوں سے پیچھے دھکیلا جا رہا تھا۔ میرا ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھ سکتا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کر جلدی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ مہر سنگھ واپس نہیں آیا۔ ظالموں نے ریت ڈال کر اس کا گلا بند کر دیا تھا۔ اسے سوکھے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ نہ جانے وہ کتنے ہوں گے۔ میرا مہر سنگھ ایک دو کے قابو آنے والا تو نہیں تھا اور پھر دوسری صبح منہ اندھیرے ہی بڑے سے اونچے درخت کی ایک موٹی سی شاخ سے اسی کیسری پگڑی کے ساتھ مہر سنگھ لٹک رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اس کی لاش یوں آگے پیچھے ڈولتی تھی جیسے وہ پینگ پر چڑھا ہوئے ہوئے مزے میں جھونٹے لے رہا ہو۔ جب اسے وہاں سے اتار کر گھر لایا گیا۔ بے تو دس گاؤں کے آدمی بوڑھے جوان تو کیا بچے اس کی بارات کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اس کی دادی کہا کرتی تھی کہ وہ تو کسی مہاراجہ کی بیٹی سے بیاہ کرے گا۔ مہر سنگھ کا بیاہ سب سے طاقتور مہاراجہ اودی ناشی کی بیٹی سے ہوا تھا جس کا حسن کسی نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔

کرتے تھے۔ پیڑوں کی جو ٹہنیاں کٹیں جھولیں۔ لال آندھی اور پھر مینہ کی بوچھار سے میں
سارا آنگن بن گیا اور میں سوچنے لگا ایسی ایک سی گھلاوٹ کی باتیں کرنے والی
سماں سے جوان اور عفت مآب مگر کسی سے ظاہر نہ ہونے والی کشش، وہ دوریاں
کی اوٹ میں سے جھانکنے والی مگر کسی سے نیاز نہ کرنے والی۔ وہ نہ کسی
کی ماں ہے اور نہ کسی کی بیٹی نہ کسی کی بہن ہے اور نہ کسی کی بیوی۔ میں
نے ساری عمر اپنے پیچھے اس کے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ ہمیشہ اس
کی خوشبو کو پکڑنا چاہا ہے پر وہ آواز کی طرح کبھی کسی کے قابو میں نہیں
آ سکی۔

آندھی ختم ہو چکی تھی۔ ہوا میں پہلی سی تیزی نہ تھی۔ دیسراج کی بیوی
باہر کھڑی کہہ رہی تھی۔ "اس سے تو یہی نہیں ہو سکتا کہ گھر ذرا دودھ ہی پہنچا
ہی پکڑا جائے۔" میں نے دروازہ کھولا تو وہ اندر آ گئی۔ سر پر لسی کا ڈونگا
اٹھائے چنگیر میں روٹیاں اوپر دھری ہوئی تھیں۔ اور جلدی جلدی کہنے لگی
"چاچا ان کی بیوی ابھی آئی تھی کہتی تھی "پچھلے جھگڑوں پر اب مٹی ڈالو۔ بڑا
کنواری تو سارے گاؤں کی ہوتی ہے سنتی کے بیاہ پہ آؤ۔ برات آنے
والی ہے مجھے فرصت نہ ملی تھی ورنہ میں پہلے ضرور آتی۔ انہوں نے ختم کیا
جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میں کہتی ہوں اب کیا صلاح ہے۔" تو وہ چپ ہو گئی
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ہم کونسے زندہ ہیں اگر وہ ہمیں سمجھے

بچی کا رشتہ دیتے نہ مانتے تو کیا تھا۔ کوئی ہمارے بیٹے کی شادی ہونے
والی ہے کہ انھیں نہ بلا کر ہم بدلا اتار سکتے۔ کیوں، بڑا بات بنا سکتے ہو نا۔"
وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"ہاں میں کہتا ہوں چلے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

میں بسنتی کے بیاہ پر نہ بھی جاتا تو بھی اسے کنیا دان تو دینا ہی تھا۔ سارے
قبیلے کی بیٹی ہے پھر میں تو اس کا دادا لگتا ہوں۔

"کیا سارا دان کی ہے تو نے؟" بیٹے کی بیوی نے پوچھا۔

"بس بیگھہ دان" اُس نے اُسی طرح انگوٹھے اور اُنگلی کو دکھا کر ہلا بیں
ہلایا اور آنکھوں کو زیادہ کھول کر کہنے لگا "یہ زمین نہ تیرے کسی کام کی
ہے اور نہ میرے۔ نہ میرے بعد میرے پوتے ہیں اور نہ تیری پوتیاں۔
اپنی زندگی کا کیا ہے ساری بیت گئی اب کس لیے اس کو سینے سے
لگائے رکھیں۔ کیوں نہ یہ کھیت کنیا دان میں بسنتی کو دے دیں۔ تیری کیا
مرضی ہے؟" وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی "پہلے روٹی تو کھا لے۔
اگر تجھے بسنتی کو یہ ساری زمین دینی ہی ہے تو مجھے کیا کہنا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی
برادری سے میل کرنا ہو تو اس طرح سہی۔"

وہ خاموشی سے روٹی کھاتا رہا۔ اس کی سفید بھنویں اور سفید داڑھی
ہلتے ہوئے ڈول رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا وہ دونوں ابھی جوان

ہیں۔ ان کے دلوں میں ڈنگر ڈھور کو بخشنے اور دوسروں کو معاف کر دینے کی کتنی طاقت ہے کتنی زندگی ہے۔

برتنی بھیس کر دودھ کی بالٹی لیے چاچی واپس چلی گئی۔ باہر چاندنی پھیلی تھی۔ ایشر سنگھ کھیت کے کنارے ہو کر چلا گیا اور پھر دور پرے اس کی آواز سنائی دی۔

"ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ بولیں سچے کون روٹھڑے یار ملاوندا ای۔"

گوشۂ بساط

شہروں والے علی وال سے گاؤں کی طرف گھومتے تو کچے سرکنڈوں کی دیواروں سے محفوظ راستہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک تو چوہڑوں کی پتی سے ہو کر جولاہوں کے دھڑے کی طرف اور دوسرا مولوی محمد کی حویلی کے سامنے سے ہو کر لمبرداروں کی پتی کو جو ڈاک خانہ اور مدرسے اس طرف کو چھوڑ کر باقی سب طرف ڈھاب ہے۔ جس نے نئے چاند کی کمان کی طرح گاؤں کو گھیر رکھا ہے۔ ڈھاب والی کوئی بستی نہیں ہے بس ایک اونچے ٹیلے کے ساتھ کئی چھوٹے ٹیلوں اور ایک خشک نالے کے مٹتے نشانوں کا نام ہے۔ ہمارے گاؤں سے اتنا نزدیک کہ چاندنی راتوں کو سارے گاؤں کی لڑکیاں یہاں بلا خوف آتی ہیں اور دائرے بنا کر ناچتی ہیں گاتی ہیں اور کھیلتی ہیں۔ ناچتے ناچتے ان کی لمبی چوٹیاں کھل جاتی ہیں۔ اور جب وہ بہت زور زور سے ہنستی ہیں، تو بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں: "شاداں، بالاں، پھدولی، سکھتو

ایشری! تم کو ہوش نہیں کیا ہی ہی لگا رکھی ہے۔ مقبرے کے اتنا قریب ہو کر
بھی زور زور سے قہقہے لگاتی ہو۔ رب کا نام لو۔ موت کو یاد کرو۔" اور وہ ما
ہٹ کر باؤ کے باغ سے پرلی طرف لڑکیاں قبرستان اور شمشان کو دیکھنے
لگتی ہیں۔ پھر یہ گھڑی دو گھڑی کی رونق ہوتے ہوتے کم ہونے لگتی ہے
گاؤں کی بہو، بیٹیاں، مائیں سب اپنے گھروں کو واپس چلی جاتی ہیں۔ اور
سونی راہوں پر سانپ پھرتے ہیں یا ہر واسے غول کے غول تماشے
کرتے، شور مچاتے، وہ لڑکیوں کے ناچ کی نقل کرتے، مقبرے او مجرے ڈال
پر گھومتے ہیں اور صبح مرغ کی اذان تک یہ ٹیلے پھر اسی طرح سنسان ہو
جاتے ہیں۔ سنتے ہیں یہاں پہلے ایک گاؤں تھا۔ ہرا بھرا آباد اور خوش حال تھا
پھر نہ جانے کیا بات ہوئی رات رات میں ساری بستی دھنس گئی، زمین
ٹیلے بن گئی، گاؤں زمین میں غرق ہو گیا۔ سنا ہے یہاں ایک کنویں جی ہوتی
صاحب نے اپنے جلال اور طاقت کے زور سے ایک جن قید کر رکھا
تھا۔ اتفاق کی بات ہے ایک دن وہ باوضو نہیں تھے اور کہیں جا رہے
تھے۔ جن کی ڈوری ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ غصے میں بھرا ہوا تو
تھا ہی، اس نے ساری بستی الٹ دی۔ یوں آ کر چھپتے ہیں جیسے جوان
تم گھاتے ہیں۔

اب مولوی صمد کی حویلی بھی سنسان ہے، پنبلیوں والی مسجد بھی ویران

ہے۔ المبرداروں کی بستی کے لوگ مسجد کے کنوئیں سے پانی لاتے ہیں۔ تو
کوئی مسجد کے کنوئیں کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ برسات کے دنوں
میں جب ڈھاب بڑھ کر ان دو ڈیوڑھیوں کو چھونے لگتی ہے جو حویلی کے
عین سامنے والی نالی کی حد بندی کو رکھی گئی تھیں تو یہ کنواں بالکل بھر جاتا
ہے۔ ان دنوں دلاور علی کے شکاری کتے اس گھر کی بچی جھیلکوں میں بیٹھے
ہوتے ہیں، اور اونچے دالان کے ساتھ چنبیلی عشق پیچاں کی جھاڑ جھنکار بڑی
سرسبز دکھائی دیتی ہے۔ اس برس کاسنی رنگ کے اتنے پھول کھلتے ہیں
کہ سبز پتیاں چھپ جاتی ہیں۔ ساری روش جو اس گلی کے راستے بھی جاتی
منجمد ہو کر عشق پیچاں کی بیل کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس بیل نے پھیل
کر اب چھت پر بھی اپنے پاؤں جما لیے ہیں۔ بیتے ہوئے سال جو ہوئے
ہوئے بڈھوں کی طرح لاٹھی ٹیکتے اس حویلی میں آ نکلے ہیں، کیوں نہ نکلتے تو
بہن جی آج بھی دالان کے باہر کھڑی ہو کر مولوی جی سے کہتیں۔ "جی میں
نے کہا کسی کو بلا کر اس بیل کو تو ٹھیک کراؤ۔ عرس کے دن نزدیک ہیں۔
مجھے اور سو دھندے ہیں آخر ہر طرف میں کیسے دھیان کروں؟ آپ
باہر بیٹھک میں بیٹھے ان نگوڑے مریدوں سے کیا الجھتے رہتے ہیں کبھی گھر کی
خبر بھی لیا کریں۔" اور مولوی صاحب جلدی جلدی وضو کے آخری قطروں میں
سے گزرتے لوٹے کو دالان میں رکھتے ہوئے کہتے "نیک بخت تجھے

میرے مریدوں سے کیوں شفا و اسطے کا ہے جب ان میں سے کسی کو سکھ دے تو وہ ہمارے پسینے کی جگہ اپنا خون بہائے۔ اس چیل کی کیا بات ہے کہے تو باہر کے سائے سے چیل ایک دم کٹوا دوں۔" اور بہن جی خفا ہو کر دالان میں نیچے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ جاتیں۔ جیسے یہ بات انھوں نے کہی ہی نہ ہو۔ عینک نکال کر اپنی اونچی ناک کے سرے پر رکھ کر کمانیوں کو دو تین بار کانوں کے پاس جماتیں اور "قبر کے عذاب" کا صفحہ نکال کر پاس بیٹھی شاگردوں سے کہتیں "چل لڑکی تو سبق سنا ان کی تو باتیں ہی ختم نہیں ہوں گی۔" مگر آج حویلی ویران ہے اور وہ گدی جس کے لیے عائشہ بی بی نے اتنا کچھ کیا تھا اس گاؤں کے پیروں کا گھر بن چکا ہے اور حویلی میں دلاور علی کے شکاری کتے بندھتے ہیں۔

بہن جی گدی والے سیدوں کی بڑی بیٹی تھی۔ سید صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی اسی لیے انھوں نے اپنے بعد اپنے بڑے داماد مولوی صمد کو اس گدی کا جائز وارث قرار دے دیا۔ ان کے ہوتے ہی بہن جی اور مولوی جی نے یہاں رہنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی سیدانی اللہ بخشے بڑے دل والی تھیں۔ سارا گاؤں ان سے ڈرتا اور دبتا تھا۔ ہم نے انھیں گاؤں میں کسی کے گھر جاتے نہ دیکھا۔ کبھی اپنی ڈیوڑھی تک آتے نہ سنا۔ مگر گاؤں کے کسی گھر میں بیاہ ہو اور سیدوں کے گھر سے لڑکی کے لیے جوڑا اور

بھوکے پیاسے سلامی کے روپے نہ آئیں ناممکن۔ کسی کو روپے پیسے کی ضرورت ہو بے کھٹکے ان کا دروازہ جا کھٹکھٹائے۔ بی بی جی کسی کو خالی ہاتھ نہ پھیرتی تھیں۔ گاؤں میں ساس بہوؤں کی لڑائیاں ہو جائیں تو معاملہ ان تک پہنچتا، وہ گاؤں کی بادشاہ تھیں۔ دھان پان نازک سی عورت، ان سے باتیں کرتے ہوئے یوں لگتا جیسے کوئی بڑی خوبصورت کہانی سن رہے ہوں۔ ماں نے بتایا تھا کہ میرا نام بھی بی بی جی نے رکھا تھا۔ انھوں نے مجھے گود میں لے کر کہا تھا یہ لڑکا بڑا بھاگوان ہو گا اور پھر کہا تھا کیوں لڑکی اس کو یہ کہہ کر کیوں نہ پکارا جائے بھلا! بی بی جی کسی کا نام رکھیں اور بچے والے کو خوشی نہ ہو۔ پھر جب میں بڑا ہو گیا، پاؤں چلنے لگا تو ماں مجھے ان کے ہاں لے گئی۔ بی بی جی نے مجھے گود میں لیا تھا اور پیار سے کہا تھا کیوں میاں کیا لو گے اور میں نے سرخ چڑیوں کے ایک پنجرے کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ پھر وہ سرخ ننھی ننھی چڑیوں سے بھرا پنجرہ میرے پاس بہت دنوں رہا۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تب بھی وہ پنجرہ میرے پاس تھا۔ بی بی جی پان بہت کھاتی تھیں۔ پان دان پاس رکھا ہے ہاتھ میں سروتا ہے، باتیں کرتی جاتی اور چھالیا کترتیں۔ میں پاس پڑی پیڑھی پر بیٹھا سوچا کرتا، یہ اتنی تیزی سے قینچی کیسے چلاتی ہیں کیا ان کے ہاتھ نہیں کٹتے۔ ملنے والیوں کو پان بھی نہ دیتیں۔ کہتیں "بی بی یہ بد عادت

مجھے تو اپنی پڑی تھی۔ بارہ میل دُور شہر سے پانی منگوانے میں بہت مصیبت
اُٹھانی پڑتی ہے۔ کوئی اچھی سی شے تو ہے نہیں کہ تم لوگ بھی اسے چکھو۔" حویلی
ہر وقت عورتوں لڑکیوں، مختلف قسم کی شاگردوں سے بھری رہتی۔ اور باہر کے حصے
میں سیّد صاحب کے پاس دُور دُور سے آنے والے مردوں عقیدت
مندوں اور فارسی عربی کے سبق پڑھنے کا ہجوم رہتا۔ جو شخص بھی دوپہر
کے کھانے تک بیٹھا سیّد صاحب اسے کھانے میں ضرور شریک کرتے
کہتے "میاں میرا کیا ہے اللہ کا دیا ہے تم بھی شامل ہو جاؤ۔" اور حویلی کے
اندر کھانے کا کوئی اتنا اہتمام بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ بڑی روانی سے وقت
پر کام ہو رہا ہے۔ کوئی نوکر دو چار، اوپر کا کام دھندا کرنے والی
کی بھرمار نہ ہوتی۔ شاگرد لڑکیاں پڑھ کر فرصت میں سب کچھ پکا کر دیتیں۔
یہ صرف برکت ہی ہوتی ہوگی۔ ورنہ اب سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔
کہ سیّد صاحب کے پاس چالیس آدمی بیٹھے ہیں سیر ہو کر کھانا کھاتے
ہوں اور اندر یوں ہے جیسے بس گھر کے لوگوں کا کھانا پکا ہو۔

عائشہ بی بی بھی میری ہم عمری ہوں گی۔ مگر بلا کی شوخ اور طرار تھیں۔
بی بی جی کہتیں عائشہ سر پہ دوپٹہ رکھا کرو تو وہ اتار کر پھینک دیتیں۔ زمین پر لوٹ
جاتیں۔ جب ذرا بڑی ہوئیں تو حویلی کی ریت کے تحت لڑکی بڑی کی گلی [illegible]
پر پردے لگاتیں اور بی بی جی کے پان دان سے پان چرا کر خوب کھاتیں۔ بڑی

نے گھر میں کبھی نہیں دیکھا۔ سید صاحب کے پاس بچے سپارے پڑھتے اور قرآن
کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے آنے سے دور دور کے گاؤں سے بھی لوگ درس
سننے کو مسجد میں آنے لگے۔ ان دنوں پیپلوں کے سایے میں بڑی رونق ہوا
کرتی تھی۔ مسجد کے پرلی طرف بھی لوگ بیٹھتے تھے۔ پھر میں بڑا ہوا اور دور سے
لایا گیا اور شہر [illegible] نہ جانے [illegible]
مسجد بھی کیسی رہا۔ نمازیوں کی بھیڑ رہتی۔ خدا بخش جسے دادا جی کے لوگ بڑا
بدمعاش سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب کے پاس آنے لگا۔ جیسے جیسے بوڑھا ہوا اس
نے داڑھی بھی رکھ لی اور پانچوں وقت مسجد میں حاضر ہوتا۔ کبیر ستہ
جس کی کچی گلی میں املاس کی دکان تھی، بڑھاپے میں بیٹھتا۔ گرمیوں میں
گاؤں سے نکلے آ کر ان درختوں کے نیچے بیٹھتے۔ عجیب نور برسا کرتا تھا۔
میں مزید تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا۔ زندگی کتنی تیزی سے گزرتی
ہے۔ اور زمانے کی ریت کیسے بدلتے بدلتے آن میں بدلتی جاتی ہے۔
واپس آیا تو شہروں والے محل وال سے گزرتے راستے پر چلتا سوچ رہا تھا۔
نہ جانے گاؤں کتنا بدل گیا ہوگا۔ وہ لاڈو رانی جس کو ہم سب اماں جی کہتے تھے
کیسا ہوگا۔ شہر کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے کبھی میں نے سوچا تھا جب
یورپ میں تھا تو شہروں کے شور و غل سے دور کھلے کھیتوں کی سرسبزی اپنے گاؤں
کی یاد دلایا کرتی تھی۔ مجھے بشیر مستار کی دکان یاد آ جاتی تھی جس کے چبوترے

تھا۔ اور میرے دل میں بے چینی تھی سی بڑھتی سی۔ جیسے منزل کے قریب
آنے پر وفورِ شوق سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چند ہی آدمی سامنے نظر آرہے
تھے۔ اس کے بعد حویلی تھی۔ میں نے اس بیچ گھر خود نہیں لکھا تھا کہ کہیں نا خوش
مجھے لینے نہ رہتی جائیں۔ میرا بابا چھوٹا سا غیر ملکی صندوق اپنے تھے مجھ پر خود ہی اٹھا
چکے تھے۔ اس کے کھال سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ حویلیوں کے سامنے
گنّوں کے ڈھیر لگے تھے جیسے چل رہے تھے۔ رس نکالا جا رہا تھا۔ گڑ بنا رہے
جڑے تھے۔ کھیتوں میں سے نیلا دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں وہ چھوٹا لڑکا تو
نہیں تھا جو ڈھاب میں روشن گلڈی کے لڑکے کے ہمراہ مچھلیاں پکڑتا تھا اور
پھر میں نے نئے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ انگریزی سوٹ میرے بدن پر
تھا۔ چوہڑوں کی بستی کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے فریلی بہوؤں اور نیاروں
نے مجھے دیکھا تو گھروں کی کچی دیواروں پر ٹھوڑیاں ٹکائے وہ مجھے اس وقت
تک دیکھتی رہیں جب تک میں نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ وہی پرانی
[illegible]ی بڑی لکڑیاں گلی کے درمیان حویلی کے سامنے نانی بیری کے درختوں کے نیچے
رونق دیکھی۔ مسجد نہ جانے آج سنسان کیوں تھی کہ دنیا بیروم تھا۔ گلی میں گھسا
[illegible]ں تو وہ پرانے آبادی اور زندگی کے نشان حویلی کی بیٹھکوں میں نہیں تھے۔ کتوں
کے بھونکنے کی آوازیں اندر سے چلی آتی تھیں مجھے ایسا ویران سا ہوتا لگا۔ سرد
[illegible] جیسے اچانک کسی نے برف کی سل میرے دل پر رکھ دی ہو۔ بیٹ ستار

کی دُکان جو ہر وقت کھلی رہا کرتی تھی ٹِپا نے ٹاٹ کے نیچے بند پڑی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا بات ہے گاؤں اُجلا سا کیوں نہیں ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے حویلی سے نکل کر سائے میرا تعاقب کر رہے ہیں اور میں تیز تیز قدم اُٹھاتا اپنی گلی میں مُڑ گیا۔

نانا کوٹھڑی میں بیٹھے تھے۔ نانی گھر پر نہ تھی۔ صحن میں ایک طرف سیڑھیوں کے نیچے چولہے کے سامنے ہماری بہشتن رحمتے روٹی پکا رہی تھی مجھے دیکھ کر وہ اٹھی اور جلدی سے اپنے سر پر چادر سمیٹ کر بولی "بسم اللہ بسم اللہ بیٹا تم کیسے چلے آئے نہ خط لکھا نہ پتا دیا۔ بی بی جی دلاور علی کے گھر کسی کام سے گئی ہیں۔ میں دیوار پر سے آواز دے دیتی ہوں۔ تم تب تک نانا کے پاس اندر کوٹھڑی میں بیٹھو۔ میں جا کے ان سے مل لے۔" نانا نے میری آواز سن لی تھی بولے "آؤ آؤ بیٹا اندر آؤ۔ ارے نہ خط نہ پتر تُو نے مجھے اتنا اپاہج جان لیا تھا کہ میں تیرے لیے سٹیشن تک بھی نہ آ سکتا تھا۔ نالائق تو یونہی چلا آیا ہے، سات سمندر پار سے اور میں تجھے ہار پہنا کر گھر نہ لاتا۔ اِدھر آ میرے سینے سے لگ جا، میں تو تیری راہ دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میری شکل ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے میرے ماتھے پر ان گنت بوسے دیے اور پھر زور سے کہنے لگے "رحمتے جا اس کی نانی کو دلاور علی کے گھر سے بلا لا۔" مگر رحمتے پہلی روٹی کو توے پر ہی چھوڑ کر دلاور علی کے گھر جا چکی تھی۔ جب

میں ممانی نانی کے ساتھ دلاور علی کی بیوی، امی فاطمہ اور خدابخش کی بیوی بیٹھے
ہوئی تھیں۔ بیٹیاں، جوان لڑکیاں سب کوٹھری میں گھس آئی تھیں۔ سب نے
باری باری میرے سر پر پیار دیا۔ جو مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں
جو میرے سامنے پیار کو آئی تھیں انھوں نے سوال پوچھا۔ تین لڑکیاں جو بیاہی گئی
ہیں کر گاؤں میں آئی ہوئی تھیں۔ گھونگٹ نکالے کھڑی تھیں اور نانی میرے
سر منہ کو چوم کر رشتے کو کہہ رہی تھی کہ چارپائیاں لا کر سب کو بٹھانے کا
بندوبست کرے۔ جلدی جلدی لا کے بیچ صاف کی گئیں اور شام کے ڈھلتے
سایوں میں نانا کی بالکل دھندلی آنکھوں کے سامنے ہم سب بیٹھ گئے۔ میرا
سوٹ اور سنہرے بوٹ اس ساری فضا میں کتنے اجنبی لگ رہے تھے۔

میں نے ان ماسیوں، چاچیوں سے خیر خیریت دریافت کی۔ جب وہ سب
چلی گئیں تو میں نے اپنا نیا سوٹ کیس کھول کر نانا کو وہ تحفے دکھائے جو میں
ان کے اور نانی کے لیے لایا تھا۔ آخر میں میں نے سفید ریشمی ململ کی پگڑیاں
نکال کر الگ رکھتے ہوئے کہا: "نانا جی یہ میں سید صاحب اور مولوی محمد صاحب
کے لیے لایا ہوں۔ دیکھیں تو سہی کتنی اچھی ہیں۔" پگڑیوں کو نہ تو نانی
نے ہاتھ لگا کر دیکھا اور نہ ہی نانا جی نے۔ دونوں یوں خاموش ہو گئے
گویا مجھ سے کوئی ایسی بات ہو گئی ہے جسے کہنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا!
جس بات کے لیے میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ میں نے پہلے نانا کی طرف

دیکھا اور پھر نانی کی طرف، اور پھر بولا: "کیوں کیا بات ہے آپ لوگ چپ کیوں ہو گئے ہیں۔ کیا مجھے ان کے لیے کچھ لانا نہیں چاہیے تھا۔"

"نانا بیٹے۔ بتائیں گے ابھی جلدی کیا ہے۔ ہم سب کب کا بیٹھا۔ اس حویلی کے ہم پر بڑے احسان ہیں پر کاش! وہ حویلی والے بھی تو ہیں بھولی بی بی نہیں تو ہم بھی بس زندہ ہیں۔ مولوی صاحب، سید صاحب کوئی تو ہو۔ وہ چپ ہو گئے۔ نانی جلدی سے اٹھ کر دالان کے نیچے چولہے کی طرف نکلتے کے پاس جا بیٹھیں اور میں دونوں ہاتھ اپنے پہلوؤں میں لٹکائے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح میاں جی کی مدھم روشنی میں اپنے چہرے پہ پڑتی ہیر کی ٹکٹکیں اور چپ گریاں لیے کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا سوال کروں۔

"نانا بیٹے بیٹھ جاؤ بیٹا کھڑے کیوں ہو۔ میں تمہارا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ پر اس تکلیف کو پڑھ سکتا ہوں جو تمہاری روح میں غلطاں ہے۔ حویلی والے سب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ ان چند سالوں میں زندگی اپنے محور پہ الٹی گھوم گئی ہے۔ موت گنتے ہوئے قدم بڑھاتی ہے مگر حویلی والوں کو تو اس نے ہڑپ کر لیا ہے۔ نہ جانے کب سے گھات لگائے بیٹھی تھی۔"

"پر یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیونکر ممکن ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ نانا نے میرے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا: "بتاؤ کس راہ سے آئے ہو، کیا تم نے کیسر سنار کی دکان بند نہیں دیکھی۔ کیا تم نے حویلی کے

ہے آلِ رسول ہے اسے تو خدا معاف کرے گا پر تم بچ نہ سکو گے یہاں اللہ کا قہر ٹوٹا ہوتا ہے۔ عورت کہاں؟" پھر اسے کو شہر واپس چلی جائے۔"

دلاور علی بولے،" آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ سیدانی بی بی کی بیٹی ہے۔ اسے تو خدا معاف کرے گا پر میرے لیے دوزخ میں بھی جگہ نہ نکلے گی۔" "ماں جی" اس نے نانی کو آواز دے کر کہا" میں یہاں بیٹھا ہوں۔ برخوردار سے نجی باتیں کروں آپ جا کر عائشہ بی بی کو سمجھا دیں۔ میں مجبور ہوں خدا کی عدالت میں جواب دہی کرنی بڑی سخت ہے وہ مجھے معذور ہی رکھیں۔"

نانی کچھ کہے سنے بغیر اٹھ کر پیچھے دروازے سے باہر چلی گئیں۔ میں نے کہا۔" آخر کیا بات ہے کیا چکر ہے۔ عائشہ بی بی دلاور علی کے ہاں کیسے آگئیں۔ میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا ہے کچھ نہیں آتا آخر یہ سب باتیں کیا ہیں۔ مجھے تو سمجھائیے۔" دلاور علی ماما نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھ کر سر نیچے جھکا لیا۔ وہ بڑا شرمندہ اور پریشان لگتا تھا۔

"نانا بولے" دلاور علی میاں، جس دن حویلی کا سودا چکایا گیا تھا۔ تمہیں اسی دن اس بات کا پتہ لگ جانا چاہیے تھا کہ جس عورت نے اپنے بزرگوں کی نشانی کو تین سو روپے میں بیچ ڈالا اس کی نیت زنگ کیا ہوگی؟ غضب خدا کا سیدانی بی بی کی بادشاہت کا اس طرح سے خراب ہوا کہ عائشہ بی بی کی اپنی بیٹی تمہارے پاس ٹھکانہ چاہنے کے لیے آ گئی۔ اللہ اللہ۔۔۔۔۔"

اور وہ چُپ ہو گئے۔ دونوں میں سے دیر تک کوئی بھی نہ بولا۔ نانا کا دل غم سے
بھرا ہوا تھا اور دلاور علی ماما نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

لالٹین کو مدتوں بعد جلا دیا گیا تھا۔ اس میں تیل کم تھا۔ چمنی پر پہلے ایک سرخی
نامعلوم زردی سی چھانے لگی پھر اس کے کنارے پھٹ گئے اور روشنی کم ہوتی
چلی گئی۔ کوٹھڑی میں بڑا عجیب سا اندھیرا کہیں کونوں کھدروں سے بڑھنے لگا،
دبے پاؤں نامعلوم قدموں سے جیسے ویرانی ہوتے ہوئے اپنے قدم
دھرتی ہوئی ہوا کے نہ جانے پر پھیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہو۔ سامنے کی
ریشمی گڑیاں پڑی تھیں جو میں سید صاحب اور مولوی صاحب کے لیے یورپ سے
لایا تھا۔ کپڑا سفید تھیں زرد لگ رہا تھا اور بجھتی لالٹین کی روشنی میں کسی کفن کی
طرح دکھائی دیتا تھا۔ میرے کانوں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر نانی اندر آئیں آہستہ چلتی ہوئیں جیسے بیماری سے اٹھی ہوں، کہنے لگیں
برخوردار میں نے عائشہ بی بی کو سید صاحب کی روح کا واسطہ دیا ہے، میں نے
اسے کہا ہے کہ تمہاری جان بخشی کر دے۔ شہر میں ایسے بہت لوگ مل
جائیں گے۔ جو نکاح کرنے کو تیار ہوں۔ گاؤں پہ کوئی آفت نہ ٹوٹے۔ مگر وہ
کہتی ہے میں دلاور علی کو ایک بار بھیج دو، میں اس کے منہ سے انکار سننا چاہتی
ہوں۔ سو برخوردار جب سر پہ آ ہی پڑی ہے تو ڈرنا کیسا؟ گھوڑیاں تیار کر دو
کر اِن کی اُڑی اس کے بھجوانے کا بندوبست کر دو۔ دلاور علی ماما کی طرح

ہو گئی ہے۔ سہیلیوں کے بیتے دن، ہائے کبھی بھاگ کر ہی نہیں چھپتا، کتنے ہی چپکے
سامنے میرے لٹتے گئے ہیں۔ حویلی تو دوسرا مرے وال بن گئی ہے۔ اب
تو اس گلی میں سے گزرتے بھی لوگ ڈرتے ہیں۔"

نانی کو جیسے کرن ابھی کی بات یاد آ گئی ہو بولی: "ہائے ہائے میری یاد دیکھو
ابھی تک اس چکر میں پڑے ہیں۔ اپنے بچے کو پانی تک نہیں پوچھا۔" وہ اٹھ
کر پھر باہر چلی گئی۔ ماں مادو نے میرے سر پر پیار دیا۔ اور اٹھ کے پوچھا اور
پوچھنے لگی کہ میں کب آیا ہوں اور میں سوچ رہا تھا: حساب ایک گمان ہے
جس کے دونوں سرے ٹوٹ چکے ہیں پر وہ کونسی شے ہے جو انسان کی
مرضی بنا اسے ان طوفانوں کے حوالے کر دیتی ہے جو بدی کے بیج اپنے
کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ بدی کیا ہے اور سیتلا کی بیٹی عائشہ
جو والدہ علی سے نکاح کر کے حویلی کو پھر سے آباد کرنا چاہتی ہے کیوں
ایسی ہے؟ آخر کیوں .... آخر کیوں ....؟ حویلی آخر ویران کیوں ہو گئی
ہے؟ میرے سامنے نانا کی پائنتی پر پڑی سفید ریشم کی گٹھڑیاں پر بجھتی بتی
کی روشنی میں کیڑے رینگ رہے تھے۔ زرد اور سیاہ سروں والے، جو خون
کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور شاید بدی کے کیڑے ہیں۔ پر یہ بجھتی کرن جانے
انہیں کس نے پیدا کیا ہے .... آخر کیوں .... آخر کیوں؟

گئی تو باپو مجھے گاؤں لے آیا۔

مگر بات تو میں جب کی کر رہا ہوں جب مجھے دتا سنگھ بابا والے سے کشتی لڑنا تھا۔ یاروں نے میرا بڑا دل بڑھا دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا ہماری لاج رکھ لینا۔ وہ سات سمندر پار سے آیا تھا۔ تو شیخیاں بگھارتا ہے۔ اس نے انگریزوں سے کشتیاں لڑی ہوں گی۔ کبھی چھوٹے جنگل والے ہمارے پالتو گھوڑے کے ہاتھ نہیں دیکھے ہوں گے۔ اسے مزا چکھا دینا۔ ہماری ہیٹی نہ ہو۔ شام سنگھ نے میرے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملا تھا اور پھر وہ سارے داؤ مجھے پتے سے یاد تھے۔ اور بات بھی کوئی نہ تھی۔ میں جتنا اپنے جنگل سے بڑے جنگل کی طرف چلا۔ جو گھوڑی میرے نیچے تھی۔ اس کی کمر میرے بوجھ سے جھکی جاتی تھی۔ میں نے آتے ہوئے گھر کے پچیس سال کے پرانے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ میری بیوی نے سر پر سے تیل ماش وارے تھے۔ اور جب میں دروازے سے نکلا ہوں تو مجھے ماں نے بڑی دعائیں دی تھیں۔ پھر جب تک میں گلی کا موڑ مڑ نہیں گیا۔ ہمسائے کی عورتیں ماسیاں چاچیاں ساری کوٹھوں پر سے مجھے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھیں۔ اور ڈھول کی آواز ہمارے گاؤں میں بھی آ رہی تھی۔ دور سے جیسے مکھیوں کا چھتا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے گاؤں کے اوپر سے گزرے یا ٹڈیوں کی فوج اڑتی ہوئی

گزر جائے۔ گاؤں سے باہر نکلے ہیں تو نظر میں سے گزرتے ہوئے ایک سانپ
گھوڑی کے سُموں تلے نہ جانے کس طرح آ گیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے
دُم اور سر کے بیچ میں بیچ دو ٹکڑے۔ اور دونوں حصے الگ الگ تڑپتے
رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے تو تاشنگو کہاں سے واقف جانتا ہو۔ وہ
کس طرح کا آدمی ہو۔ اگر میں نے اُسے گرا دیا تو کہیں وہ میرا دشمن ہی نہ بن
جائے۔ دوست بنانا بہت مشکل ہے۔ میرے دونوں یار شام سنگھ
اور کرتا سنگھ خواہ مخواہ ہر ایک سے الجھ پڑتے ہیں۔ اب یہ دیکھو نا کسی
بات سے یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ایسی باتیں رہ رہ کر میرے دماغ میں آ رہی
تھیں۔ ہوا چل رہی تھی۔ گاؤں کے راستوں اور پگڈنڈیوں پر پتے اُڑ
رہے تھے۔ گندم کے کھیتوں میں کچی بالیاں جھونکوں سے دوہری ہو رہی
تھیں۔ درختوں کے ٹھنڈے سایوں تلے اندھیرا سا لگتا تھا۔ نہر کے
پانی کی آواز کبھی ہوا کی لہروں سے قریب اور دور ہوتی جاتی تھی۔ ڈھول
برابر بج رہا تھا۔ چھوٹے جنگل کے لوگ میرے خاندان والے یہ سب یار
اور ان کے یار۔ جوان ہوتے ہوئے لڑکے۔ جنگل کے لوگ۔ میدان اب نہ
تین چار گاؤں دور کے لوگ تھے۔ میں کوئی ایسا پہلوان خاص نہ تھا جس کی
دھوم دور دور ہو۔ مگر تاشنگو پندرہ سال بعد وطن لوٹا تھا۔ پھر بھی لوگ
اُسے جانتے تھے۔ سفید داڑھیوں والے کہہ رہے تھے۔ لمبے بوڑھے

پنڈتوں والا موتا سنگھو۔ جیتی دکھی اچھیر واس والا۔ اکھاڑے کے پاس
کھڑے بڑے اپنے ننگے پاؤں سے مٹی جھاڑتے۔ ریتی تیل والی چوٹیا
بغلوں میں دبائے ایک دوسرے کو موتا سنگھو کی بات سنتے سر سے
شناسیتے رہتے۔ موتا سنگھو ابھی آیا نہیں تھا۔ اور سورج ہوتے ہوتے
نیچا ہونے لگا تھا۔ اکھاڑے کی نرم مٹی سے سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی اور
گرد کے ساتھ نتھنوں میں جا رہی تھی۔ پاس ہی جوہڑ کے پانی کا ایک
ٹکڑا تھا۔ پانی پر لہریں اٹھ رہی تھیں اور ان کے ساتھ آسمان بھی ہلکورے
لیتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ذرا اور دور سفید بطخیں قطار باندھے چھوٹی چھوٹی
ناؤ کشتیوں کی طرح پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ سیاہ پانی پر
سفید بطخیں۔ کنارے ایک چھدرا سا کھجور کا درخت تھا۔ یہ سب کچھ کتنا
پُرسکون اور صدیوں پرانا لگ رہا تھا۔ بطخیں اور یہ پانی۔ یہ درخت۔ یہ
سب چیزیں کتنی خاموش اور ہمارے وجود سے کس قدر بے خبر تھیں۔
میں سوچتا بھی جاتا تھا اور باتیں کرتے ہوئے ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔
جیسے شکل ذہن میں تھی جیسے کسی پرانے شیشے میں اپنی شکل مجھے کسی اجنبی
کی شکل کی طرح مدھم مدھم یاد آ رہی تھی کیا میری شکل پُررعب تھا؟
پھر ایک طرف سے آدمیوں کی ایک ٹولی آتی دکھائی دی۔ لوگ
موتا سنگھو کو لیے آ رہے تھے۔

اُس نے انگریزی فیشن پر اکھاڑے سے باہر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر ہم دونوں اکھاڑے میں آ گئے۔ چپ چاپ خاموش ہم دونوں دلوں کے شور میں بڑے سکون کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ سے جیتے زور لگاتے رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور پھر بھی اپنی طاقت کا آخری داؤں لگانے کے لیے بے قرار تھے۔ ہوئے ہوئے جیسے کسی مشین کے پیچ کھولے جا رہے ہوں۔ میری طاقت کے بند ڈھیلے پڑنے لگے۔ اُنہاریہ بھی ان سے طاقت ور تھا۔ ہوشیاری سے اپنے دشمن کو پچھاڑنے کی سوچ رہا تھا مگر دراصل چاہتا تھا کہ وہ جیت جائے۔ میں اس سے کہیں چھوٹا تھا۔ پندرہ سال کے بعد وطن لوٹ کر اس کا غرور کیوں ٹوٹے۔ متا سنگھ میرے دل کی بات سمجھ گیا۔ کہنے لگا "یا ان سنگھ جوان میں ستّی جیت نہیں لینا چاہتا کیا تم مجھے اپنے مقابلے کا نہیں سمجھتے جو ہارے ہوئے مجھے جیتنے کا موقعہ دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم سے کس نے کہا میں جیتنا نہیں چاہتا ہوں؟"

تو پھر زور لگاؤ۔

میں سارا زور لگا چکا ہوں۔

ہم ایک دوسرے کو دھکیلتے رہے۔ اُس نے مجھے گرا دیا۔ میرے

کی سی چال چلتی ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔ گلیوں کی نالیوں کو بڑی شان
سے پھلانگتی ہوئی اُن کے گرم سانس کبھی ہمارے منہ پر اور کبھی کانوں کے
قریب آ لگتے۔ ہوا میں دال کی خوشبو تھی اور گرد بھی تھی۔ راستے پاؤں
اور گھوڑیوں کے پاؤں کی آواز سن کر شاید چمگادڑوں کے گھر میں ایک
اُلو چیختا اور پر پھڑپھڑاتا ہوا ایک کوٹھڑی سے نکلا۔ اور ہمارے سروں
پر سے چکر لگاتا دوسری کوٹھڑی میں گھس گیا۔ میرے یار شام سنگھ نے کہا
"مائی دروگی کی آتما ابھی تک روتی پھرتی ہے۔" میرے دوسرے یار نے
دور دور سے جپ جی کی ایک دو پوڑیاں جو اسے یاد تھیں پڑھنی شروع
کر دیں۔ موتا سنگھ نے قدم ذرا تیزی سے بڑھائے۔ شام سنگھ پھر
بولا "کیوں موتا سنگھ جوان یہ مائی دروگی کی آتما ہی ہے نا۔ میں نے سنا
ہے تم پر بھی اس سلسلے میں مقدمہ بن گیا تھا۔ بات تو بڑی پرانی ہے۔
پر کیا بات تھی۔" موتا سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ شام سنگھ بھی چپ ہو گیا۔
اور ہم نیچی دیواروں والے گھروں کے پاس سے گزرتے رہے۔ اندر
کوٹھڑیوں میں دیے جل رہے تھے۔ عورتوں کے بولنے، بچوں کے
رونے، آدمیوں کے کھنکارنے، بیلوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کے
بجنے اور روٹیاں پکنے کی ملی جلی صدائیں ہمارے آگے پیچھے تھیں۔

موتا سنگھ کا گھر آ گیا۔ حویلی کے باہر ہی اس کے بھائی نے ہمارا

اکال کہہ کر ہماری گھوڑیوں کی باگیں پکڑ لیں۔ اور انہیں صحن میں سے جاکر ایک
طرف باندھ دیا۔ بہت سے جوان اکٹھے ہو گئے۔ جو آج سارے کشتی
دیکھنے گئے ہوں گے۔ سب نے چارپائیوں سے اٹھ کر باری باری
ہم سے ہاتھ ملائے۔ آنگن میں رنگین پایوں کے بڑے بڑے پلنگ
تھے اور ان پر نئے کھیس بچھے تھے۔ ہمیں سب سے اونچے پلنگ پر بٹھا کر
موتا سنگھ چوکے کی طرف گیا۔ جہاں چولہے میں تیز آگ جل رہی تھی اور اس
کی بہن کچھ پکا رہی تھی۔ اس کی بوڑھی ماں نے آکر ہمارے سروں پر پیار
کیا اور ہمیں آشیرباد دے کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی
تھی۔ اور وہ دونوں ہاتھ پیچھے اپنی پیٹھ پر رکھ کر جھک کر چلتی تھی۔ اس
کے بالوں میں دیئے کی روشنی سے چمک اٹھتی تھی جیسے چاندی ہو۔ چھوٹی
بڑی بڑی کوٹھڑیوں میں لالٹینیں جل رہی تھیں اور موتا سنگھ کی ولایتی بیوی
اپنے بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ جن سے وہ انگریزی زبان میں بات چیت
کر رہی ہوگی۔ اس کی بہن کے ننھے بچے ایک دوسرے کے کرتے
پکڑے گھوڑیوں کے قریب ریل گاڑی کھیل رہے تھے اور شور کر رہے تھے۔ ان
کوٹھڑیوں میں سے تھال لاکر ان میں کھانا پروس رہی تھی۔ کنبے کی اور عورتیں
بھی چوکے میں بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں لگی تھی۔ پیڑھیوں پر
بچے سو رہے تھے اور عجیب گہما گہمی تھی۔

پھر موتا سنگھ نے ہمارے ہاتھ دھلائے ۔ اور اس کے بھائی نے
ہمیں ہاتھ صاف کرنے کو تولیہ دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر کھانے کے تھال
ہمارے سامنے رکھنے شروع کر دیئے۔ کھُنّے والے بھی دوسرے پلنگوں پر
بیٹھے تھے۔ اوپر تک بھرے تھالوں میں چاولوں پر پیسی ہوئی بورا چینی
پر گرم گرم گھی کے پڑنے سے سوندھی خوشبو بھوک کو اور بھی تیز کر رہی تھی۔
سویاں تھیں اور کھیر تھی۔ ٹھنڈی بھی بڑی مزے دار۔ پراٹھے تھے اور
بھاجیاں تھیں۔ دہی بڑے زبردست ہی لذیذ تھے۔ موتا سنگھ میرے
پاس بیٹھا تھا اور بار بار اصرار کر کے مجھے اور کھانے کو کہتا جاتا تھا۔ دوسروں
سے بھی کہتا۔ اس کا بھائی دوسرے پلنگوں پر بیٹھے کھُنّے والوں کو کھانا کھلا
رہا تھا۔ نائی ساتھ ساتھ پانی دے رہا تھا۔ سب لوگ ڈٹ کر کھا رہے
تھے۔ کھانے کے بعد اس نے ہمیں ملایا کی چائے بڑے بڑے شیشوں
کے گلاسوں میں پلائی۔ چھوٹے نگل اور بڑے نگل کی باتیں ہونے لگیں۔
گاؤں میں ہر کوئی ہر کسی کو جانتا ہے۔ شام سنگھ کہنے لگا "اچھا بھئی
مجھے تو اب گھر جانا ہے۔ سویرے سویرے مجھے جنڈیالے کسی کام
سے جانا ہے۔" موتا سنگھ کہنے لگا۔ "چھوڑو جوان آج رات مل کر
بیٹھے ہیں کون جانتا ہے اگلا دن کیسا آئے اور سورج ہمیں کہاں لے آئے
سارے پیار سے بیٹھے ہیں چار گھڑی باتیں کریں۔ مگر شام سنگھ نہ مانا۔

جب اس نے اپنی گھوڑی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی اور موتا سنگھ
اُسے رخصت کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے
کسی نے کہا - جوان پنڈتوں کے گھر کے قریب سے گزرنا ۔ ذرا بچ کر تو
نکلنے کا دوسری طرف سے ہو کر جانا۔

اچھا شام سنگھ نے زور سے کہا - اور پھر موتا سنگھ سے کہنے لگا۔
کبھی یہ بھی سنا ہے کہ بھوت نکل کے جوان مال ڈنگر کی آتما سے ڈرے۔
تیرا کیا خیال ہے میں بچ کے جاؤں۔

موتا سنگھ کہنے لگا - اگر کسی جوان کا بھوت ہو تو اس سے نہ ڈرو
تو بھی کوئی بات نہیں - پھر یہ عورت کا بھوت ہے - عورت زندہ ہو
تو بھی اور مر گئی ہو تو بھی ڈرنے کی شے ہے - جوان میرا تو خیال ہے۔
جگت سنگھ کی بات مان ہی لو - ذرا چکر پڑے گا تو کیا ہے دوسری طرف
سے ہی نکلے جاؤ۔

تم بھی تو ڈر کر ہی ملایا چلے گئے تھے نا ۔ اور اب پندرہ سال کے
بعد لوٹے ہو۔ شام سنگھ نے گویا چڑانے کے لیے کہا۔

ہاں ایسا ہی سمجھ لو - موتا سنگھ نے کہا - پندرہ سال بعد اگر اب
بھی مجھے رام دئی دکھائی دے جائے تو میں پھر بھاگ جاؤں گا - میں
مال ڈنگر کی آتما سے نہیں ڈرتا۔

تبھی موتا سنگھ پلنگوں پر بیٹھے ہوؤں میں سے کسی ایک نے کہا۔
تم بابا جی چلے گئے تھے پر ہمیں اس بات کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ جب
مقدمہ ختم ہو گیا تھا پھر بابا نے تمہیں کیا کہا تھا تم کہاں کیوں چھوڑ گئے۔ اب
یہ بات چل نکلی ہے تو ہمیں بتاؤ آخر کیا بات تھی؟

شام سنگھ گھوڑی سے نیچے اتر آیا۔ بولا چلو بتا دیتا ہوں۔ پھر۔ تو میں کبھی
نہیں جاتا۔ جٹ بابے کا کام بڑا ضروری ہے۔ پھر اب یہ بات سن کر
ہی جاؤں گا۔ موتا سنگھ چپ چاپ آ کر دایں پلنگ پر بیٹھ گیا۔
اس کے بھائی نے حویلی کے بہت بڑے صحن میں چار پائیاں دوسری
طرف بچھا دیں۔ بھگت سنگھ بولا۔ دیا نے ہماری باتیں کب ختم ہوں۔
پچھے ہے، رام جوں سے کیوں نہ باہر والی حویلی میں چلیں۔

حویلی میں ہوا بہت میٹھی لگ رہی تھی۔ غبار میں چھپے دونوں کا
چاند ڈوب رہا تھا۔ ہوا میں کوئی آواز نہ تھی۔ یہ بھی لگتا تھا جیسے ایس
سے سہانی بانسری کی میٹھی دھنیں کانوں میں پڑ کر شہد بن کر خون میں گھل جاتی
ہیں۔ بابا کی شراب کی دو بوتلیں کسی کنواری کے ہونٹوں کی طرح پیار دے کر
رہی تھیں ہم ہولے ہولے گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔ ہوا کے ساتھ نشہ
تیز ہو رہا تھا۔

موتا سنگھ نے اپنا ترتیب کھنکالی۔ ایک جیکی بھری اپنی بڑی

بڑی مرتبہ مونچھوں کو مروڑا۔ اور خاموش ہو کر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔

شام سنگھ کہنے لگا کیوں ہوتا سنگھ چپ کیوں ہو۔ رات بیت رہی ہے جوان اگر تو بول نہیں سکتا تو چل پھر ہی تو جاؤں۔ ہوتا سنگھ نے بڑے دکھ سے سر اٹھا کر ہوتے ہوتے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ سن یار وہ باتیں تو بیت ہی جاتی ہیں پھر نہ جانے کیوں دکھ نہیں چھوڑتا۔ اور دکھ کے ساتھ مرنے والے کی آنکھیں کیوں یاد آ جاتی ہیں۔ ست دیو کو تم سب نے ہی دیکھا تھا۔ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

اوئے یار تمہارا تو کیا ڈال رہا ہے۔ ست دیو کو تو ہم سب نے دیکھا تھا پھر آگے بھی تو کوئی بات کر۔ جگت سنگھ چڑ کر بولا۔

پنڈت جی کو بھی تم سب جانتے ہو۔ پر کچھ نہیں آتا۔ رام وتی کو دنگی نے کیا کھا کر پیدا کیا تھا۔ کبھی نشی کے پاٹ پر کبھی سادھو کے کولہو پر کبھی جسونت سنگھ کے عراس پر۔ سب جگت جنتی بھگتی رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں گھوما کرتی تھی۔ اُن دنوں سادھو کا لڑکا چندر چار روشن کلتا آر کر آ بیل مرغ کی چال چلتا تھا۔ یہ سارا رام وتی کا جادو تھا۔ ماں اور نانی کی طرف سے بھٹکا کر رام وتی نے بھی کچھ جانا ہی نہیں۔ بڑی ڈھیٹ تھی۔ وہاں بیٹھے آئی ہے تو بھولا بھی ہی جاتے

ڈالے تیزی سے نکلتی جاتی ہے۔" میری ماں کہا کرتی تھی بہن! رقایا پتہ نہ
جانے کس کس کو خراب کرے گی۔ پنڈت جی آپ مر گئے اس جنگلی بیل
کو چھوڑ گئے۔ دوسری بیٹیاں بھی تو ہیں۔ نہ کسی پیسے کو ہاتھ لگاتی ہے نہ
کوئی اور کام کرتی ہے۔" جہاں دو چار لڑکیاں چارپائیاں بچھا بیٹھتیں، رادھا کی
خوبی اور اس کے ڈھنگ کے ساتھ ساتھ رام دلی کا ذکر ضرور کرتا۔ وہ پھر
کو جب ہماری ڈیوڑھی میں ساری حویلی کی عورتیں اکٹھے بیٹھ بیٹھے کا
کر بیٹھتیں تو رقی وہاں سے گزرتی کبھی نیم کاٹنے کے لیے چارہ
لاتی اور کبھی گیہوں پسوانے جاتی۔ کبھی سر پہ اپلوں کا ڈھیر لگے ہوئے
کانوں سے بہری بنی کسی کی بات بھی نہ سنتی۔ اور پھر اگر کوئی آواز دیتی
"اماں ورگی۔ بات تو سن۔" اس نے کبھی ٹھہر کر رک کر کسی سے بات
کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اپنی دوپہروں کو رام دلی لمبی تان کر
سوتی۔ یا پھر گلی میں سے گزرتی تو لڑکوں کو دیکھ کر یوں ٹھٹک ٹھٹک کر چلنے
لگتی۔ گویا کوئی پیچھے آ رہا ہو۔ آنکھ بچا کر اشارہ کرنا۔ سینے کو ابھار کر چلنا۔
یہ ساری باتیں نہ جانے اس نے کس سے سیکھی تھیں۔

بھگت سنگھ بولا: "یہ باتیں تو سب کو معلوم ہیں یار۔ کیا مجھے نہیں
پتہ کہ وہ کنوئیں پر آنے جانے والوں سے بھی یارانہ گانٹھتی تھی۔ چولہا
نیچے والے راستے سے کھیتوں کے بیچ منت ٹھے جاتے۔ وہ نہ جانے کس طرح

کی ٹھیاں ۔ سب کچھ بس یوں اس کے پیچھے سے جھاڑ لیتی تھی ۔ کبھی
دین دیال سے اُلجھی ہوئی اور کبھی کسی سے ۔ انھیں دنوں تو نہ جانے کہاں
سے اس نے بڑا چمکدار اور پھولوں والا بٹن ٹکا ۔ دوپٹہ لیا تھا ۔ اور
پہن کر میری بہن کے پاس دکھانے آئی تھی ۔ میری ماں نے اس کے جانے
کے بعد بہن کو گالیاں دی تھیں اور کہا تھا " اگر میں نے پھر تجھے اس لڑکی
سے بات کرتے دیکھ لیا اور تیری سہیلی بن کر یہ میرے گھر آئی تو تیری
ٹانگیں توڑ دوں گی ۔ "

ہاں تیری بہن کا آدمی سنا ہے مارا گیا تھا ۔ موتا سنگھ نے کہا ۔ مجھے
ملایا میں کسی نے بتایا تھا ۔

عورت کا چکر بڑا ظالم ہوتا ہے سیٹھی ۔ اس کا پہلے سے ہی اس عورت
کے ساتھ تعلق تھا ۔ اس کے خاوند نے میرے بہنوئی کو مار دیا ۔ یہ عورت
ذات اس سے بڑا ناتا جلانے لگے ۔ بیچاری میری بہن ایک بچے کو لیے
بیوہ ہو کر زندگی گزار رہی ہے ۔

موتا سنگھ بولا ۔ صبر اور شرم کی حدیں ہوتی ہیں ۔ تمھاری بہن اسی طرح
زندگی گزار دے گی ۔ اور رام دلارے نے ست دیو کے بعد بھی صبر نہ کیا ۔ جل
میں اس کا بیاہ میری ماں اور ماسی کی کوششوں سے ہوا تھا ۔ انھوں نے
ذہنی لڑکیوں اور لڑکوں کو قصوروار رکھنے کے لیے پنڈت جی سے لگاؤ کی طرح

ایک پُن کا کام کرنا ہی اچھا سمجھا۔ دُرگا کا بھروپیہ اس کے بیاہ کے بعد اور
بڑھ گیا۔ وہ اپنے ننگے پاؤں کی بوائیوں کو سنبھال کر گھاس چارہ لاتی۔ اور
رام دئی کو مکھن ملائی سے روٹی کھاتے دیکھ کر اپنی روکھی سوکھی روٹی
نگلتی ہی خوش رہتی۔ سفید گائے کی طرح اُسے گھر اور گھر کے آدمیوں
سے بڑا لگاؤ تھا۔

ایسا ہی بڑا لگاؤ ستدیو کو رام دئی سے تھا۔ اس کے لیے رام
دئی کے سفید چہرے کی آنکھیں ہی سب کچھ تھیں۔ بھگت سنگھ بولا مگر یہ
بتاؤ کہ تم آخر کس طرح پھنسے تھے؟

رام دئی کی لڑکی پانچ سال کی تھی جب میں پہلی بار پنڈتوں کی
ڈیوڑھی میں گیا ہوں۔ ستدیو دوسرے گاؤں سے دھان چھاڑنے
کے بعد لوٹا تھا۔ اور گیانی بھٹار سنگھ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کو حویلی
میں رُک گیا تھا۔ اور جاتے ہوئے وہ مجھ سے کہنے لگا بیلی یار اب تجھے کھیر کھلاؤں۔
گھر میں پہنچے ہیں تو چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ لڑکی پیڑھی پہ بیٹھی اپنی گڑیا
کو کپڑے پہنا رہی تھی۔ دُرگا دیئے کی مدھم لو میں بیٹھی چرخہ کات رہی
تھی اور رام دئی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے دُرگا کو رام رام ست کیا۔
مگر اس نے نہ آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور نہ ہی جواب دیا۔ ستدیو
نے دھان زور سے چوکے کے اوپر پھینک دیئے۔ کپڑے اور جھاڑتا

ہنس مُکھ بڈھے کے پاس بیٹھی لڑکی سے کہنے لگا۔ "نی مُنّی" تیری ماں کہاں
ہے۔ منّی نے اپنی گڑیا کو پیار سے پیڑھی پر رکھ دیا۔ اور ڈری ڈری باپ
کی طرف تک کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ پھر بولی بابا وہ وہیں اندر ہی
ہیں۔ اُس نے کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ بابا مت جانا اگر میں اندر آئی
تو وہ میرا گلا گھونٹ دے گی۔

ستّ دیو نے بڑی پریشان نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گھبرائی
ہوئی اور شرم سے جھکی آنکھوں سے اور پھر ہوتے ہوئے بیمار کی طرح چلتا
کوٹھڑی کی طرف گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ستّ دیو نے کواڑ کو ہلا
کر کہا۔ ولی میں آیا ہوں باہر آؤ۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ میں چرخے
کے پاس حیران تھا۔ ڈری چرخہ کات رہی تھی۔ اور چھوٹی لڑکی آنگن میں
کھڑی کوٹھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ دوسری
بار پھر اُس نے کہا۔ ولی میں آیا ہوں باہر آؤ۔ دروازہ چوں چوں کر کے
اپنی چوکھٹ پر گھوم گیا۔ اور بھڑے ہوئے پٹ کو پیچھے ذرا سا کھول کر ولی
نے جھانکا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ کرتا پیٹ کے اوپر اٹکا ہوا تھا۔
اور دوپٹہ کندھے پر سے ہو کر دوسری طرف نیچے لٹک رہا تھا۔ اُس نے
دروازہ پھر بند کر دیا۔ ستّ دیو لالہ میں اندر گیا ہے دروازہ کھول آیا
کا سانس اُس کے گلے میں اٹکا ہوا لگتا تھا۔ اور آواز سینے کے اندر سے

کہیں جیسے پاتال سے آ رہی ہو۔ بڑی بوجھل تھی۔ ورگی نے میرا بھی لحاظ نہ کیا۔
ہنس کر بولی۔ کہو بیٹے تجھے اس سے کیا کہ اندر کون ہے۔ بڑا آیا رعب
ڈالنے والا۔ اس نے آنکھیں میچ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے وہ اس وقت
ایک سانولا سا مگر تازہ پھول لگ رہی تھی۔ اس کے گرد تازہ خوشبو تھی۔
جیسے دودھ کی بالٹی میں سے آیا کرتی ہے۔ ایسی سفیدی جیسے دودھ
دوہتے ہوئے جھاگ میں ہوتی ہے۔ اس میں زندگی اُبلی پڑتی تھی۔ اس
کی آنکھوں میں مستی تھی۔ جو ہر شراب اور ہر دارو سے بڑھ کر تھی۔ نہ جانے
اس میں کیا تھا۔ اس کا کُرتا پیٹ پہ اٹکا ہوا تھا۔ پریشان بال۔ ڈھلکا دوپٹہ۔ اگر
تم میں سے کوئی اس گھڑی اُسے دیکھتا تو اپنا سارا کچھ واری کر دیتا۔ وہ ورگی
سے چوکھٹ کے قریب آ گئی اور بولی اس ڈائن نے بتایا ہو گا۔ تمہیں بلا کر
لائی ہو گی۔ یہ میری جان کی دشمن ہے۔ کتنی مرتی بھی نہیں۔ چڑیل نہ جانے
میری جان کب تک کھائے گی۔" اور اس نے چوکھٹ کو زور سے لات
ماری۔ ورگی نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اوپر اٹھتے مجھے اور ست دیو کو دیکھا۔
اس کے اوپر اٹھتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں میں اٹکا ہوا اس کے گلے کا تاگا ابھی تک
نہیں ٹوٹا تھا۔ میں نے رام دئی کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ بس یہی میں صرف
یہی کر سکا۔ ست دیو چوکھٹ کی طرف چلا گیا۔ اور وہ ایک لمحہ کاش وہ
ایک لمحہ نہ آتا۔ جب میں نے رام دئی کو پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ اور وہ

وہ ساری خوبصورتیاں، خوشبوؤں اور خوشیوں سمیت، میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ وہاں دیپک کی مدھم لو کے سنگم پر ایک گھڑی میں۔ درگی اور ست دیو کے ہوتے ہوئے میں نے اپنا سب کچھ ہار دیا۔ مجھے کتنی شدت سے احساس ہوا تھا کہ میں رام دلی ہی وہ عورت ہے جس کے لیے میں دیوانہ ہوں۔ جس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں آج تک گاؤں کی دیویوں کے پیچھے پھرتا رہا ہوں۔

دوسرے لمحے ست دیو نے چولہے کی راکھ کی ایک مٹھی اس کے پریشان بالوں میں ڈال دی اور کہنے لگا: "تم نے جو کچھ کیا ہے۔ جا! اب میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تجھے سنبھال نہیں سکتا۔"

رام دلی بولی میں اس سے آگے بڑھ کر ست دیو کو اسی طرح لات نہیں ماری جس طرح اس نے درگی کے چہرے کو ماری تھی۔ میں بال بچا گئی اور بولی میں اس کا بدلہ تجھ سے ضرور لوں گی۔ درگی نے لاتیں چھوڑ دیا۔ اور رام دلی کو گلے لگا کر زور زور سے بین کرنے لگی۔ پھر تو سارے گاؤں کی عورتیں کوٹھوں پر چڑھ کر دیکھنے لگیں۔ جودھرانی اپنا لہنگا سنبھالتی آئی اور تھوڑی دیر میں سارا آنگن عورتوں سے بھر گیا۔

چھوٹی رادھا بھی گھبرا کر ایسے صحن میں یوں کھڑی تھی جیسے سہمی ہوئی ہو۔ اور گائے اس سارے شور سے گھبرا کر بار بار سر کو زور سے جھٹکتی

اور پھر سب ہارے تھکے تھے۔ ست دیو بڑا خاموش دھان کے ڈھیر کے پاس
بیٹھا تھا۔ جیسے اس سارے تماشے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔
دیو تو بیاسے کب کا کھونٹی سے نکل کر جا چکا تھا۔

میں مہینوں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر رات کو تی کے لئے پڑا رہا
ہوں۔ کڑاکتی سردیوں میں۔ برستی بارشوں میں نہ جانے کیسے کیسے تھوڑوں
سے رام دلی سے ملتا رہا۔ ہر رات اسے دیکھ کر میرا دل ایسے دھڑکتا
جیسے باہر نکل جائے گا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ بیاہتا عورت ہے۔
کلائی بھی ہیں۔ زمانے کی اونچ نیچ سے واقف مردوں سے واسطے
ہاتھوں میں بیلنے والی۔ میں ان دنوں پاگل ہو گیا تھا۔ وہ مجھے کنواریوں سے
زیادہ اچھی اور پتی ورتا عورتوں سے بھی اونچی لگتی۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔
جھنڈیا سے ہر جیسے رات کو لوٹ آتا۔ سارجو کے باغوں کے
پاس سے گزرنے والے پل پر سے بھی مجھے ڈر نہ تھا۔

سیدھا سادہ اور بڑا ہی ڈھکی ست دیو ہم سب کو دوست
سمجھتا تھا۔ اس کے جی میں دکھ گھن کی طرح اس کے سارے وجود کو
چاٹ رہا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اور گیان بگھار کر شکوے سے چہلیں کرتا۔
اس کے چھیڑوں کا جواب دیتا۔

وہ اکثر دوسرے گاؤں میں کام ڈھونڈنے چلا جاتا۔ اور ایک

ایک اوورٹ کر دم آتا۔ مگر میں اس کے نہ ہونے سے کوئی کمی نہ ہوتی
صرف اس کا کالا کتا اس کی غیر موجودگی میں بہت کم سوتا تھا۔ اور ڈیوڑھی
میں بیٹھا اونگھتا رہتا۔ رام دلاری کو میں نے ساڑھیاں لا کر دیں۔ رول گولڈ
کے چمکیلے چھوٹوں والے سوٹ جو میری بیوی کے پاس بھی نہ تھے۔
خوشبودار تیل۔ میموں کے استعمال کی جتنی بھی چیزیں جنڈیالے کے
دکاندار بڑے شہر سے لاتے ہیں۔ اس کے لیے لے جاتا۔ میں نیا
کپڑا دیتا کہ اس کے چہرے پر ایک خوشی سی اڑ آتی۔ وہ نیا شراب کے
جھاگ کی طرح آتی اور پھر بیٹھ جاتی۔ ذرا دیر اسے نیا کپڑا پہنے دیکھتی تو بس
دیکھتی ہی رہ جاتی۔ وہ اسے کبھی کچھ نہ کہتی تھی۔ رام دلاری کو دیکھ کر ان
دنوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ صرف اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ اچھے
کپڑے پہنے اور زور زور سے ہنسے یا چیزوں کا شوق کرے۔
مجھے تماشے میں کام کرنے والی عورتوں سے بھی زیادہ وہ اس وقت اچھی
لگتی جب میرے پاس آنکھیں میچ کر بیٹھ جاتی اور کہتی بوجھو تو میں کیا
سوچ رہی ہوں؟
جگت سنگھ بولا۔ اس سے زیادہ بے شرم عورت دنیا میں کبھی
پیدا نہیں ہوئی۔ لگتا ہے تم اب تک اس کے جادو میں بندھے ہو۔
منا سنگھ نے شراب کی زبان کا چٹخارا بہت سی اپنے حلق میں انڈیل

پی۔ اور پھر منہ بند کرتے ہوئے اسے گلے سے نیچے اتارنے لگا۔ اور پھر بولا۔ "بس رام دئی اس شراب کی طرح تھی۔ صرف میں اُسے پی نہ سکا۔ میں اُسے حلق سے نیچے اُتار نہ سکا۔ وہ بہت تیز تھی اور بہت نشہ آور۔"

"اور اسی نشے میں تو تم نے ست دیو کو مار دیا تھا"۔ جگت سنگھ نے تلخی سے کہا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔ اور ایشر داس اسے بہانے بہانے بیاس پار لے گئے تھے۔"

"یہ بات تو تب تھی۔ جو تم رام دئی کو اپنے ساتھ ملا لے جاتے اُسے یہاں دوسروں کے لیے چھوڑ گئے۔"

موہن سنگھ پھر نشے میں بہکے ہوئے آدمی کی طرح بولا: "دوسرے اس کے لیے بنے تھے۔ وہ دوسروں کے لیے نہ تھی۔ اگر میں بزدل نہ ہوتا۔ اگر مجھے اپنی زندگی کا اتنا خیال نہ ہوتا۔ تو شاید میں آخر تک اس کے ساتھ رہتا۔ مگر میں سدا کا ڈرپوک ہوں۔ بھگوڑا۔ رام دئی مجھ سے بہت اونچی تھی۔ آخری دن وہ حویلی کی دیوار سے لگی ہوئے ہوئے ہنس رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی ست دیو کی موت کے چھ ماہ بعد تم مجھ سے آج پوچھتے ہو۔ کہ میں نے اُسے کیوں مروا دیا تھا۔

چاند کی مدھم روشنی میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک رہے
تھے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور وہی دیوانہ کر دینے والی خوشبو
— زمین کی سوندھی خوشبو دودھ کی مہک میں اتر رہی تھی۔
اور جب تم نے ست دیو کو مارا تھا تب بھی تمہیں یہ خوشبو یاد رہی ہوگی۔
جگت سنگھ ہولے سے بولا۔

ست دیو کو میں اور ایشر داس کام کرنے والی باقی ٹولی سے دور
لے گئے تھے۔ شام کے سائے بیاس کے پانی پر اندھیرا اور سرخی
بنے ڈول رہے تھے۔ وہ بہنے والی کڈی کے قریب جانے
سے گھبرا رہا تھا۔ کہنے لگا یار موت سے گرو میرا تو دل ڈر رہا ہے۔ چلو
واپس چلیں۔ میں تھک گیا ہوں۔ میری انگلیوں سے تو جان نکل رہی
ہے۔ مجھ سے اور کام نہیں ہو سکتا۔ ایشر داس اس کے قریب گیا۔
ہنسا اور اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر اسے گرا لیا۔ کہنے
لگا آ دیار انگلیوں سے جان نکل گئی ہے۔ باقی جان بھی نکال دیں۔ گرنے
کے بعد تک ست دیو یہی سمجھتا رہا کہ ہم اس سے ٹھٹھول کر رہے ہیں۔ مگر
جب ایشر داس نے اسے دبوچ لیا۔ اس کا گلا دبانے لگا تو ٹوٹتی
سانسوں میں ست دیو نے کہا۔ "بابے دو یار میرا کیا ہے جو کہو گے وہی
کروں گا۔ عورت کے پیچھے میری جان کیوں لیتے ہو۔ کہو گے تو واپس

گاؤں کبھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے مار دو۔" میرے ہاتھ کانپ رہے تھے
اور میں ان جانے ہی ہوتے ہوئے ایشرداس کو پیچھے سے کھینچ رہا
تھا کہ ست دیو کو چھوڑ دے۔ مگر انسان کی محبت کے مقابلے میں عورت
کی محبت جیت گئی۔ رام وتی کی جادو کرتی ہوئی آنکھیں میرے دماغ
میں گھوم گئیں۔ وہ آنکھیں کہ جب وہ اٹھتیں تو ان پر واری ہونے کو
جی چاہتا تھا۔ میری ساری جان نہ جانے کہاں سمٹی کانپ رہی تھی۔ کہ
میں ایک آگ تیرتی ہوئی اپنی رگوں میں محسوس کر رہا تھا۔ رام وتی سے
ملنے کے لیے میرا دل تڑپ رہا تھا۔ اور ایشرداس کے نیچے ست دیو
بے قابو ہو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ ایشرداس نے کہا: "ارے موتا
سنگھ تو بھی تو رام وتی میں میرا شریک ہے۔ سالے گلے کو مارنے
میں میرا ساتھ دے۔"

میری کانپتی جان اور رگوں کی آگ ایک دم ٹھنڈی ہو گئی جیسے
مجھے منزل آ گئی ہو۔ میں نے کہا چل یار میں رام وتی میں حصہ نہیں لگاؤں
گا۔ تو اس کا کام ختم کر۔ گلا تو تو نے پکڑا ہوا ہے۔ میں اس کا کیا کروں۔
جلدی کر جلدی۔" ایشرداس اور ست دیو برابر کے جوان تھے۔

ہمارے قریب ست دیو کا جسم پہلے تڑپتا رہا۔ اور پھر ٹھنڈا
ہو گیا۔ ہم وہیں کھیتوں میں چھپے آنے والی ریل کا انتظار کرتے رہے۔

جب گاڑی کی بتیاں دُور سے دکھائی دیں۔ تو میں نے اور ایشر داس
نے ست دیوی کو اٹھا کر پٹڑی پر رکھ دیا۔ انجن سے سیٹیاں سُنائی دیں۔
نیچے دریا میں بتیوں کا عکس تڑپ رہا۔ اور لہروں میں سائے ڈولتے رہے
جیسے پل پر سے جِنوں کی فوج گزر رہی ہو۔ کیسے اس وقت مجھے
اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔ مجھے ڈھاب یاد آ رہی تھی۔ اور کنارے کے
کھیت یاد آ رہے تھے۔ میرے دل پر جیسے کسی نے منوں بھاری
پتھر رکھ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا یہ پتھر کوئی اٹھا دے۔ اور میں ہلکا ہو
کر بھینس پر بیٹھ کر ننگ دھڑنگ ایک چھوٹا لڑکا بن جاؤں۔ بیریوں
پر چڑھ کر بیر اتاروں۔ امرود چراؤں۔ مگر یہ ساری باتیں پیچھے رہ گئی تھیں
میرے گلے میں دُکھ تھا۔ اور اپنے بیتے دنوں کی یاد تھی۔ پر ہر یاد کے
پیچھے جیسے اس کا سایہ ہو۔ رام دئی کی آنکھیں ابھر آئی تھیں۔ سانپ
نے چڑیا کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ گاڑی رُک گئی۔ انجن کے نیچے آ کر
ست دیوی کی لاش کے دو حصے ہو گئے تھے۔ پر ریل ایسے جنگل میں
کب تک ٹھہرتی۔ اپنے راستے پر چلی گئی۔ ہم نے ست دیوی کا سر اُٹھا
کر وہیں پُل کے نیچے گڑھا کھود کر دبا دیا۔ اور خود واپس آ گئے۔

"دو مقدمہ کس نے چلایا تھا یار؟" میرے یار شام سنگھ نے بہت
دیر کے بعد پوچھا۔

تھا ایک رام دتی کی برادری کا آدمی اسے نہ جانے کیسے شک
ہو گیا کہ ست دیو کو رام دتی نے مروا دیا ہے۔ موتا سنگھ نے جھومتے
ہوئے سے کہا۔ مجھے یاد ہیں سے ایک شراب کے نشے میں بہکے
ہوئے آدمی کی طرح گزارے ہیں۔ تم میں سے کسی نے رام دتی کو ایسے
قریب سے نہیں دیکھا۔ وہ جادوگرنی تھی۔ مقدمہ ہونے کے بعد پتہ
چلا ہے کہ رسا دھو کا لڑکا چندھا منشی ایشر داس بھی گیانی تیج سنگھ چودھری
بانٹھا۔ سنت سنگھ۔ سارے ہی کسی نہ کسی وقت رام دتی کے جادو
میں آ چکے ہیں۔ جب میرا نام بھی آیا تو میری ماں نے کہا تھا یہ ڈائن
ہے۔ ڈائن میرا گھر بھی کھائے گی۔ مقدمے کے دنوں میں جب مجھے
اپنی زندگی اور موت کا پتہ نہیں تھا۔ جب سارے دو مہینے بیت گئے
تھے۔ اور باپو سارا وقت مجھ سے کبھی آنکھیں ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔
رام دتی سے ملنے کی سوچا کرتا تھا۔ پاگلوں کی طرح ہر وقت اس کے
سپنے دیکھتا رہتا تھا۔ جیل کی کوٹھڑی میں اور باہر بھی میرے دماغ
میں سوائے اس کے کچھ نہیں تھا۔

مگر تم تو بہت جلدی جیل سے نکل آئے تھے۔ تمہاری ضمانت
ہو گئی تھی۔ بھئی۔ بھگت سنگھ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

ہاں پھر ایشر داس کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ اور میں وعدہ معاف

گواہ بن کر چھوٹ گیا۔ تب ایک رات رام وتی نے ہنس کر مجھے کہا۔
تمہیں ست دیو کبھی یاد نہیں آتا۔ اور میں نے اپنے آپ کو بھی ست دیو
کی طرح دیشرداس کے نیچے تڑپتے اور پھر ریل کے انجن کے نیچے دو
ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ میں ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ میرے بالوں میں
سردی کے باوجود پسینہ آ گیا۔ جفتے جفتے میں چپ ہو گیا۔ اور پھر
دوسرے دن کے چڑھتے سورج نے مجھے ننگل سے دور، جنڈیالے
سے بھی دور ریل میں بیٹھے ان باقی زمینوں سے پرے بھاگتے پایا۔
بڑی دیر کے بعد بھگت سنگھ نے کہا۔ تمہارے جانے کے بعد
رام وتی جیسے بکھر گئی تھی۔ چند روز وہ بالکل خاموش رہی۔ پھر اس
نے منڈی کے جوان چودھری کو نہ جانے کیسے پھانس لیا۔ بس ان
دونوں کو گلیوں میں روتے اور لڑتے سنا ہے۔ اس کی بیٹیاں ابھی
رہتی ہیں۔ سفید کالے رام وتی نے بیچ دی تھی۔ اور ہوتے ہوتے گھر کا
سامان بھی وہ ٹھکانے لگا رہی تھی۔ چودھری کو منڈی سے آتے بڑی
تکلیف ہوتی ہو گی۔

ارے یار جو آدمی روز رات کو منڈی سے آ سکتا ہے اور پھر
دن چڑھے واپس بھی اس کے پاگل ہونے میں کیا شک ہے بھگت
سنگھ نے کہا۔ گاؤں میں ان دنوں کتنی ہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ ۔۔۔

روز چوپال میں سارے بڑے بوڑھے اکٹھے ہوتے تھے پر رام دئی اور
درگی سے کون بات کرتا۔ دونوں ودھوا اور بے سہارا استریاں۔ لوگوں
کو ان دونوں سے زیادہ مرے ہوئے پنڈت کی آتما کی شرم تھی۔ جھگڑو
نے منشی کی مہربانی سے انہیں کھلوایا تھا۔ بوڑھی زبان دراز اور تیز
بے لحاظ عورت تھی۔ اب تو بوڑھی ہو گئی ہے نا۔ پر مرنے میں چند
سال اور لے گی۔ درگی نے چپ چاپ یہ بات سنی اور جواب دینے
کی بجائے ڈیوڑھی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ رام دئی نے کہا اچھا بھائی
میں تو اب یہی گاؤں چھوڑ رہی ہوں۔ تو نے یہاں آنے کی ناحق تکلیف
کی ہے۔"

چودھری کے گڈے آنے اور بیچنے سے جو سامان باقی بچا وہ
رام دئی اپنے ساتھ لادی لے گئی۔ گڈے پر بیٹھتے ہوئے اس کی
آنکھوں میں نہ آنسو تھے۔ اور نہ چہرے پر رنج لگتا تھا۔ جیسے وہ
مسافروں کی طرح آئی تھی۔ چند دنوں گاؤں میں رہی اور اب اٹھ کے
جا رہی ہے۔ جب درگی کا چرخہ بھی گڈے پر رکھنے لگے تو وہ ٹوٹ کر
رو دی۔ اس نے ڈیوڑھی کی مٹی اپنے سر پر ڈال لی اور بین کر کے
اس گھر اور پنڈت کو آوازیں دینے لگی۔ اس کے لیے یہ گھر ساری
دنیا تھا۔ اور یہ گاؤں مرنا جینا۔ وہ نہ کبھی کسی کے اس مکان گئی اور نہ ہی

کسی دوسرے گاؤں میں۔ اس بستی سے وہ پیدا ہوئی تھی اور اسے اس بستی میں رہنا تھا۔ سارا گاؤں رام دئی کے گھر کے باہر اکٹھا تھا۔ پنڈتوں کی ڈیوڑھی کے آگے گتی بھیڑ تھی بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بولا: نہیں نے دُرگی کا چرخہ اٹھا کر پھر ڈیوڑھی میں رکھ دیا۔ رام دئی اپنی لڑکی کو جو چھ سات سال کی ہو چلی تھی گود میں لے کر دلی کی ایک کھٹری پر بیٹھ گئی اور گاڑی والے نے گاڑا چلا دیا۔ نہ اس نے کسی کو گلے مل کر وداع لی اور نہ کسی نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ عورتیں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ اور بڑی اداس تھیں۔ سنتوکے کی ماں کہہ رہی تھی "رام دئی جیسی لڑکی تو واہگرو کسی کو نہ دے۔ سارا گاؤں اجاڑ کر چلی گئی ہے۔" کئی کمزور دل والیاں دُرگی کی گم سم صورت دیکھ کر اپنے آنسو خشک کر رہی تھیں۔

جگت سنگھ بولا۔ اور پھر دُرگی دو دن ڈیوڑھی میں یوں بیٹھی رہی۔ جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ نہ بولتی تھی اور نہ ہلتی تھی۔ بڑی بوڑھیاں کہتی پھرتی تھیں اگر یہ مرگئی تو نہ جانے گاؤں پر کیا مصیبت آئے پھر جب اس کی آس ٹوٹ گئی اور رام دئی کی صورت دکھائی نہ دی تو بھری دُرگی اپنے آپ کہیں چلی گئی۔ سست دیو کا کالا کتا ڈیوڑھی پر بیٹھا رہ گیا۔ وہ کبھی کبھار آکاش کی طرف منہ کر کے روتا اور پھر چپ ہو جاتا۔

ایک اور بولا۔ مگر تین چار دنوں بعد ڈدگی واپس آ گئی۔ اس نے
خالی گھر میں دیا جلایا۔ اور چرخہ نکال کر رکھا۔ پھر وہ سردیوں کی لمبی رات
میں ٹپا سے مجھ سے گیت یاد کرتی گاتی اور چرخہ کاتتی رہی۔ اس نے
اپنے پلّو میں بندھے پراٹھے کھول کر کھائے اور ننگی زمین پر لیٹ گئی
دن چڑھے لوگوں نے اس کے چیخنے کی آوازیں سنیں وہ پانی مانگ
رہی تھی۔ چوکے کی زمین پر ایڑیاں مار مار کر اس نے جگہ کھود ڈالی تھی،
ایک زخمی جانور کی سی بھیانک آوازیں اس کے گلے سے نکل رہی
تھی۔ نہ جانے موت کو اس سے کیا بیر تھا۔ سارا گاؤں ڈر رہا تھا۔
کانپ رہا تھا۔ پر کوئی بھی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ اس کے منہ
سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مگر سانس سینے
میں اٹکا ہوا تھا۔ عورتیں اپنے کوٹھوں پر کھڑی اسے مرتا دیکھتی رہیں۔
اسے چیختا سنتی رہیں۔ پر کون اس کو جا کر دیکھتا۔ سورج کے ڈھلنے
تک چیخ چیخ کر اور تڑپ تڑپ کر ڈدگی کا منکا بھی ڈھل گیا۔ نہ اسے
زندگی میں سکھ ملا تھا اور نہ موت میں کوئی ساتھی۔ صرف کالا کتا منہ اٹھا
کر روتا اور پھر ڈدگی کا منہ چاٹتا رہا۔ میں بھی اس کے کریا کرم میں تھا جگجیت
سنگھ نے کہا۔ ہم سب نے مل کر اس کی ارتھی اٹھائی اور شمشان میں جا کر
سے لکڑی کے ڈھیر کی طرح آگ لگا کر واپس آ گئے۔ کسی نے اس

کیسری

ہوا آج بھی گرم اور جھلسا دینے والی ہے۔ تیزی سے چلتی ہوئی گرد کے
طوفان کو اپنے پیچھے اٹھائے ایسی عورت کی طرح کانپ رہی ہے جس نے
ضرورت سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہو اور جس کا کوئی بچہ اس کی مدد کرنے
کے لیے زندہ باقی نہ رہا ہو۔ میں بوجھل دل سے ہوتے ہوئے قدم اٹھاتا
عدالت کے کمرے سے باہر موٹر تک جانے کی کوشش کر رہا ہوں جہاں
میرا شوفر میرا منتظر ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے میں کبھی اس تک پہنچ نہیں
پاؤں گا۔ میرے قدم پاتال کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ میں نیچے گر رہا ہوں اور
زمین کے اندر کی ساری آفتیں میرا سواگت کرنے کو موت کے کئی روپ
بن کر میری طرف آ رہی ہیں۔ یہ گرمی کا اثر ہے۔

کیسری کی حیرت سے کھلی آنکھیں ہر گھڑی میری راہ میں آتی ہیں۔
میری طرف غور سے دیکھتی ہوئیں مگر ان آنکھوں میں رحم کی التجا نہیں ہے
خوف نہیں ہے، افسوس نہیں ہے، صرف حیرت ہے، جیسے کھیتوں
سے آتے ہوئے کسی موڑ پر اسے روپ سنگھ نے پکارا ہو۔ وہ پکار رہی

سے مایوس ہو کر اُس نے زد پہ جگنو کو مار دیا تھا۔

گوندوال سے شہر جانے والی راہ پر آج بھی ویسی ہی رونق ہوگی۔ ہوا کے ساتھ پتّے اُڑ رہے ہوں گے نہر کا پانی اسی طرح لہروں کے بل کھاتا آگے ہی آگے جا رہا ہوگا۔ نہر کی پٹڑی پر عورتیں جوتے پلو میں باندھے بچوں کو اٹھائے ننگے پاؤں تیز تیز گاؤں کی طرف آ رہی ہوں گی۔ سائیکل سوار سروں کو دھوپ سے بچانے کے لیے صافے لپیٹے اُنگلیں چلاتے گزرتے جاتے ہوں گے۔ سبھی کچھ ویسا ہی ہوگا پر کیسری نہ ہوگی۔ کیسری جس کی اپیل کا فیصلہ سُناتے جج نے آج میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وہ حیرت تھی جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔

کیسری کی کہانی وہی عام کہانی تھی جو اس دُنیا میں لاکھوں بار دُہرائی گئی ہے عورت نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا سب کچھ پریم کی چوکھٹ پر تج دیا اور جب اس دوار سے اسے دھتکار ملی تو بدلے میں اُس نے مندر کو ہی اجاڑ دیا۔ مورتی بنانے والے ہاتھوں نے غصے کی گھڑی میں مورتی کو آسن سے گرا دیا۔ زندگی کی کہانی عجیب ہے کیونکہ ہر آدمی اس کو اپنے خیال کے مطابق ڈھال لیتا ہے کوئی ایسا نہ ہو سکا اصول نہیں جو اس کو ترتیب دے سکے۔ جانے کتنی صدیوں سے یہ دُنیا آباد اور پھر بھی ہر کوئی جو دُنیا میں پہلی بار آتا ہے دُنیا کے نئے پن سے حیران

ہوتا ہے اور اپنے خون سے اس کہانی کا انجام لکھتا ہے اور چپکے سے مندر میں اپنے دل کی بھینٹ چڑھا آتا ہے۔ تب بھی تو ایسی ایسی باتیں ہیں کہ اچھا یا بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ دشمنی کا سبب بن جاتی ہیں۔ ذرا ذرا سی رقابتیں چھوٹی چھوٹی خواہشیں جیسے بوئے تناور درختوں کی طرح زندگی کی راہ پر چھا جاتی ہیں۔ تو کیسری بھی دنیا میں آئی سوتیاں بنا کر مندر کو سجاتی رہی اور یہاں سے بھی اس کی کہانی عام کہانیوں سے ذرا مختلف ہے۔ کم از کم مجھے تو وہ ایسی ہی لگی تھی کیونکہ میں کیسری کو بچپن سے جانتا تھا۔

گردوارے کے گیانی جی کی بیٹیاں میری بہن رکمن کے ساتھ جب آنگن میں کھیلنے رہتیں اور پیپل پر جھولتی ہوئی گیت گاتیں تو کیسری اپنی دیوار پر سے ہمارے آنگن میں جھانکتی وہ ان دنوں ذرا سی بچی تھی یہی کوئی چھ سات سال کی ہوگی۔ رکمن بہن بھی اس سے بڑی تھی اور جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں نا سمجھ بالی لڑکیوں کو کب اپنے ساتھ کھلاتی ہیں۔ میں ان دنوں سکول میں پڑھتا تھا اور لڑکیوں کی طرف بہت حقارت سے دیکھتا جب میری بہنیں دیر کہہ کر مجھے اپنا کوئی کام کہتیں تو میں بہت منتیں کروانے کے بعد بھی ان کے کام کر کے نہ دیتا۔ رکمن کی سہیلیاں گلی کی لڑکیاں سب مل کر آنگن میں خوب شور مچاتیں اور کیسری کو نہیں

دیکھتا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیوار کے پار سے جھکتیں جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔ پھر اس کی ماں آواز دیتی اور وہ یوں غائب ہو جاتی جیسے کسی نے نہر کے بہتے پانی میں ڈبکی لگائی ہو۔ ہوا میں بلبلے سے پھوٹنے لگتے اور دیوار کا وہ ٹکڑا سات رنگوں میں نہا جاتا جیسے آکاش پر سے چناب کے رنگ دھرتی پر آن براجے ہوں۔

مجھے کیسری کی ان دنوں کی صورت یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ صرف نیم کے پتوں میں جھولتے جھولے یاد ہیں اور گیانی جی کی وہ بیٹیاں جو دلہن کے پہلے اپنے بیاہی گئیں اور جب بچوں کے ساتھ دلہن سے ملنے ہمارے گھر آئی ہیں تو عورتیں لگتی تھیں۔ میں نے اسکول ختم کیا تو باپو نے مجھے کالج میں پڑھنے امرت سر بھیج دیا۔ گوندوال میرے لیے ایک ایسا ماضی بن گیا جس کو فارغ گھڑیوں میں رات کو بستر میں گھس کر آنکھوں کے رس کی باس کو سونگھ کر یاد کیا جا سکے۔ اور میں بہت ہی مصروف ہو گیا ہوں۔ آج تک مجھے کیسری کو یاد کرنے کی فرصت کب ملی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جب کبھی میں چھٹیوں میں گاؤں جاتا تو وہاں میرا دل ہی کب لگتا تھا۔ میرے ماما کا گھر شہر میں تھا اور میں اکثر چھٹیاں شہر میں گزارتا، پڑھنے میں لگا رہتا اور میڈیکل کالج کی لڑکیوں کو پیار سمجھا ہو پا نہیں سکتیں۔ اوہ پر بات تو کیسری کی ہو رہی ہے جب میں

مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور ریڈیو سننے سے پہلے دیکھنے تک
کی فرصت نہ تھی مجھے بابو جی کی چٹھی ملی کہ ماں بہت بیمار ہے۔ اور میں گھر
آ گیا۔ گاڑی جب یہاں کے اسٹیشن پر رکی ہے تو شام کا دھندلکا کھیتوں کے
کھیتوں پر نیلا ہو رہا تھا اور گاؤں تک چلنا مجھے بہت مشکل لگ رہا
تھا۔ پھر ان سارے سالوں میں جو ماں سے دور رہا تھا مجھے دکھ ہو رہا
تھا اور مجھے ماں بہت یاد آ رہی تھی۔ گھر یاد آ رہا تھا اور جانے کیوں
میں اتنا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا شاید کوئی سواری
بابو جی نے بھیجی ہو مگر کوئی نہیں تھا اور اسٹیشن کی عمارت سے پرے کھیتوں
پر رات جھکے ہوئے اتر رہی تھی ہوا میں تازہ رس کی باس تھی اور گڑ
کی مہک تھی پانی کی بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے میرے سر پر سے گزر رہے
تھے نہیں جانی کبھی راہ پر اجنبیوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ آنگن جس
میں نیم کا درخت تھا مجھے بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔

پھر لال رنگ کے بادلوں سے پرے سورج کا گولا تھال ہو کر
گیا اور درختوں پر چڑیاں زور زور سے بولنے لگیں میرے سر پر
سے کوّے اور بگلے قطاریں باندھے گزر گئے۔ شام کی ہوا چلی عورتیں
سروں پر چارے کے گٹھے لیے راہ کی بستیوں میں گم ہو گئیں اور
گڑ کے کڑھاؤ کے نیچے جلنے والی آگ زیادہ روشن ہو گئی۔ سنہری پٹڑی

پر چڑھا ہوں تو پانی اندھیرے میں چمکنے لگا اور لہریں جیسے جیسے
مجھے سوتی ہوئی تھیں۔ آم کے باغ کے پاس مجھے جھنجھنانے کی آواز
سنائی دی اور پھر لگام ہاتھ میں پکڑے ویرمال سے اپنے گاؤں کے
طرف مڑنے والی راہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔

مجھے دیکھ کر آج کی طرح اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے
کھل گئیں۔

"ویر تم کہاں سے آ رہے ہو؟" اس نے اپنے . . . . .
کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"شہر سے۔" میں نے اس کے برابر چلتے ہوئے کہا۔ "ماں کا
کیا حال ہے؟ مجھے تو آج ہی باپو کی چٹھی ملی تھی کہ ماں بہت بیمار ہے۔"

"ہاں جی اب تو اچھی ہے۔ پرسوں اس کا جی بہت خراب ہو گیا
تھا۔ رکمن بھی آئی ہوئی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لگام گھوڑی
پر ڈال دی۔ گھوڑی سر جھکائے آگے آگے چل رہی تھی۔ میرے جی پر
سے ماں کے اچھے ہونے کا سن کر بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو میں نے ادھر
ادھر دیکھا۔ اِکا دُکا تارے گلی میں کھیلنے والے بچوں کی طرح آکاش پر
اکٹھا ہو رہے تھے اور حویلیوں میں دیے ٹمٹما رہے تھے اور کیسری
کی آنکھوں میں حیرت بہت گہری تھی۔ جیسے اس کے اندر کہیں دیوالی ہو

رہتی ہو۔ اپنے پاس چلتے ہوئے میں نے ایک عجیب سی گھٹن اس میں
پائی جو نہ کھیتوں کی تھی نہ سٹاس کی نہ شام کی ہوا کی تھی اور نہ پانی کی گنگا
کی میٹھی سی باس بھی نہ تھی اور گردوارے میں جلنے والی دھونیوں کی بھی
نہیں تھی ایک نرالی انوکھی سی۔

میرا دل اس باس کے ساتھ ساتھ بھٹک رہا تھا۔ اور ہم دونوں
گھوڑی کے پیچھے چل رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ ساری بیاہ جیوں،
مایوں اور مہندیوں کی باتیں۔ میں دل ہی دل میں حیران تھا کیسری کا بیاہ
اب تک کیوں نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ کی ساری کنواریاں بیاہی جا چکی
تھیں۔ ہمارے آنگن میں بیٹھتے ہوئے نئی جوان ہوتی لڑکیوں
نے رکمن کی سہیلیوں کی جگہ اپنا ڈیرا جما لیا تھا۔

جب گوندوال دکھائی دینے لگا تو میں نے پوچھا "تم کہاں سے
آ رہی تھیں، ویروال کس کام سے گئی تھیں؟"

مدھم پڑتی روشنی میں، جو آجائے سے زیادہ اندھیرا لگتی ہے،
پر چھایا پہ چیزوں کی شبیہ مٹ نہیں سکتی۔ پیڑ نے نیلاہٹ کی پرچھائیں
میں جو رات اور شام کچھ نہ تھی۔ کیسری کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ تپ
رہا تھا اور لمبی لمبی پلکیں ان بڑی بڑی آنکھوں پر یوں جھکی تھیں جیسے وہ
نئی دلہن ہو۔ اس نے میری طرف دیکھے بنا جواب دیا "روپ نگر

ولایت جا رہا ہے۔"

"کون رُوپ سنگھ؟" میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لمبڑوں کا پُوت۔" اُس نے یوں جھنجھلا کر جواب دیا۔ جیسے مجھے میرے بھول جانے کی کوشش پر غصّہ آ رہا ہو۔

"اچھا اور دال والے لمبڑوں کا رُوپ سنگھ۔ اس نے اسکول ختم کر لیا ہے۔" میں نے اپنے یاد ہونے کی قوت پر خوش ہوتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ "وہ ولایت کیوں جا رہا ہے اس کا باپو تو پڑھنے والے لوگوں کے خلاف ہے۔ وہ روپ سنگھ کو کیسے اتنی دور بھیج رہا ہے؟"

میں نے ایک سانس میں اتنی ساری کہہ دیں۔

"رُوپ سنگھ کہتا ہے ولایت سے آ کر وہ اپنے باپ کی زمینوں سے بے فکر ہو جائے گا اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو جائے گا۔" کیسری نے بہت دھیرے سے یوں کہا جیسے وہ رس کے گھونٹ پی رہی ہو اور مٹھاس سے اس کے ہونٹ چپک رہے ہوں۔ شام کی ہوا میں میں نے اس کی لمبی چوٹی کو اس کے پیچھے لہراتے دیکھا۔ جب وہ اپنی حویلی کی طرف جانے کے لیے گھوڑی کی اگاڑی پکڑ کر مڑ گئی ہے۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ رکس سے نکلتے ہوئے قدکی جیسے درخت

کی ٹہنی میں سے نئی پھوٹی ہوئی لمبی شاخ جو سرخ پتوں سے بھری ہوئی
اور زندگی کے رس سے چھلکتی ہوئی ۔

آج بھی جب وہ عدالت میں کھڑی تھی زندگی کا رس اس کے انگ انگ سے چھلکتا تھا ۔ سیدھی نئی نویلی شاخ کی طرح چھلکتی ہوئی وہی لیسری جو ہر شام گوندوال کی گلیوں میں لمبڑوں کے ٹروپ جھمکو کا سوچتی ہوئی گھوڑی کی باگ پکڑے ہوئے جا رہی تھی اور جس کے ہونٹ ایک آم کی مٹھاس سے چپک رہے تھے ۔

میں حیران ہوں اور سوچ نہیں سکتا کہ مٹھاس زہر بھی بن سکتی ہے ؟

گوندوال میں میں بہت کم ٹھہرا ۔ ماں کا جی اچھا تھا وہ میرے آنے سے بہت خوش ہوئی ۔ دکمن کے آدھ درجن بچوں نے شور مچا کر میرا سر کھا لیا ۔ ملنے والوں نے مجھے پریشان کر دیا اور آنے والے مقابلے کے امتحان کی یاد نے میرا دو دن وہاں ٹھہرنا مشکل کر دیا ۔

تیسرے دن جب میں شہر آ رہا تھا تو جفتی چوہڑ تک باپو مجھے چھوڑنے آیا ۔ گاڑی کے آنے تک وہ مجھ سے گھر ، کھیتوں ، فصل اور لوگوں کی باتیں کرتا رہا ۔ پھر دبی زبان سے اُس نے لمبڑوں کا ذکر کیا جو چاہتے تھے کہ اپنی بیٹی مجھے دیں مگر جو بات خود وہ کہنا چاہتے تھے تب اس

گھڑی مجھے کیسری یاد آئی اور میں نے باپو سے پوچھا "میں نے سنا
ہے روپ سنگھ ولایت جا رہا ہے؟"

"ہم نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی۔" باپو نے حیران ہو کر
پوچھا "تجھے کون یہ بات بتا گیا ہے؟"

تب میں نے یونہی کسی وفا کی خاطر نہیں بس ویسے ہی کیسری
کا نام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور باپو سے کہا "مجھے جانے والوں میں
سے کسی نے بتایا ہے۔"

باپو نے ہونٹ سے کہا "ہمارے گاؤں میں تو کسی کو
معلوم نہیں شاید چیت سنگھ کے گھر سے بات نکلی ہو۔ تمہیں نہیں پتہ
لوگ کیسری اور روپ سنگھ کے لیے کیا کیا کہتے ہیں؟"

میں پھر بھی چپ رہا تو باپو نے کہا "ایک طرح سے تو اچھا ہی ہے
وہ ولایت چلا جائے گا تو کیسری کے جادو سے نکل جائے گا وہاں
اس کا دل کسی اور میں لگے گا۔ واہ گرو کسی کو ایسی لڑکی نہ دے کیسری
تو ڈائن ہے گاؤں میں سے کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔" پھر کانوں کو
ہاتھ لگا کر کہنے لگا "توبہ توبہ میں بھی بیٹیوں والا ہوں کسی کی باتیں کیوں
کروں۔ ہو سکتا ہے لوگ جھوٹ کہتے ہوں۔ کیسری ذرا دلیر سی لڑکی ہے"
و تب مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جو ہمارے آنگن میں دیوار کے اوپر

سے بچا سکتی تھیں اور ایسی لگتی تھیں جیسے بلی اپنے شکار کی گھات میں ہو۔

گرندوال بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ میں مقابلے کے امتحان میں اوّل آیا اور اکیڈیمی میں ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔ ایک سال کے بعد جہاں میری پوسٹنگ ہوئی ماں بھی وہیں پہنچ گئی۔ اصل میں وہ مجھ سے میری شادی کی بات کرنے آئی تھی۔ پر ان دنوں میں گورداس پور کے ڈپٹی کمشنر کے گھر میں بہت آتا جاتا تھا اور اس کی بیٹی کو، جو بیڈمنٹن کھیلتی تھی، انگریزی تیزی سے بولتی تھی اور ولایتی میموں کے سے بال بناتی تھی، زبردستی عشق کر رہا تھا۔ وہ ریوال اور ملیڑوں کا قصہ میرے لیے پرانا ہو چکا تھا۔ میرے طور طریقے دیکھ کر میری دھیرج والی ماں نے شادی کی بات نہ کی۔ جب شام کو ہم سب کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو وہ گاؤں اور ہمسایوں کی باتیں کرتی رہی۔

میں نے پوچھا "ماں کیسری کا بیاہ ہو گیا کیا؟"

اور ماں نے بہت ہی دکھی دل سے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا: "کہاں اس کا بیاہ ہوگا۔ وہ کسی کو پسند بھی کرے۔ اس نے جیت سنگھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جب تک روپ سنگھ نہ آئے گا وہ انتظار کرے گی۔ بتاؤ تو۔ تم تو ملیڑوں کی لڑکی سے بیاہ نہیں کرنا چاہتے

اور بنی کے پیچھے پھرتے ہو وہ جو ولایت گیا ہے بھلا آکر اس کو پوچھے گا بھی! پھر بہت آہستہ سے کہنے لگی۔ "تیری بھی اب کون اس کو قبول کرے گا۔ وہ کسی سے کوئی بات چھپاتی تھوڑا ہے۔ جانے کس مٹی سے بنی ہے اتنی بے شرم لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ واہ گرو کرے اسے تو موت آجائے۔ اس کی ماں نے تو اب طعنوں کے ڈر سے گلی محلے میں آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

جب ماں نے بات ختم کر لی تو میں نے کہا: "ماں تجھ سے کس نے کہا ہے کہ میں بنی کے پیچھے پھرتا ہوں۔ وہ تو شیش سنگھ کی بیٹی ہے نا۔ اور آدمی کو اپنی آئندہ ترقی کے لیے کسی نہ کسی سے نباہ کرنی پڑتی ہے۔ تو جہاں بھی میرا بیاہ کرے گی مجھے منظور ہوگا۔ بھلا میں اب ایسا بھی کیا نالائق ہوں کہ تیری بات نہ مانوں گا۔ میں کوئی کیسری ہوں۔"

ماں نے خوش ہو کر میرا منہ چوم لیا۔ میرے سر کو پیار کیا اور بولی: "بس بیٹا تو نے میرا دل خوش کر دیا۔ لیڈروں کی جگجیت بڑی منہ زور اور کڑ زبان ہے۔ تو ایک ہی تو میرا پوت ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں ایسی بہو آئے جو کم از کم میرے ساتھ مل کر تو رہ سکے۔"

اپنے بیاہ پر میں نے کیسری کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جوت ویسی ہی تھی جیسے اندر دیے جل رہے ہوں۔ وہ لڑکیوں کے جھرمٹ

میں بیٹھی سب سے الگ جان پڑتی تھی اور اس کی آواز سب سے اونچی اور
میٹھی تھی۔ آج وہ دیوار کے پار سے ہمارے گھر آگئی تھی اور رکمن
کے ساتھ کام کرتی شربت کپڑے چھنتے چھم چھم کرتی پھرتی تھی جہاں اور
لڑکیاں باتیں کرتی اور ہنستی پھر رہی تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی
ہوئی جگجیت کو دیکھ رہی تھی جو ہاتھ بھر کا گھونگھٹ کاڑھے گیتوں کے
درمیان اٹھتی جاتی تھی۔ کیسری کے چہرے پہ ایک سایہ سا تھا جیسے دیئے
کی لو کے اوپر سے کوئی گزر رہا ہو اس کی آنکھوں پہ نہیں پلکوں پہ میں نے
یادوں اور بیتی گھڑیوں، راہ دیکھتے رہنے کی تھکان کو دیکھا مگر وہ ہنس
رہی تھی اور نہال ہو رہی تھی۔

جگجیت کو شہر لے جانے سے ایک دن پہلے میں یونہی کھیتوں
کی طرف نکل گیا۔ سردیوں کی شام گاؤں کو ذرا جلدی آلیتی ہے دور تک
آکاش اور زمین کھیتوں کے اوپر سے ملنے کے لیے جھکتے اور بڑھتے
چلے جاتے ہیں۔ گلیاں سونی ہو جاتی ہیں۔ آوارہ کتے چوں چوں کرتے
بھٹیوں کی راکھ میں سر چھپا کر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔
گائیں بھینسیں تھانوں پہ بندھی اپنے گلے میں پڑی گھنٹیوں کو سر کی حرکت
سے بجاتی ہیں۔ گھروں کے اندر دیے جلتے ہیں۔ اپلوں کی آگ بھڑکتی نہیں
بس جلتی ہے۔ کوٹھڑیوں میں بچے تل شکر کھاتے ہیں۔ عورتیں چرخے

گاتی ہیں اور جوان لڑکیاں گیت کے بول اُٹھاتی ہیں۔ بند دروازوں
کے پیچھے کھیتوں اور فصلوں کی باتیں کرتے کسان اپنے لڑکوں کو موسم کی
باتیں بتاتے ہیں۔ کہانیاں نیلے دھوئیں کے دھندلکے میں سہانی لگتی
ہیں اور دیے کی لو ہوتے ہوتے اندھیرے کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔
حویلیوں میں گھوڑیاں ہنہناتی ہیں اور شراب پی کر مدہوش ہوتے جوان
اپنے اپنے عشق کے قصے کہتے ہیں۔ پرانی بہنوں کی باتیں کرتے ہیں اور
گندے گیت گاتے ہیں۔

وہ رات چاندنی تھی اور روشنی میں گندم کے کھیت لہلہاتے
ہوئے بھلے لگتے تھے میں دل میں سوچ رہا تھا۔ نمی کیا کرے گی۔ کیا وہ
اسی طرح میرے ہاتھ میں ہاتھ دیے کلب میں گھومے گی۔ کیا وہ اسی
دل جمعی کے ساتھ ٹینس کھیلے گی۔ اس نے آج تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا
کہ اسے میں کتنا عزیز ہوں مگر دوسروں کو چھوڑ کر میرے ساتھ پھرنے
اور ہر مجمع میں میرے ساتھ دیکھے جانے کی آخر کوئی تسلی ہو گی۔ میں نے
بشن سنگھ کو بتایا تھا کہ کسی کام سے گاؤں جا رہا ہوں۔ اب جبکہ اسے پتہ
چل چکا ہوگا، وہ کیا کہے گا۔ اس کی لڑکی؟ مگر جگجیت کی آنکھوں میں
کاجل کی دھار بہت تیز تھی اس کے جسم کی سگندھ نے مجھے پاگل کر
دیا تھا۔ میں جگجیت کی سادگی پر فدا ہو گیا تھا۔ اس پر صرف میرا حق

تھا وہ صرف میری تھی۔ کبھی اس رات سے پہلے مجھے کبھی یاد بھی نہ آئی تھی۔

پھر میں نے کیسری کو دیکھا۔

اس نے بنا کچھ کہے مجھ سے پوچھا "دیر کیا ولایت کی عورتیں مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں؟" وہ میرے سامنے راہ پکڑی تھی اور چاندنی کرنوں کا دھارا اس کی آنکھوں اور پلکوں پر کانپ رہا تھا۔ میں نے پاؤں سے سر تک اسے دیکھا خاموشی سے جیسے میں اس کی خوبصورتی کا جائزہ لے رہا ہوں۔ اسے پیمانے میں ناپ رہا ہوں۔ اسے ترازو میں تول رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں کی اداسی اس کے چہرے کی سوزش جیسے موتی کی چمک ہو۔ وہ میرے سامنے سانس روکے کھڑی تھی اور میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے اس رات پہلی بار دیکھا کہ کیسری کا حسن اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کی سادگی کا مقابلہ دنیا کی کوئی شے نہیں کر سکتی تھی وہ دنیا کی ساری عورتوں سے اونچی تھی۔ آج تک جتنی کہانیاں میں نے کتابوں میں پڑھی تھیں، جتنی عورتوں کی سندرتا کو میں نے محسوس کیا تھا وہ سب کچھ اس کے سامنے دھول تھا۔ کیسری جیسا آج تک بھگوان نے کوئی پیدا نہ کیا تھا۔ اس کی آن بان رانیوں سے بڑھ کر تھی۔ ان

آنکھوں میں کاجل بھی نہیں تھا۔ اِن ہاتھوں میں چوڑیاں نہ تھیں مگر پھر بھی اس کا سنگھار گزری صدیوں کی عورتوں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ کتنا پیڑے کی نرمی اس اداسی کو جانے کیا بار یہی تھی مگر میں چُپ تھا۔

کیسری نے پھر کہا "کیوں دیر کچھ کہتے کیوں نہیں ہو میں گھنڈال کی لڑکی ہوں جانے دو۔ بپ سنگھ کو پسند بھی آ ؤں کہ نہیں؟"

میں نے کہا "کیسری ایسی رات میں یوں گھومنا اچھا نہیں واپس جاؤ۔ اور یقین رکھتی ہو تو کہ دُنیا نے ایسا ہیرا پیدا نہیں کیا جو اب تک تمہارے مقابلے پر رکھا جا سکے" وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور بولی "ویر یہاں پر کوئی ایسا نہیں جو میری بات سمجھ سکے میں نے کوئی پاپ نہیں کیا پر کیا کروں لیڈروں کا لڑکا مجھے جانے کیوں اچھا لگتا ہے اور میں ساری عمر اس کا انتظار کر سکتی ہوں کیونکہ اُس نے کہا تھا کہ میں اس کی راہ دیکھوں۔ تم مجھے بتاؤ ولایت کیسا دیس ہے؟"

شک اور بے یقینی سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

میں نے اس سے بہت اچھی باتیں کیں۔ اگلے دن میں جنگیت کرنے کا ؤں سے چلا آیا۔ اور پھر بشن سنگھ نے میرا تبادلہ بہت دُور کروا دیا۔ نوکری کا بھی ایک جادو ہے۔ طاقت کا ایک نشہ ہے اور پھر زندگی غیر معلوم طور پر روز کے چکر میں چلتی ہے تو وقت کا پتہ

نہیں چلتا۔ پانچ سال کے بعد میرا تبادلہ پھر امرتسر کا ہو گیا۔

نمی ایک شام مجھے کلب میں مل گئی۔ ان پانچ سالوں میں وہ بہت
بدل گئی تھی۔ اس کی شادی میری غیر حاضری میں ایک کپتان سے ہو گئی تھی
جو شراب پی کر اسے مارتا اور بہک کر پنجابی گیت انگریزی دھنوں میں
گانے کی کوشش کرتا تھا۔ بشن سنگھ کی پنشن ہو چکی تھی۔ اور وہ نہر کے کنارے
اپنی بہت بڑی کوٹھی میں رہتا تھا۔ جس کی چوکیداری بھی وہ خود ہی کرتا
تھا۔ کتوں، کبوتروں کا جوڑا گھر سا اس نے بنا رکھا تھا اور دنیا سے اپنے
حالوں مست کر وہ اپنی اس بنائی ہوئی جنت میں خوش تھا اور کسی کے دکھ
کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ نمی کی حالت پہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے
وہی کیا ہے جو اس نے چاہا ہے۔ کپتان کو گالیاں دیتا اور نمی کو اپنے
گھر نہ آنے دیتا۔ میں کلب کے ایک کونے میں بہت دیر تک نمی سے
باتیں کرتا رہا۔ اس کا تیز انگریزی بولنے کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔ میدان
میں بہنے والی ندی کی طرح کی روانی اور ٹھہراؤ اس میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ
کپتان سے چھٹکارا پانے کے لیے ممّا نے دوستوں کو ملنے کبھی کبھار کلب
میں چلی آتی تھی جہاں وہ شراب پیتی اور اپنی حالت پر روتی رہتی تھی۔ میں نمی
سے مل کر بہت اداس ہو گیا۔ مجھے بیتے دن بری طرح یاد آئے۔ نمی کا
باپ اگر کوشش کرتا تو اس شرابی کپتان سے اچھا کوئی آدمی اس کی

جیتی سے شادی کر لیتا مگر کوشش سے نصیب بدل سکتے ہیں بھلا ؟

مگر شاید تو جگجیت اور بچے گھر کو سہارا ہے جتنے ٹروپ سنگھ کا خط آیا تھا وہ کل واپس آنے والا تھا۔ بچے پہلی بار اپنے ماما کو دیکھنے والے تھے۔ جیت کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ بار بار مجھ سے کہتی۔

"جب وہ گیا ہے تو میرا بیاہ نہیں ہوا تھا اب آ کر بچوں کو دیکھے گا تو کیا لگے گا اسے کیسا لگے گا" وہ خوشی سے سرخ ہو رہی تھی شام تک اس کا باپ بھی آ گیا اور گھر یوں جگمگ کرنے لگا۔ جیسے دیوالی ہو۔

میں اس ساری تیاری کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جگجیت کا بوڑھا باپ مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ کہ وہ کس طرح ٹروپ سنگھ کو کسی اچھے گھر میں بیاہے گا اور کتنی خوشی کرے گا کہ ساری پچھلی خوشیاں لوگوں کو بھول جائیں۔ اس شام بہت سالوں کے بعد مجھے کیسری یاد آئی اور گوندوال یاد آیا۔ میرا جی چاہا میں گاؤں لوٹ جاؤں اور اس سے ملوں۔ ولایت کی عورتوں کے حسن کا بھرم اب تو جھوٹا لگنے لگا تھا میں دل ہی دل میں لیڈی کی باتیں سن کر ہنس رہا تھا۔ بھلا ٹروپ سنگھ کیسری کو بھول سکتا ہے کیسری بھولنے کی چیز نہیں تھی۔

دو چار ماہ کی مصروفیت میٹنگ میں اور کانفرنسیں مجھے پھر اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں مگر گاؤں جا کر کیسری اور ٹروپ سنگھ کے حالات

اور نہانے کے شوق میں اپنے جوڑوں سے بھرے سر کھجا رہی تھیں۔ میں ناقابلِ یقین کشش محسوس کر رہا تھا یوں جیسے اگر زمین کے بازو ہوں اور وہ مجھے اپنے ساتھ لگا لینا چاہے تو میں اس کے سینے سے لگ کر ایک ٹھنڈک محسوس کروں گا۔

رُوپ سنگھ کی شادی کی باتیں جو جگجیت اور اس کا باپ کرتے رہے تھے اور پھر رُوپ سنگھ کا ان چھوڑ لڑکیوں کے ذکر سے ہی چکرانا مجھے یاد آ رہا تھا۔ در اصل میں کیسری کا انجام دیکھنے کے لیے گاؤں جا رہا تھا۔

لوگ تالاب کی طرف چلے گئے راستہ سنسان ہو گیا اور دُور ہوتے ہوئے گیتوں کے بول مجھے شمشان میں گائے جانے والے منتروں کی جاپ کی طرح لگنے لگے اور تاروں کے جھرمٹ اندھیری رات میں ڈرتے ہوئے بچوں کی طرح ٹولیاں سی بنا کر آکاش پر آنے لگے۔ ہر شے تاریکی میں چھپی ہوئی تھی۔ ٹڈوں کے چرچرانے کی آواز ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سُر کی طرح درختوں اور راہوں جھاڑیوں ... کھیتوں اور کچے ٹھڈیوں پہ سے چھنتی جاتی تھی۔

پھر میں نے تیز بھاگتے گھوڑے کی ٹاپوں کو سنا اور وہ شور قریب آتا گیا، اور قریب آ گیا۔ اب میں اس موڑ پر تھا۔ جہاں سے

"مگر وہ ہے کہاں مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔" میں نے ٹارچ جلا کر روشنی اِدھر اُدھر پھینکی۔

"یہاں۔" اُس نے سینے پر ہاتھ مارا "یہاں۔"

میں نے کہا "مذاق مت کرو تم کو معلوم ہے میں صرف یہی جاننے کے لیے گاؤں آیا ہوں تم زروپ سنگھ کے ساتھ بیاہ کر خوش ہو کہ نہیں۔ مجھے تو وہ بہت بدلا ہوا لگتا تھا تمہارے ساتھ تو وہ نہیں بدلا۔"

"نہیں وہ نہیں بدل سکتا تھا میں اسے بدلنے کب دیتی بھلا۔ اب وہ بدل ہی نہیں سکتا دیر۔" اور وہ زور سے ہنسنے لگی۔

مجھے خون رگوں میں جمتا ہوا لگا۔ یہ کیسی ہنسی تھی کیا۔ جو دھیرج سے بات کرتی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور سختی سے پوچھا "تم ہنس کیوں رہی ہو آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے میں نے تم سے ہمیشہ ہمدردی کی ہے اور جب کہ تم خوش ہو مجھے بتانا بھی نہیں چاہتیں۔"

وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور آہی دھیرج سے بولی "دیر زیادہ خوشی آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے نا۔ مگر تم میرے دیر ہو اور تم کو نہ بتاؤں گی تو کسے بتاؤں گی بھلا۔" پھر وہ سینے کی ڈوریاں کھولنے لگی۔

"ویر ذرا بتی تو جلاؤ۔ مگر پہلے چادر سے پردہ کر لو۔ کوئی اور نہ دیکھ لے۔"

میں ایک جادو کے اثر میں آئے انسان کی طرح چادر لے کر ہاتھ سے اوٹ کرنے لگا اور جب میں نے چادر کا کونا پکڑے پکڑے دوسرے ہاتھ سے بتی جلائی تو کیسری روپ سنگھ کا سر ہتھیلی سے تھامے بیٹھی تھی اور ان آنکھوں میں یوں چمک رہی تھی جیسے پاگل ہو گئی ہو۔

"کیسری تم نے یہ کیا کیا ہے؟" میں نے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ویر کچھ نہیں۔" اس کی آواز کی سردی مجھے اپنی کیکیاہٹ کے مقابلے میں بہت عجیب لگی۔ اور پھر سر کو واپس ہتھیلی میں رکھتے ہوئے بولی: "اب میں جاؤں کوئی دیکھ نہ لے۔"

"مگر اسے ساتھ لیے کیوں پھرتی ہو؟" میں نے مستقبل کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس نے گھوڑی کی باگ ہاتھ میں لی اور ہتھیلی کو کاٹھی کے ساتھ لٹکائے ہوئے بولی: "اسی کو ساتھ لیے پھرنے کے لیے تو میں نے آج تک گھڑیاں گن گن کر گزاری ہیں، ویر اب اسے کیوں پھینک دوں؟"

"مگر کیسری تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟" میں نے یونہی کہنے کے
لیے کہا۔

"ویر بھلا میں پاگل ہو سکتی ہوں۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی
تھی کہ زروپ سے کیسے ملا جائے۔ میں نے ان ٹھنڈی راتوں میں
نہر کے کنارے اس درخت کے نیچے پوری پوری رات اس کا
انتظار کیا ہے اور اب مہینوں کے بعد جب وہ یہ کہنے کے لیے
آیا تھا کہ وہ مجھ سے پیار نہیں کر سکتا اور میں اسے تنگ نہ کروں،
میں بھلا اُسے واپس کیسے جانے دیتی۔ اب میں اسے دیکھ تو سکوں
گی۔ ویروال کے راستے اب تک مجھے برداشت کرتے رہے
تھے۔ اب کیوں میں ساری عمر ان راہوں کا چکر کروں؟"

میں نے اسے بہت کہا "کیسری یہ سر کہیں چھپا دو۔ اس بات
کا کسی کو پتہ نہیں ہے تم موت سے بچ جاؤ گی۔ تمہیں قانون کا پتہ
نہیں ہے کیا بننے والا ہے۔" مگر اس نے کہا تو صرف یہ کہ "میں
قانون سے نہیں ڈرتی تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میں اسے اتنا چھپا کر
رکھوں گی کہ کسی کو کبھی پتہ بھی نہیں چل سکے گا۔ لیڑوں کے پوت
نے پاگلوں کی طرح تاک تاک کر اور پیچھا کر کے مجھے اپنا دیوانہ بنایا تھا۔
اب میں اسے چھپا کر رکھوں گی اور اکیلے میں دیکھا کروں گی۔"

میں نے روشنی بجھا دی اور خاموش کھڑا رہا۔

وہ پھر بولی "تمہیں پتہ نہیں ویرے یہ آنکھیں مجھے کتنی پیاری تھیں، یہ ہونٹ کتنے میٹھے تھے۔ دانت تو موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ ان لکا بھول نے مجھے کتنی کہانیاں سنائی ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں ویرے مجھے زروپ سنگھ کے بنا زندگی کتنی سونی لگتی۔ کیا میں اس کے بغیر جی لیتی؟ اگر اسے دوسری عورت کا بننا پڑتا تو مجھے رنج ہوتا۔ اگر وہ وہاں سے کوئی میم لے آتا تو میں کیا کر لیتی۔ مگر وہ میم نہیں لایا۔ یہاں اس کو لوگوں نے بدل دیا تھا۔ دو مہینوں سے میں اس کی راہوں میں بیٹھی اسے ملنا چاہتی رہی ہوں مگر وہ مجھ سے نہیں ملا۔"

"پھر آج وہ کیسے قابو میں آیا؟"

"آج۔" اس نے ہولے سے کہا۔ "آج اماوس کی رات تھی اور میں نے اس کے ایک پرانے یار کو بھیجا تھا کہ اسے بلا لائے۔"

وہ چپ ہو گئی تو میں نے کہا "کیا اس آدمی نے اسے ساتھ لانے میں تمہاری مدد کی تھی؟" میں نے اپنے اندر کے افسر کو جاگتے ہوئے محسوس کیا۔

وہ ہنس کر بولی "زروپ سنگھ جب تک مجھے دیکھ نہیں لیتا تھا۔ اسے چین نہیں آتا تھا اور آج میں نے اسے کہا تھا کہ تمہیں دیکھے

بنا میں نہیں جی سکتی۔"

پھر وہ گوندوال کی راہ پر آگے چلی گئی اور آگے چلی گئی۔

آج اس کی اپیل کا فیصلہ تھا۔ میرے سامنے جگجیت تھی اور اس کا باپو تھا۔ انصاف تھا اور وہی ترازو تھا جس میں میں نے اس چاندنی رات میں کیسری کے حسن کو تولا تھا اس کے چہرے کی موہنی اور آنکھوں کی اداسی کو جانچا تھا۔ وہ مجھے دیکھتی تھی اور مجھ پر بھروسا رکھتی تھی اور پھر عدالت میں میری وہ کرسی تھی۔

رُوپ سنگھ کے بنا کیسری جی نہیں سکتی اور میں اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ ان ہونٹوں کی مسکراہٹ زہر بن گئی اور اس رات رُوپ سنگھ کی حیرت سے کھلی آنکھوں کی طرح آج کیسری کی آنکھیں بھی حیرت سے فیصلہ سننے کے بعد کھلی ہوئی میری طرف تکتی رہی تھیں اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا مگر میرے قدم پاتال کی طرف کیوں اُکھڑ رہے ہیں۔ میں گر کیوں رہا ہوں اور میرے قدموں میں بار بار وہ نگاہیں کیوں آ رہی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ شاید یہ گرمی کا اثر ہے۔

رات کی ماں

بڑی نہر کی چوڑی پٹڑی پر کھڑے ہوں تو ٹیلوں کے درمیان پیاروں کی بستی یوں دکھائی دیتی ہے جیسے کسی نے چھوٹے چھوٹے گڑیا گھر ادھر ادھر پھیلا کر رکھ چھوڑے ہوں۔ دور تک پھیلے کھیت پر ان کے سروں پر ابھرے ہوئے پیلی مٹی کے پہاڑ آدمیوں سے اٹھتا دھواں اور ایک گھر سے دوسرے تک آتی جاتی عورتوں کے قدموں تلے پچی پگڈنڈیاں بستی دور سے ایک سپنا سا جان پڑتی ہے۔ پٹڑی پر نہر کے ساتھ ساتھ سیدھے چلتے جاؤ تو راستہ شہر کی طرف اتر جاتا ہے اور اگر بستی کی طرف آنا چاہو تو ذرا جاہ کے لکڑی کے پل پر سے پیچھے کی طرف پلٹ کر ٹیلوں کی اونچی نیچی ڈھلوانوں پر سائیکل سمیت چلنا بہت مشکل لگتا ہے۔ جتنی یہ بستی ستھری ہے اتنا ہی اس کا راہ اکھڑ بکھڑا اور خراب ہے۔ پر بستی میں داخل ہونے پر ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ شیشم کے جھنڈ تلے نورو کمہار کا جھونپڑا لپا پتا صاف ستھرا جیسے ابھی چاک پر سے اترا ہو۔ جانے اس گھر کے گرد پیلے پن کا

احساس کیوں ہوتا ہے گیلا اور ٹھنڈا اور سکون دینے والا سنتے ہیں
ایک طرف گائے بندھی رہتی ہے اور کھمبا کے ساتھ کپڑے سے
جھولے میں بچہ سویا رہتا ہے۔ تو وہ لڑکی ہوجیا مچھریں بھگاتی ایسے
ہولے ہولے قدم دھرتی ہے مانو کچے رشتوں پر چل رہی ہو۔ اور
اسے ڈر ہو کہ کوئی ٹوٹ نہ جائے۔ کندن اس بستی کی لڑکی نہیں گل بھیا
اسے بہت دور سے بیاہ کر لایا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ
جب بستی کے دوسرے گھروں میں ساس بہو کی جنگ ہوتی ہے تو
بہوئیں آگے سے ہاتھ ہلا ہلا کر لڑتی ہیں اور ہر دوسرے تیسرے
مہینے ایک الگ جھونپڑا کسی ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو جاتا ہے مگر
کندن کسی بات کا جواب کبھی نہیں دیتی۔

پر جو بات میں کرنے جا رہا ہوں وہ ختم ہوتے بھادوں کے ایک
سویرے سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے شام گھٹا گھنیرے بادل
کے جال کی طرح بستی پر چھائی ہوئی تھی اور میں ڈاک کا کام نپٹا کے جا ہی
اپنی بستی کو لوٹ گیا تھا ساری رات بوندیں پڑتی رہیں اور صبح ہونے
کے قریب اولوں کی برکھا ہوئی میں سوچتا رہا تھا کہ اگر آج بارش نہ
رکی تو جانا مشکل پڑ جائے گا مدرسے کا سالانہ معائنہ قریب تھا اور
لڑکوں پر جان کھپانی ضروری تھی عزت کا سوال تھا، انسپکٹر نیا آیا

تھا اور کسی شخص سے رام نہیں ہوا تھا۔ لاکھ منت سماجت کی اس پر
کوئی اثر ہی نہیں ہو پاتا کام دیکھ کر خوش ہوتا، یوں آپ لوگوں کو پٹ
بے کہیں کام چور آدمی نہیں ہوں محنت بڑی کرتا ہوں پر لڑکوں اور بچہ
بستی کے لڑکوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا کبھی ہل چلانے کے پیسے وافر
آدمیوں کی ضرورت ہوئی تو اسکول سے رخصت لے لی کبھی ڈھور ڈنگر
بیمار ہو گئے تو ٹہل سیوا کے پیسے باپ بھائیوں نے روک لیا پھر سال
کے آخر میں ان کا نچلی جماعت میں پڑھنا بھی عزت کا سوال بن جاتا
ہے اور تم جانو لاڑ کرنا پڑ ہی جاتا ہے اور اسی پیشے میں آنے والے
سماج کے خیال سے فکرمند تھا مگر تیز ہوا گھٹا کو اڑا لے گئی روشن
چمکیلے رنگ برنگ کے بادل کوچ کرنے لگے جیسے فوجیں حرکت میں
ہوں۔ سورج کبھی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی اس کا ایک کنگرہ اس روشنی
اور چمک میں یوں دکھائی دیتا جیسے کسی کنواری نے گندم کے سنہری بالوں
کو دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر ذرا دیر کے لیے ابھر جھانکا ہو۔ نمی چاٹ
چکوں تو نئی نئی خوشبوئیں دھرتی کی باس میں مل بیٹھی مدھر سوگندھی گیت
کے بول کی طرح میرے گرد ہو گئیں۔ بھیگی زمین کسی پاگل عورت کی
طرح اپنے سارے خزانے سامنے سجا دیتی ہے ذرا دور سے بھوں
گیاس کی بیلیں اور لہرائی ہوئی خوشبوئیں کبھی سامنے کی طرف منہ کیے

چل رہے ہو تو گندم کی بالوں کی مہک ہوگی دوسری طرف منہ کرو تو
پانی پہ سے آتی ہوا کی نمی ہیں ملی ہوئی اونگھی نرالی باس ہوگی جس کو
پہچاننا مشکل ہوگا۔ آدمی گیلی بارش سے نہائی دھرتی پر چلتا آپ بھی
پاگل ہونے لگتا ہے پھر بھری ہوئی چھلکتی نہر کے کنارے ریشمی بوٹے
لہرا رہے تھے جیسے کسی راج رانی کا بجرا ان لہروں پہ بہتا جا رہا ہو
دھلے ہوئے درخت دنیا کا یہ انوکھا نرالا روپ۔

گنگناتے ہوئے میں نے ریشمی ٹیلوں اور دھلی ہوئی راہوں پہ
سائیکل موڑا، چماروں کی بستی کی طرف آتا ہوں تو مجھے بہت سی آوازیں
سنائی دیں جیسے کئی آدمی ایک ساتھ بولنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

کندن کی ساس بہت زبان دراز ہے ساری بستی اس سے
پناہ مانگتی ہے، عورتیں کہتی ہیں اچھا ہے جو اس کا گھر بستی کے ایک
سرے پر ہے اگر کہیں محلے کے درمیان ہوتا تو یہ سب کا جینا حرام
کر دیتی۔ عجیب طنطنے کی عورت ہے بولنے پر آئے تو بولتی چلی جاتی
ہے گالیاں اس کے منہ سے نکلتے میں ایک الگ زندگی بنا لیتی ہیں
اور اس سویرے کو جس کی بات میں تمہیں سنا رہی ہوں وہ کبھی جھونپڑے
کے اندر جاتی اور کبھی ابھر آتی پھر کوسنے ہیں، بیٹھی کندن کے سر پر ایک
دو ہتھڑ مارتی اور پھر اندر چلی جاتی۔ کبھی کاسے کو کھولنے اور پھر لے

باندھ دیتی۔ کندن کی بے بیاہی نند جو بڑی عمر کی عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر گالیاں بک رہی تھی جو اس کی ماں کی گالیوں سے شور میں مل کر اور جنون پیدا کر رہی تھیں۔ جگل خان کھاٹ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا جو اس کی ماں اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی اور اپنا سر پیٹنے لگتی۔ لڑتے ہوئے گالیاں بکتے آدمی دیکھنے والے کو بالکل پاگل لگتے ہیں ایک دم دیوانے میں یہ تماشا سمجھنے کی کوشش کرتا اور ان گیروں کے ساتھ بہت دیر کھڑا نہیں رہ سکا۔ اسکول کا وقت ہو چکا تھا اور پھر ایسے ہنگامے تو بستی میں روز ہوتے ہیں۔

شام آموں کے بوڑھے باغ کی طرح بوجھل بوجھل سی میرے گرد ان درختوں کے گھیرے ہوئے سایوں کی طرح پھیل رہی تھی میرا دل یوں ہی اداس تھا رات سے میرے بچے کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ میں دوا لے کر جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا مگر میرا کام باقی تھا اور حکیم کی دوکان دوسری بستی میں تھی۔ میں خطوں پر مہریں لگا کر انہیں تھیلے میں ڈالتا جاتا تھا۔ آخری کارڈ پر مہر لگا کر میں نے ذرا آسودگی کا سانس لیا اور جھٹکے کا ایک کش لے کر جو تھیلے کی ڈوری کسنے لگا ہوں تو میں نے باغ کے دوسرے کنارے سے کندن کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ شام کے سرخ سایوں اور آم کے پیڑوں کی تاریک چھاؤں میں چلتی سب مجھے

خوشبو کا ہیولا لگی۔

"منشی کاکا" ایک کارڈ لکھ دو" اس نے میرے پاس آکر کہا۔

"کیوں کیا ماں اور بھیا کو بلوانا ہے" میں نے قلمدان کھول کر دوات میں قلم ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں منشی کاکا اب انہیں کا ہے روز روز بلواؤں" اس نے مختصر سا مسکرا کر کہا اس کی یہ مسکراہٹ جیسے چاندنی گھنیرے بادلوں کی اوٹ سے چھن کر آئے اور بھی اداس کر گئی۔ "مجھے کیا لکھوا گی۔" میں نے کارڈ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا

ماں کو لکھنا ہے کاکا کہ میں راضی خوشی ہوں اچھی طرح سے ہوں سنی سنائی بات پہ اعتبار نہ کریں۔ میں لکھنے لگا کھیتوں پہ کی ہوا بڑی سہانی تھی اور پیڑوں میں سے چھنتی لال روشنی میں ملی کندن کے زرد گالوں دھلی دھلی آنکھوں اور بھورے بالوں کو چھو رہی تھی۔

لکھ کر میں نے پوچھا اور کیا ہو۔

کہنے لگی "کاکا ماں اور بھیا کو بہت تاکید سے لکھ دو فکر نہ کریں بھاگے نہ آویں۔ فصل پیچھے میں آپ آؤں گی فکر نہ کریں بالکل" وہ سارے لفظ سنبھل کر یوں کہہ رہی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ میں اس کی سب باتیں لکھ نہ پاؤں گا۔ کہہ نہ سکوں گا میرے قلم میں وہ زور نہ ہوگا

میرے لکھنے کے باوجود اس کی ماں اور بھیا تشویش کریں گے۔"

سرسوں کے پھول کی طرح کھلی ہوئی گندمی رنگ سوا داس گھر میں

کھلی رہتی تھی۔

کارڈ لکھ کر میں نے اسے سنا دیا۔

کہنے لگی۔ "کاکا ذرا اچھی طرح لکھنے کہ ماں اور بھیا میں سے

کوئی آ جائے۔

میں نے کہا "اب پتہ لکھواؤ میرا بچہ بیمار ہے اور مجھے دیکھتے

ہوئے گھر جانا ہے۔"

شرمندہ سی ہو کر بولی۔ "سویرے بستی میں میرے میکے کا آدمی

اپنے کسی کام سے آیا ہوا تھا۔ روز کی طرح آج بھی ہمارے گھر سویرے

سے مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ اس نے بھی سنا ضرور ماں سے جا کر

کہے گا اور وہ بھاگی ہوئی آئے گی ہو سکتا ہے بھیا کو بھیج اور تم جانو

کاکا فصل کے دن ہیں پھر میری ساس کسی کا لحاظ تو نہیں کرتی ناحق

میں بے عزتی ہونے کا فائدہ؟"

کارڈ پر پتہ لکھ کر تھیلے کی ڈوری کستے ہوئے میں نے کہا کندن

بی بی تم بھی عجیب ہو۔ دنیا کی لڑکیاں کا نام بھی چھپتا ہے تو ماں باپ

کو پکارتی ہیں۔ ایک تم ہو کہ روز بہ روز ہوتی ہے پٹتی ہو مگر ماں

اور بچا کے اسے بڑے بھید کی طرح چھپا کر رکھتی ہو۔"

کہنے لگی "کاکا یہ ساری تو بھرم کی بات ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ یہاں کا مان بیکار کا بول سمجھنے لگے اور پھر اچھی بُری یہاں رہتے گی تو انھیں بُلوا کر کیا کروں گی۔ یہ تو ماننے کا لکھا ہے کبھی سو دیا ہو گا سہی۔"

حکیم صاحب کے پاس پہنچا ہُوں تو بہت بھیڑ تھی ان کی بستی میں کسی گھر میں بہو ساس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ پھر سمدھی آپس میں جھگڑ پڑے۔ دونوں خاندانوں میں خوب لاٹھی چلی۔ سارا گاؤں امنڈ کر حکیم صاحب کے دروازے پر جمع تھا۔ جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ میں نے حکیم صاحب کو کندان کی بات بتائی۔ "کہنے لگے اس کل جگ میں بھی کہیں نہ کہیں کوسنتوتی ہے مگر میری بات یاد رکھو وہ ایک نہ ایک دن ہمت ہار بیٹھے گی۔ سہار کی ایک حد ہوتی ہے اگر تم جو کہتے ہو وہ ٹھیک ہے تو میں اس کی داد دیتا ہوں۔"

دو دن کے بعد اسٹیشن پر ڈاک پہنچاتا ہوا جب بستی میں پہنچا ہُوں تو میری شام اندھیری اور رات پریشان تھی۔ میرا بچہ بہت ہی بیمار تھا میں نے اسے لاکھ بُلایا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور وہ دیے بجھ گئے۔ وہ دیے جن کے ہونے سے میری دُنیا میں روشنی تھی۔

زندگی میں کڑی محنت اور سارا سارا دن گھر سے باہر رہنے سے مجھے
ایک خیال ہوتا تھا کہ گھر جا کر مجھے سے دل بہلے گا مگر بیٹے والے
کو بیاہنے کیا منظور ہوتا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا روکنے والے
کہتے ہیں وہ بے انصاف نہیں ہے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
اگر وہ بے انصاف نہیں تو بے پروا ضرور ہے۔ ورنہ میرا دل
کسی طرح سے نہیں بہل سکا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد میں نہر کے ساتھ ساتھ سائیکل چلاتا آ
رہا تھا اور معاشرے کے متعلق سوچ رہا تھا جب کنارے کے سرکنڈوں
اور بوٹیوں میں حرکت ہوئی ایک عورت نے ہاتھ کے اشارے سے
مجھے روکا۔ میں حیران سا سائیکل سے نیچے اتر آیا۔

بیٹا میں گندان کی ماں ہوں پیارو کی بہو گندان کی ماں گل خان
کو تو تم جانتے ہو گے وہ میری ہی بیٹی کو بیاہ کر لایا ہے۔

میں چپکا کھڑا رہا۔

بیٹا وہ روز اسے پیٹتے ہیں یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ وہ پیٹ سے
ہے اس کا یہاں کون بیٹھا ہے جو اس کی مدد کرے گا۔ کسی نے مجھ
سے کہا ہے تم منشی ہو اسکول میں پڑھاتے ہو۔ اور منشی پڑھے لکھے
ہوتے ہو۔ میں سویرے سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ میں پیارو

پر مقدمہ کرنا چاہتی ہوں انھوں نے میری سونے جیسی بیٹی کا مار مار
کر بُرا حال کر دیا ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا ماں جب تمہاری اپنی بیٹی تمھارا ساتھ
نہیں دیتی تو تم مقدمہ کس طرح کر سکتی ہو۔"

وہ بولی بیٹا اس میں ہنسنے کی بات نہیں اس پر تو انھوں نے
جانے کیا جادو ڈال رکھا ہے کہ ہم اسے پرائے لگتے ہیں۔ سدا سے
وہ ان کے جادو میں قید ہے۔ گل خان کو جس دن گھر میں نوکر رکھا تھا
اسی دن سے میرے دل میں چور تھا کہ یہ کچھ ہو کر رہے گا جادوگر
میری بچی کو اتنی دور لے آیا حالانکہ جب اس نے منت کر کے
مجھ سے میری بیٹی مانگی ہے تو کہتا تھا میں یہیں رہوں گا تب تو
اس کے منہ میں زبان نہ تھی اور آج اس کے ہاتھ بہت لمبے
ہو گئے ہیں۔

حالانکہ اسکول پہنچنے کی جلدی تھی میں وہیں نہر کے کنارے
بیٹھ گیا۔

ماتھے کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا بیٹا۔

اور آج مجھے لگتا ہے کچھ تحریریں ہوتی ہیں جو ہماری تمہاری
سب کی پیشانی سے چپکی رہتی ہیں۔

جب شہر میں متعدد جلاپے تو بستی میں طوفان آگیا۔

ایک دو پہر اسکول بند کر کے آدھے دن کے بعد میں گھر جا رہا تھا کہ گندن بچے آدمیوں کے پاس کھیت سے پرے ملی۔ بڑی اداس اور سہمی ہوئی سی۔ کہنے لگی "منشی کا کا تم نے ان کو شہر جا کر متعدد کرنے کا راہ دکھایا۔ اور لوگ میرا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے قصوروار سمجھتے ہیں بتاؤ میں کیا کروں؟ ماں سے میں نے کہا تھا کہ میں اتنی خوش ہوں پر اللہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ تمہارا لکھا خط دیر سے پہنچا ہوگا نہیں تو اس آدمی کے لگے وہ کبھی نہیں آتی تھی اور اب اس نئی مصیبت کا مقابلہ کون کرے"۔

میں نے اسے تسلی دی۔

مگر وہ کہنے لگی "کا کا میری ساس کی زبان مجھے اس گھر میں ٹکنے نہیں دے گی میں نے گل خان سے کہا تھا کہ ہم الگ رہ لیں گے مگر اسے تو گھر لوٹنے کا جنون تھا میرے بھیا نے اسے الگ سے زمین دی تھی مگر اسے تو مجھ سے بیر تھا میرا سکھ اس سے دیکھا نہ گیا۔

میں نے کہا "گل خان برا آدمی نہیں ہے۔

گندن نے کہا "میں کب کہتی ہوں کہ برا آدمی ہے پر میری حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس کی ماں مجھے جینے نہ دے گی۔ وہ اپنی ماں

کے کہنے سے مجھ سے بولتا نہیں اور اب وہ اس کی موسی کی بیٹی سے اس کی دُعا خیر کرنے والے ہیں۔

گل خان میرے اسکول میں چار جماعت تک پڑھا ہوا اور بہت اچھا طالب علم تھا، اس لیے میں نے اس وقت کندن سے وعدہ کیا کہ میں اس سے بات کروں گا اسے سمجھاؤں گا مگر جب ایسی باتیں ایک بار چل نکلتی ہیں تو پھر رواں رہتی ہیں موسی کی بیٹی سے شادی کی نئی بات جب سنی گئی ہے تو طے ہی ہو گی۔

میں سائیکل تھامے ہوئے ہرے فصلوں کے اندر بنے موہوم لکیروں کے سے راہوں پہ سے گزرتا جاتا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کندن ان عورتوں میں سے تھی جنھیں کتابوں میں ہم نے ستی ساوتری کے نام سے پڑھا ہے اس میں راجپوتوں کی سی آن بان کے ساتھ ایک خود سپردگی کی ادا تھی جو صرف محسوس کر سکتا اور مجھے پورا یقین ہے۔ گل خان کو اس کی اس ادا کا پتہ تک نہ ہو گا کیونکہ محسوس کرنے کی قوتیں بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ ذہن تو یہ سب باتیں سوچ سکتا ہے ایک عام آدمی نہیں۔ کندن عام عورت نہ تھی اس کے رونے میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور اس کے شکایت کرنے کے انداز میں بھی خودداری تھی۔ جس دن کندن نے عدالت میں جا کر

بیان دیا کہ اسے گل خان سے کوئی شکایت نہیں اس دن اس کی ماں
کو میں نے دیکھا۔ وہ اکیلی تھی اور کندن کی طرف دیکھے بنا اندر سے نکل
چلی گئی۔ جیسے اس کا کندن سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ گل خان اور اس
کے رشتے دار زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے عدالت کے احاطے
میں گھومنے لگے۔ میں نے ذرا دور جا کر اسے پکارا "موسی"۔

وہ کھڑی ہو گئی مگر میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی دشمن ہوں۔
"موسی" میں نے کہا "تمہیں کندن کے بیان سے صدمہ تو بہت
ہوا ہوگا۔ ساری محنت اور پیسہ برباد ہو گیا مگر میں سمجھتا ہوں وہ ہر
قیمت پر اپنا گھر آباد رکھنا چاہتی ہے تم کو تو اپنا فرض پورا کرنا تھا
سو تم نے پورا کر دیا۔"

وہ ایک گرے ہوئے درخت کے سوکھے تنے پر بیٹھ گئی اور
ماتھے پر سے پسینہ پونچھتی ہوئی کہنے لگی "رونا تو یہی ہے کہ وہ جس
گھر کو آباد رکھنا چاہتی ہے وہ آباد نہیں رہ سکتا بیٹا جب عورت اور مرد
کے درمیان لحاظ کا پردہ نہ ہو تو زندگی حرام ہو جاتی ہے مجھے تو شروع سے گل خان
کی بد لحاظ طبیعت کا پتہ تھا مگر کندن کے دل کا خیال کر کے میں نے
اس کی منگنی پہلی جگہ سے چھڑا کر اسے یہاں بیاہ دیا۔ میرے گھر میں
اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور یہاں یہ نوکرانیوں سے بدتر وقت گزار

رہی ہے۔ میں نے ہر شے کو صبر کر لیا تھا مگر اس پیار بھرے بیٹیں
کیسے سہ لوں اسے یہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی تو مجھے ملے گھر کی
خوشی بس انھیں کے دم سے تھی۔ بیٹا اولاد کا ڈکھ بڑا ہوتا ہے۔"

وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

میں تو انھیں نصیحت دینا چاہتی تھی کہ پھر میری کندن کو تنگ نہ
کریں۔ میرا مطلب مقدمہ کرنے سے کوئی اس کا گھر اجاڑنا نہیں تھا جب
وہ راضی خوش ہے تو بس اب میں بھی جیتے جی اس کا منہ نہ دیکھوں
گی۔ میں نے سوچا وقتی غصہ ہے جاتا رہے گا۔ کہیں مائیں بھی ایسے
دعوے نبھا سکی ہیں۔

اس شام مقدمہ جیتنے کی خوشی میں چاروں کی بستی میں رت جگا
ہوا، گل خان اور اس کی ماں بہت خوش تھے۔ کندن کی نندیں جو پرے
کی بستیوں میں بیاہی تھیں آئی ہوئی تھیں۔ اور کھانوں پر لدی بیٹھی تھیں،
اٹھتیں تو اپنے گھا گھرے سنبھالتیں، مٹک مٹک کر اٹھتیں اور ناز
سے چاروں طرف دیکھتیں۔ ان کی آنکھوں میں غرور کی جوت سی تھی جو
ستاروں کے ماتھے پر آئے دوپٹوں کے ساتھ مل کر اور بھی گہری
لگتی تھی، ڈھولک بجاتی عورتیں اور راگوں کے تانوں کے پھریرے
اڑاتے بولوں سے انھوں نے ایک رنگ پھیلا رکھا تھا یہ جیت کی

خوشی کا اونچا تہوار تھا جس میں کنداں یوں چلتی تھی جیسے خواب میں
ہو۔ جیسے کوئی اکیلی اکیلی ویرانوں میں گھومنے والی روح کی سی اداسی
اس کے چاروں طرف تھی کبھی ایک جگہ بیٹھتی اور پھر آپ سے آپ
اُٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھتی۔ کوئی اس سے بات ہی نہیں کر رہا تھا یوں
لگتا تھا جیسے وہ کسی کو دکھائی ہی نہ دیتی ہو اس کا وجود کہیں ہو ہی
نہیں گل خان کی ماں اپنی بہن کی بیٹی پہ پیسے روپے وار کر نقارہ بجانے
والے کی بیوی کو پکڑا رہی تھی اور ہنستی جاتی تھی۔ پھر لڑکیوں نے
سوانگ بھرے ناچنے والیوں کے گرد دائرہ تنگ ہو گیا۔ تالیاں
تیز ہو گئیں اور تالیوں کی آواز پھر شے پہ بسنے لگے۔ جاتے جاتے
میں نے کہا۔

گل خان تمہاری عورت بہت نیک مزاج ہے اس کی قدر
کیا کرو۔

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا وہ صرف مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ
جانے کیوں مجھے ایسی لگی جیسے کسی نے تیز دھار چھری کو اندر چھپا رکھا
ہو وہ مسکراہٹ مجھے بڑی بے معنی اور منحوس معلوم ہوئی جیسے خوشی
کے گھر میں اچانک کسی نے چیخ ماری ہو مجھے گھر جاتے تک وہ
مسکراہٹ یاد آتی رہی۔ اس کے جواب کے بعد وہ بنا سلام کیے

پھر اٹھا اور اندر چوکھنڈی میں چلا گیا جہاں رشتے کی جوان لڑکیاں تھی
بہوئیں اور ہمسایہ بستیوں کی عورتیں ایک راگ گیت گا رہی تھیں
اور پاؤں کی جھانجھروں کی صدا شور میں سے زیادہ پر رونق معلوم
دیتی تھی۔

جیسا کہ میں آ گیا تھا گندم کے سنہری کھیت تاحد نظر پھیلے ہوئے
تھے۔ کسی کسی بستی میں لوگ فصل کاٹ کر ڈھیری لگا چکے تھے۔ کہیں
تیاریاں ہو رہی تھیں اور دنیا ایک خواب کی سی دنیا لگتی تھی۔ ناقابل
یقین خوبصورتی اور خوشبو سے بھری اور گرم جلتی ہوئی مانو کسی شعلے کی
لپیٹ میں آنے والی ہر ہر شے پر آگ لگتی ہوئی لگتی تھی جیسے الاؤ جلنے
والا ہو۔ سورج آسمان کے اندر سفید شعلہ تھا۔ دھوپ گرم ندی سی بہتی
ٹوٹی سڑکوں میں خاک اڑتی تھی اور کوئلیں آموں کے اندر چھپی کو ہو کو ہو
بولتی تھیں۔

مدرسے میں فصل کی چھٹیاں ہو گئیں۔ میں صرف ڈاک کا کام نمٹانے
دن چڑھے آتا تو کھیتوں میں رنگ برنگے آنچلوں کے پھریرے اڑتے
ہوتے۔ عورتیں ایک دوسری سے بڑھ کر ہاتھ مارتے اور دانوں کے ڈھیر
کو اونچا کرنے میں دھوپ کو بھول کر لگی ہوتیں۔ جوان لڑکیاں سر پہ
روٹیوں اور لسی کے گھڑے لیے کھیتوں کو جا رہی ہوتیں۔ میراثی گھوڑوں

پر چڑھتے کھیتوں کے کنارے کنارے گھومتے اور تجربات مانگتے
جوانوں کے سنولائے ہوئے چہروں پر آنے والی خوشیوں کے سائے
جیسے اندھیرے کے دامن پر کرنیں کانپتیں۔ کھوئی کھوئی سی سنبھل کر
چلتی مٹیاریں، شور مچاتے بچے اور جوان کے۔ ساتھ ہم آہنگ نقاروں
کی آوازیں۔

اس دن جانے میرا دل یونہی پریشان تھا۔ اس سے پہلے دن
گُل خان کی ماں نے برادری والوں کو بلایا تھا اور خط لکھوائے تھے کہ
فصل کے بعد آکر فیصلہ کریں وہ اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی تھی۔
میں ڈاک کا تھیلا سائیکل کے کیریر پر رکھے ہوئے ہولے ہولے پیڈل
مارتا کھیتوں میں سے اپنے گاؤں جا رہا تھا اور گل خان کے لیے فکرمند
تھا۔ میرے جی میں بار بار یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ پیدا ہی نہ
ہوئی ہوتی۔ وہ پردیس سے آئی ہوئی مٹیار جیسے غیر زمین میں اگا پودا۔
کہیں دور سے باغوں کے اندھیرے سے کوئل کی کوک سنائی دی:
بھری دوپہر میں آٹے کی چکی بھک بھک کرکے چلتی تھی اور اس کی آواز
ویرانوں میں اکیلی ہوتی تشنہ روح کی پکار کی طرح میرا جی اداس کر گئی۔
ٹیلے سے مڑ کر جب اپنی راہ پر گھوما تھا تو میں نے گل خان کو دیکھا
وہ ایک ہاتھ میں درانتی لیے اور دوسرے میں گندم کی مٹھ پکڑے

کھڑی تھی جیسے کوئی تصویر ہو۔ بالکل خاموش اور بے حس بے جان جیسے وہ زندہ نہ ہو صرف میرا خیال ہو۔ دوسری لڑکیاں اس سے ذرا پرے گاتی اور بولتی گندم کاٹنے میں لگی تھیں اور ایک دوسری سے چہلیں کر رہی تھیں۔ ان کی آوازیں درانتیوں کی کرکے اوپر جیسے ساز کے ساتھ گیت ہو سنائی دیتی تھیں۔ مگر وہ بھری دوپہر میں سورج کی روشنی کے نیچے ایک ٹک رہی تھی پھر کوئی ان کی کو ہو کو جو کہیں قریب سے آئی۔ کندن کا سارا جسم کان بنا ہوا تھا۔ جانے وہ اس کو ہو کو سن رہی تھی۔ کون سے دیس کا گیت کونسا بھولا بسرا نغمہ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش میں ہو۔ اندھیروں میں جھانک رہی ہو۔ اس کے چہرے پر سے سائے گزرنے لگے۔ پہلے آکر اس سے بات کرنے کو میرا جی چاہا۔ پھر میں نے مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔

فصل کٹ گیا۔ جاٹ شادیوں اور ہنگاموں کے لیے زیور، کپڑا خریدنے میں لگ گئے۔ بازاروں میں اپنے گھاگھرے گھماتی ٹیاریں پھولوں والے جوتے پہنے اور لمبی چادریں لیے عورتیں کاؤنٹر پر بیٹھ کر ریشمی تھانوں کو ہاتھ لگا کر دیکھتیں اور بھاؤ تاؤ کرتیں مٹھائی خریدتیں اور اپنے جسموں، سانسوں کی خوشبو پیچھے چھوڑتی چلی جاتیں۔ بازار رنگ اور نور سے بھرے لگتے تھے۔ گرمی اب اپنے شباب

پڑتی۔ وہ چلتی تھی اور لوگ بادلوں کی راہ دیکھتے تھے۔ اڑتی خاک سے بیزار تھے۔ سورج سوا نیزے پر کھڑا رہتا۔ راتیں لیقیوں میں ہوا اور گیتوں اور بنسریوں کی باتیں سے کرتی ہیں۔ گلی گلی ایک میلہ سا لگتا۔

گل خان مجھے ملا تو کہنے لگا "منشی جی آپ کندن کو سمجھائیں ہم اب زبان دے چکے ہیں مگر وہ سمجھتی نہیں فساد کرتی ہے۔"

"کا ہے کی زبان" حالانکہ میں سب سمجھتا تھا مگر میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہی جس کے لیے ماں نے آپ سے خط لکھوائے تھے منشی جی۔ پھر ذرا جھینپ کر وہی بولا "میری شادی کا قصہ" میں نے کہا "کندن کے ہوتے تم ایسا کام کیوں کرتے ہو۔ اس میں کوئی کمی نہیں۔ اس کی صورت ایسی ہے کہ دیکھا کرو ہاتھ لگانے سے میلی ہونے والی رنگت ہے۔ تم کس لیے اس کے ہوتے دوسری لا رہے ہو اس سے کیوں بیزار ہو۔"

گل خان وحشیوں کی طرح ہنس کر بولا "کام کے اور بونے کے کام میں جتنی زیادہ جانیں ہوں اچھا ہے۔" یہ انسانی رشتوں کی منطق مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آتی اور پھر ان کا الجھاؤ مجھے اور بھی گھبرا دیتا ہے۔

ماں کا بیٹی سے رشتہ، باپ کا بیٹے سے، شوہر کا بیوی کا اور پھر ان رشتوں بیچ پھیلا دیں دیواریں اور دشواریاں اور کبھی نہ آنے والی گتھیاں، جھگڑے اور بیزاری اور ایسی مسکراہٹ جو ہنسی کے قریب ہونے پر بھی تیز دھار آرے کی طرح لگتی ہے۔

"منشی جی اسے کہیں فساد چھوڑ دے۔" اس نے بازار میں ایک کپڑے کی دکان پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں اسے جواب دیے بنا آگے بڑھ گیا۔

جب بھی اسکول آتے میں ان کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو پیڑ کا جھولا نہ ہوتا جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کئی دن کہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ البتہ اس کی سندریں تیز آواز میں ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرتی درختوں تلے گھومتی دکھائی دیتیں۔ میرا دل آنے والے غم کے بوجھ سے بیٹھا جاتا۔ کیوں بیر گل خان کی شادی کو بہت بڑا سانحہ سمجھنے لگا تھا۔ حالانکہ بہت عورتیں اس غم سے دوچار ہوتی ہیں۔ مگر مجھے لگتا تھا کہ دن یہ سب دیکھنے کے لیے نہیں بنی۔ ایک شام جب میں حکیم صاحب سے مل کر بستی سے باہر نکلا ہوں کہ وہ مجھے دکھائی دی۔ فاصلہ کی وجہ سے میں دوسری عورت کو پہچان نہ سکا۔ بستی کے باہر ٹیلے کے کنارے دونوں بیٹھ گئیں۔

"میں اب بھی کہتی ہوں بی بی مت جاؤ رات ہی ہو گئی ہے کہاں کہاں جاؤ گی گیدڑ نہ گھسیٹ لیں۔" دوسری جٹیار نے پیچھے سورج کی لالی کی طرف رُخ کر کے کہا۔ ٹوبے میں دونوں کا عکس تاریک پانی پر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہوتے ہوئے کانپ رہا تھا۔

کندن نے ہنس کر کہا "میں تو رات کی ماں ہوں مجھے کوئی شے نہیں گھسیٹ سکتی۔"

بچہ سویا ہوا تھا اور اس کے کندھے سے لگا تھا۔ میں سلام کر کے اس کے پاس سے گزر گیا۔ اپنے راہ پر جاتے ہوئے مڑ کر میں نے دیکھا تو وہ ہرنی کی طرح اکیلی اکیلی خالی کھیتوں کی منڈیر ہاں پر سے پرے اپنے اردوں کی بستی کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں اس کے لیے نہ سکھ تھا اور نہ محبت۔

اس شام مجھے اپنا راستہ اور دنوں سے زیادہ لمبا اور تھکا دینے والا لگا۔ میں زندگی اور دکھوں اور آنے والے غموں اور غمّوں کی سہار اور جانے کیا کیا سوچنے میں لگا تھا اور بہت ہولے ہولے چل رہا تھا کبھی کبھار آدمی کو زندگی پرائے بوجھ کی طرح لگتی ہے اور جی چاہتا ہے اسے اُتار پھینکیں۔ چاروں طرف اندھیرا دکھائی دیتا ہے مگر پھر بھی چلتے ہی جانا ہوتا ہے اس اندھیرے بھی چاہے کندن کہے کہ وہ

رات کی بات ہے اور چاہتے ہیں کہاں کہ ہیں چل سکتا جہاں سبھی گھیرا جاتے ہیں۔ گل خاں کی شادی اور رت جگے اور خاندانوں کی ناک کا سوال بنے لگا ایک جھمیلا ہے جس میں پھنسے ہوئے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آدمی جیتا ہے۔ کوئی چار دن کی بات ہے میں اسٹیشن سے ڈاک لے کر اسکول آ رہا تھا کہ میں نے گل خاں کے گھر کے پاس بہت لوگوں کو اکٹھے دیکھا۔ پاس گیا ہوں تو میں نے کندن کو دیکھا وہ بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ بچہ سہما ہوا سا کبھی بلک بلک کر رونے لگتا اور کبھی اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے چومنے لگتا۔ کندن کی آنکھیں بند تھیں اور آنسوؤں کی ندیاں اس کے زرد گالوں پر بہہ رہی تھیں۔

آگے بڑھنے کی بجائے میں پیچھے کھڑا رہا۔ بھلا میں اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟

"بیٹی گھر جاؤ یہاں راہ پر سے اٹھو۔" بستی کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کی بانہہ پکڑتے ہوئے کہا "چاچا تم لوگ مجھے کیوں پریشان کرتے ہو۔ کہیں نہ کہیں تو جاؤں گی ہی آخر۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے تم لوگ راہ پر بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے کندن کی ساس کو دیکھا کہ بھیڑ کو

پھر کر آگے بڑھی اور کہنے لگی "اس بستی میں اب تیرا کون یار بیٹھا ہے
جس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ جا اٹھ یہاں سے کیا رونا ڈال رکھا ہے۔
اسے گل خان کیا ساری عمر تیرے پلّو سے بندھا رہتا۔ اگر میں اس کی
شادی کر رہی ہوں تو کون سی قیامت آ رہی ہے تو نے رو رو کر کیا نحوست
پھیلا رکھی ہے ڈائن۔ کیا میکے میں تیرا کوئی نہیں جس کے پاس جائے۔"
کندن نے آنکھیں پونچھ لیں جیسے سے کراہی، ہچکی اور کہنے لگی۔
"میکے والوں کو تو کچھ نہ کہہ میرا تو ایک ہی بھائی ہے اسے میری بھی
زندگی لگ جائے اور جتنے بیٹے ہیں سب تو ان کے ساتھ
تیرے بڑے بگاڑ لی ہے۔"

بچہ جانے کیوں ماں کو گلے لگا رہا تھا اس کا منہ اپنی طرف
کر کے چومنے لگتا۔ اس کی گالوں اور گردن پہ پیار کر رہا تھا "ماں نہ رو۔
ماں بول۔ ماں چل۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا اور ایک خیال رہ رہ کر
ڈسنے لگا۔ کندن کی صورت پر ایسی بے چارگی تھی ایسی مایوسی جیسے
اسے اب کوئی آس نہ رہی ہو۔

کھڑے ہوئے لوگوں کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیا کہیں۔
سب چپ تھے گل خان کی ماں سے سبھی ڈرتے تھے۔

میرا جی چاہتا تھا اسے دلاسا دوں مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ پھر
مجھے جلدی بھی تھی اور اس لیے لوگوں کی بھیڑ میں اسے بیٹھے چھوڑ کر
میں آگے بڑھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ آج شام یا کل صبح کہیں اسے ملوں
گا تو ضرور سمجھاؤں گا کیوں مفت میں جان ہلکان کر رہی ہے۔

ڈھلتے دن میں پکی سڑک کی چمک سے بچنے کے لیے منہ اور سر
کو تولیے سے لپیٹے اپنی بستی کی طرف جا رہا تھا۔ جب چیخ پکار اور
بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر دفعتاً ننگے پاؤں تپتی
ہوئی اور ندی کی طرح بہتی سڑک پر سے یوں گزرا جیسے اس نے اپنے
پیچھے آفتیں دیکھ لی ہوں اور بھاگا جاتا ہو۔ پھر دکانیں چھوڑ کر پیسیوں کی
پرواہ کیے بنا دکاندار سیٹھ یہاں سے کھوہ کی طرف جانے لگے۔ ہائے
ہائے اور زور زور سے پکارنے کی آوازیں سن کر میں بھی سائیکل پر
سے اترا اور اسے تھامے تھامے ریت کے ٹیلوں پر سے کھوہ کی
طرف جانے لگا۔ جانے کیوں میرا دل سینے میں یوں دھک دھک
کر رہا تھا جیسے کوئی گھنٹہ ہو۔

لوگ حواس باختہ پیاروں کی بستی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کچھ
جوان آدھے آدھے جھکے کھوہ میں جھانک رہے تھے۔ پھر میلہ
سا لگنے لگا۔ منڈیر کے ساتھ ایک بچے کا منہ کیا ہوا جوتا اور

کپڑے پڑے تھے پھر ایک عورت کا جوتا تھا جس میں اندر اس کے پاؤں کی جھانجھریں گلے کے تعویذ اور ایک انگوٹھی تھی۔

میں یہ سارا عرصہ دعا کرتا رہا میں کندان کا خیال بھی جی میں لا رہا تھا مگر وہ روتی ہوئی بچے کو اٹھائے ہوئے ڈھلی ڈھلی آنکھوں کو پھیکی اداس صورت کے ساتھ ہر گھڑی میرے سامنے آن کھڑی ہوتی۔

غوطہ خوروں نے کوئی ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد دونوں ماں بیٹوں کی لاشیں نکالی تھیں۔ وہ اس کے سینے پر اس کے دوپٹے سے بندھا تھا۔ دونوں روتے ہیں تھک کر سوئے لگتے تھے بچے کی بانہیں ماں کے گلے میں تھیں جیسے کہہ رہا ہو "ماں نہ رو"

ٹیلوں پر سے پاروں کی روتی ہوئی عورتیں کندان کی سر بٹتی ہوئی اور بالوں میں خاک ڈالتا گل خان یوں اترے جیسے فوج کی طرح اسے واپس لانے آئے ہوں۔

نمبرخاں نے کہا "ہوئی ہو کے رہتی ہے ماسٹر صاحب میں نے دوپہر تک اسے اپنے گھر میں بٹھائے رکھا۔ میری سوانی نے اسے سمجھایا تو کہنے لگی ماسی پاروں کی بستی کے باہر میرے لیے کیا رکھا ہے ماں اور بھائی کو میں نے ان کے بدلے ناراض کیا۔ اب کیا منہ لے کر ان کے پاس جاؤں اور جاؤں بھی کیوں۔ جن راہوں پر میں نے سکھ

کے سپنے دیکھے تھے آج ان راہوں سے بے آس کیوں لوٹ جاؤں۔"

پھر بچے کو پیار کرتی اور رو رو کر سینے سے لگاتی ہوئی کہنے لگی: "جم ذرا بیاں سے لوٹ کر کہاں جائیں گے یہاں رہیں گے۔"

کھانا کھلا کر میری بہو نے کہا "کندن تو اب چار گھڑی آرام کر جا۔ گھر میں تیرے گھر کی سی ٹھنڈک تو نہیں پر ذرا سو جا۔"

کہنے لگی ذرا باہر کیکر تلے سوؤں گی یہاں گرمی ہے بچہ آرام نہیں کرے گا اور چھوٹی کھاٹ اٹھا کر کیکر تلے لیٹ گئی۔

دفعدار اکیلا بہکا ہوا آدمی ہے دنوں وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ کندن کا نام آتے ہی وہ ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتا اور کھڑا ہو کر چاروں طرف یوں نگاہ پھیرتا جیسے وہ ان ریت کے پہاڑوں کو اور دور تک پھیلے کھیتوں کو ان پت جھڑ سے تقریباً ننگے درختوں اور اس سے بھی پرے آم کے باغوں کو آخری بار دیکھ رہا ہو پھر ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کرتا اور آہ بھرتا اور سر جھکا لیتا۔

پہلے پہل تو مجھے اس کی یہ حرکت سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر جیسے کسی کو الہام ہو۔ میں نے جانا کندن نے حسرت سے آخری گھڑی اس رستی بستی سدا سے آباد اور بے پروا دنیا کو دیکھا ہوگا۔ ان بستیوں پر نظر کی ہوگی جن راہوں پر وہ بے خطر آزاد پرندے کی طرح گھومی پھری اور بیتی

راہیں جن پر سے گزرتے وہ اندھیرے میں اپنے آپ کو رات کی ماں کہتی۔

یہ ٹھنڈی ہوائیں اور کھوہ اور ان کی نالیوں میں چمکتا پانی زندگی بخش ٹھنڈا اور میٹھا یہ جسم کے ساتھ چھو کر اسے سکون دینے والی ہوا جب وہ کھوہ کی منڈیر پر بیٹھی ہوگی۔ تو اس نے یہ سب محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ جانا ہوگا کہ ان چیزوں میں اس کے لیے کوئی آس نہیں رہی اس کے اپنے جینے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہا۔ جانے وہ جوان ہوتے ہوئے بھی اتنی مایوس کیوں تھی؟

اور مجھے آم کے باغ میں بیٹھے جب خوشبو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے کبھی کبھار ایک چیونٹی دکھائی دیتا ہے جو میری طرف آتا ہے اور پھر قریب آکر جیسے ہوئے شام کی سرخی شفق کے رنگ اور رات کے اندھیرے میں گھل جاتا ہے۔

طوطا کہانی

تم کہتے ہو میں وہی ہوں مگر میں جنگلوں کی سوگند اٹھا کر کہتا ہوں یہ سب میرا واہمہ نہ تھا۔ بہت دنوں بعد جب میں گاؤں سے لوٹا ہوں تو اپریل پر طوطے یوں لٹکے ہوئے تھے اور چیخ رہے تھے۔ جیسے کبھی میرا سواگت کرنے کے لیے پنجرے میں بند طوطے چیختے تھے۔ مگر یہ خوشی کی سیٹیاں اور چہکار نہ تھی۔ یہ وہ صدائیں نہ تھیں۔ پنجرہ خالی تھا۔ بالکل خالی۔ میں نے دونوں پٹ کھلوائے۔ وہ سب آوازیں نکالیں جو میں انہیں بلانے کے لیے نکالتا تھا۔ پر اندر لگانے لگاتے ہوئے درخت کی ٹہنیاں سوکھی پڑی تھیں۔ اور وہ گھونسلے خالی تھے ویران جیسے شمشان ہو۔

تم اگر کہتے ہو۔ یہ محض اتفاق تھا۔ چیزوں کی نحوست کوئی شے نہیں ہو سکتی ہے؟ کون جانتا ہے بھائی اتفاق بھی کیا شے ہے! ویسے طوطے مجھے شروع سے ہی پسند ہیں۔

تم سب کی طرح مجھے کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ باری ایک

رشتے کی دادی تھیں۔ جنھیں ہم موسی ماں کہتے تھے۔ وہ میرے بابا کی موسی
ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار اپنی بستی سے نکلتیں تو ہمارے گھر کا چکر بھی کرتیں۔ ہم
سے بھی بات بہت کم کرتی تھیں۔ ہوتے ہوتے اپنی چھوٹی سی گٹھڑی سی
پیار کرتیں۔ اور جانے کیا سوچتی رہتیں۔ خشک وہ بہت تھیں۔ بچے آ ان
سے کہانی سنانے کا کہتے تو چپ ہو جاتیں۔ مگر میری اُن سے خوب بنتی تھی۔
آتیں تو رات ہمارے ہاں ضرور رکتیں۔ انھوں نے اور میں نے ایک الگ
دنیا بسا رکھی تھی۔ اور شام ہوتے ہی میں موسی ماں کا بستر الگ لگوا کر تاکہ
دوسروں سے دور ہو اُن کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ رسوئی کے سامنے
تخت پر بیٹھی اکٹھے ہوئے نانا دادوں میری موسیوں اور چاچیوں میں
بیٹھی گزرے وقتوں اور بیتے لوگوں کے قصے سنتی۔ کبھی کبھار اُن کی ہاں
میں ہاں ملا دیتیں۔ پھر رات ہوتی۔ اور تارے ایک ایک کرکے آکاش
کی نیلاہٹ میں کانپتے اُترتے نکلتے چاندنی رہیل کی نرم خوشبو پہ تیرتی
ہوئی ٹھنڈک سے پُرسکون اُجالے کا گھونٹ لگنے لگتی۔ میری بہنیں ذرا پرے
اپنے بستروں پہ اُدھم مچاتی اور گڑیوں کی باتیں کرتیں۔ میری ماں صرف
سی شور سن کر انھیں ڈانٹتی۔ پر میں اس رات راجا بنا اپنی جگہ سے
نہ ہلتا۔ شور اور لڑائی میں حصہ نہ لیتا۔ مجھے صرف موسی ماں کا انتظار رہتا۔
میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں مگر میں جاگنے کی کوشش کرتا۔

پر وہ آ ہی نہ سکتی۔

پھر کتنی رات بیت گئی ہے۔ اللہ نہیں پتھر کی مورتیوں کی طرح لڑھک جاتیں۔ سائے میں سناٹا ہونے لگتا۔ ماں آکر میرے پاس بیٹھتی اور کہتی ”اسے سلام پڑھایا؟ کیا شے ہے۔ مگر تو نے کھائی ہے؟“ وہ چھپ چھپ کر میرے جاگنے اور سونے کا امتحان لینا چاہتی۔

”اچھا ہے تیری کمر تو سٹ جائے۔“ میں منہ دوسری طرف پھیرے پھیرے کہتا۔ میرے پپوٹوں میں مرچیں سی لگ رہی ہوتیں۔ ارے تو جاگ رہا ہے مگر میں نے سوچا آج کہانی سننے بنا ہی سو گیا ہے۔

”میں نہیں سنتا تیری کہانی۔ وہاں بیٹھی جائے گیا گپ اڑاتی ہے۔“ میں اور پرے کھسک جاتا۔

وہ کہتی ”تجھے آج کہانی ہی نہیں سننا ہوگی۔ اور مجھے ایک بہت بڑھیا سی کہانی یاد آئی تھی۔ آج دوپہر بیٹھی میں اس کے بھولے ہوئے حصے یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ اور تو کہتا ہے تو کہانی نہیں سنے گا۔ تو سمجھتا ہے ایسا کیا جاتا ہے۔“

”اچھا تو سنا۔“ میں بیٹھے بیٹھے منہ پھیر کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا۔

”یہ اچھا بچھونا اور سرہانے الگ کر لئے یہ کہانی سننے کے لیے ہی تو تو نے یہاں ڈالا ہے۔ ارے تو تو کنجوس ہے تو جانتا ہے کوئی اور کہانی

سمجھنے بھی نہیں۔"

"تو کہانی سنا اب اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کر۔ وہ کب تیری پروا کرتی ہیں۔ دیکھ تو کس طرح مری پڑی ہیں۔" میں بہنوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔

موسی ماں کی ساری کہانیاں ایک سی ہوتی تھیں۔ شروع ہوتیں تو راجاؤں اور بجاروں کی کوئی ایسی خواہش ہوتی جس کو پورا کرنے کے لیے انھیں بہت دُکھ اٹھانے پڑتے۔ راہ بھول جاتے۔ جنگل میں گم ہو جاتے اور پھر درخت کے اُوپر طوطوں کی ایک جوڑی ہوتی جو اپنی بولی میں نیچے لیٹے آدمی کی بات کرتے۔ کھونے والے کو جانے کیسے یہ ساری بولیاں سمجھ میں آتی تھیں اور یوں اپنی منزل کا پتہ چلتا اور اس کی چنتا ختم ہوتی۔ ان کہانیوں میں طوطے آدمیوں کی طرح باتیں کرتے تھے ان کا ساتھ دیتے تھے اور ان کے دُکھ سے دُکھی ہوتے تھے۔ کہانی سنتے سنتے میں سو جاتا اور سپنے میں دیکھتا کہ طوطے آج پہنے ایسے پروں سے سجے ہیں۔ جن میں ہیرے جواہرات ٹکے ہیں۔ جو چونچ کھولتے ہیں تو باقی سارے گیت بیکار کا شور لگتے تھے۔

یہ دُنیا تھی جو ماں نے اور میں نے بنائی تھی۔ موسی ماں کی اور میری الگ دُنیا۔

وہ لوٹ جاتی تو میں یہ ساری کہانیاں جی ہی جی میں دُہراتا۔ اور پھر

کہانی میں دکھوں کو دُور کرنے والا طوطا میں آپ ہوتا۔ باقی لوگ ہاتھ باندھے پہروں میرے سامنے کھڑے رہتے۔ میں انہیں دربار سے نکال دیتا اور کبھی کوئی بنا سلام کیے ہی نکل جاتا۔ میں کھیلتے میں۔ پڑھتے میں اسکول میں ہر جگہ یہ سپنے دیکھتا اور سب کچھ جاننے والا میں آپ ہوتا۔

ایک بار ماں آئی تو میں نے کہا۔

ماں میں نے درخت پر سے طوطے اتار دیے ہیں۔ بھلا طوطے بھی آدمی کی طرح بول سکتے ہیں۔ اور راجکمار اب گم نہیں ہوگا۔ ماں یہ سن کے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ بولی کیسی باتیں کرتا ہے۔ تو ان کہانیوں میں آپ سے آپ بدلی کیسے کرسکتا ہے۔ ایسا نہیں ہوگا بیٹے جو کام جس کے سپرد ہے ویسا ہی ہوگا۔ ایک بات بھی نہیں بدل سکتی کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ تو اور میں اُسے کیسے نکال سکتے ہیں۔

"تو میں نہیں سنتا کہانی۔" "اچھا تو نہیں سنتا۔" وہ اٹھ کر جانے لگی۔

"کیوں نہیں سنوں گا۔ پر میں نیلے طوطے کو ساری باتیں جاننے والا نہیں رہنے دوں گا۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

ماں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگی "جیسے تیرا جی چاہے۔"

اس رات ماں نے جو کہانی سنائی اس میں نہ کوئی راجہ تھا اور نہ کوئی راجکمار۔ کبھی کو کسی کی کھوج نہ تھی۔ جانے یہ کہانی کہاں سے دیس کی تھی۔

کہ اس میں بھوک تھی، سردی تھی اور قید تھی۔ ہر طرف اُداسی اور ویرانی تھی۔ اور یہ سارا دُکھ دیکھ کر درخت پر بیٹھے طوطے بھی مر گئے۔ پھر اُن کے پَر ہوا کے ساتھ اِدھر اُدھر اُڑتے پھرے۔ اور میں کرتی ہوئی آندھی انھیں اپنے ساتھ اُڑا کر جانے کہاں لے گئی۔ بگڑے اس ویرانے میں جو تنکے پھرے کچھ بھی باقی نہ بچا۔ مہینوں کے بعد ماں آئی تو خوش نہ تھی۔ گرد گردی زرد سے چہرے۔ وہ اپنے گردوں کے بادلوں میں راز چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ شروع سردیوں کی ایک سہانی نرم سی شام تھی۔ اور جانے کیوں اور دنوں سے زیادہ خوش اور پُر رونق لگ رہی تھی۔ سورج کی لالی کے نیچے بڑھتے نیلے اندھیرے میں پرندے تیز تیز پر مارتے اُڑتے جاتے تھے۔ میں نے اُن جُھنڈوں میں طوطوں کا کوئی جُھنڈ نہ دیکھا۔

رات موسی ماں کی راہ دیکھتے دیکھتے میری آنکھ لگ گئی۔ میری چھوٹی بہنیں مجھ سے پرے اسی طرح آپس میں جھگڑ اور کھیل رہی تھیں۔ آنکھ کھلی ہے تو ہر طرف چُپ چاپ تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ مدھم سا دیا جل رہا تھا: کیا آج موسی ماں نہیں آئی ؟" پھر میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ میری چھوٹی بہن کے ساتھ لیٹی تھی۔

جب میں نے جا کر اُسے جھنجھوڑا ہے تو وہ جاگ رہی تھی: "تُو میرے ساتھ کیوں نہیں سوئی تُو نے مجھے کہانی کیوں نہیں سنائی۔

وُہ زُخفا ہوئی اور نہ اُمتی کہنے لگی "تجھے کہانی کیا سناؤں" اس کی آواز میں آنسو تھے یا شاید اس کا گلا خراب تھا۔ مجھے لگا رات لنگڑی بڑھیا کی طرح دھیرے دھیرے آگے کھسک رہی ہے۔

اس رات کے بعد سے مجھے کوسی ماں نے کبھی کہانی نہیں سنائی۔ اور میں نے اپنے طور پر طوطوں کو کھوجنے اور انھیں درخت پر اسی جگہ بٹھانے کے بہت جتن کیے اور یوں مجھے اُن سے جنون کی حد تک لگاؤ ہوگیا۔ اور میں سپنوں میں بھی دیکھتا کہ ہرے نیلے پیلے طوطے ڈال ڈال پھدک رہے ہیں اور آدمیوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ خود میرے دُکھ سکھ میں شریک ہیں۔

اسکول میں پڑھتے جماعت میں اگر مجھے کسی پرندے کی تصویر بنانے کے لیے کہا جاتا تو میں طوطے کی تصویر بناتا۔ بڑا ہو کر کالج میں بھی میرا یہ جنون کم نہ ہوا۔ اور بڑے بھیا کی نظر بچا کر میں نے ایک طوطا پال لیا۔ ہوسٹل میں گیا تو اسے چھپا کر ساتھ لے گیا ——————

—————— پڑھنے بیٹھتا تو اسے پاس بٹھا لیتا۔ دوست چھیڑتے۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ تعلیم ختم کی ہے تو بھیا نے مجھے باہر بھیج دیا۔ پردیس میں مجھے بہت دنوں رہنا پڑا۔ گھر بہن بھائی کوئی شے بھی اتنی شدت سے یاد نہ آئی۔ آدمی ہر ملک میں اپنے لیے جگہ

بنا لیتا ہے۔ اپنے آپ کو منا لو تو ادیں تنگ نہیں کرتیں۔ کمی محسوس نہیں ہوتی۔ لوگوں کے چہرے اجنبی نہیں لگتے۔ سر پر جھکا آکاش اور دھرتی کا رنگ ایک سا لگنے لگتا ہے۔ یوں بھی میں اداس کم ہوتا ہوں۔ کسی چڑیا کے بنا گزارا کر لیتا ہوں۔ پر وہاں میرا دل ان سیٹیوں کو سننے کے لیے ترس گیا۔ مجھے کبھی ایسا سپنا بھی تو دکھائی نہ دیتا جس میں دیکھوں کہ بہار آئی ہے درخت پھلوں اور خوشبو سے بوجھل ہیں۔ اور ڈال ڈال پر سے نیلے پیلے سفید اور گلابی طوطے چہچہک رہے ہیں۔

لوٹ کر آیا ہوں تو ماں ایک اور بہو گھر لے آئی۔

مانتی سے پہلے پہل جھنجھلایا رہا۔ میں نے سوچا طوطوں سے میری محبت کو وہ جانے کیا سمجھے اور ہو سکتا ہے اُسے سرے سے پرندوں سے لگاؤ ہو ہی نہیں۔ اور میری وجہ سے انہیں برداشت کرے۔ بیاہ بھی عجیب بندھن ہے۔ محبت کی شادی میں بات دوسری ہے۔ آدمی ایک دوسرے کے متعلق پہلے سے بہت کچھ جان چکا ہوتا ہے۔ گو یہ کافی نہیں ہوتا۔ مگر جو ڈر میں نے محسوس کیا وہ کچھ یوں تھا۔ جیسے اندھیرے کمرے میں دھکیل دیا گیا ہوں۔ اور ٹٹول کر چیزوں اور جذبات احساسات اور خیالات کے ٹھکانے تلاش کرتا ہوں یہ کھوج جس میں دوسرے کو ٹھیس لگنے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ بھگوان نے بیاہ کا بندھن

بھی جانے کیا سوچ کر انسانوں پر ٹھونسا تھا؟

ایک ہفتہ چھٹیوں میں ہم گاؤں گئے۔ تو ماں نے ہمیں باغ کی طرف کھلنے والا کمرہ رہنے کو دیا جو گھر سے ذرا الگ تھا۔ ہو سکتا ہے ہم گھر میں ہر گھڑی آنے والے ناتے داروں کی وجہ سے شرم محسوس کریں۔

ایک صبح ہم سو کر نہیں اٹھے تھے کہ چوں چوں کی آواز نے جگا دیا۔

مالتی کود کر پلنگ سے اتری۔ ارے یہ تو چڑیا کے بچوں کی آواز ہے۔ نئی زندگی اور خوشی سے بھری چہکار سی۔ ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی کھولی تو خوشبو کی مہک لئے گلابی سا اجالا اندر آیا۔ باغ پرندوں کے شور سے آباد تھا۔ اور ہوا نرم نرم سی جیسے پیار کا بول ہو جسم سے چھو کر اسے سکون بخش رہی تھی۔

پہلے تو یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ کہ آواز کدھر سے آ رہی ہے۔ مالتی کمرے کے درمیان کھڑی بکھرے بالوں اور سوئی سوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ گھونسلا ایک بڑی سی تصویر کے پیچھے تھا۔ وہ میز پر کرسی رکھ کر اس پر چڑھ گئی۔ اس کے چہرے پر اتنی مسرت امڈ آئی مانو وہ بچے اس کے اپنے ہوں۔ چڑیا کبھی اس کے سر پر بیٹھتی، کبھی اس کے سر پر بیٹھتی۔ کبھی تصویر کے سرے پر دونوں بہت شور کرتے

تھے۔ تیز تیز بول رہے تھے۔ اور اِدھر اُدھر پھدک رہے تھے۔
میں نے کہا چلو پیچھے ہٹ جاؤ۔ ورنہ وہ تمہاری آنکھوں میں چونچیں مار دیں گے۔
کہنے لگی مجھے تو پرندوں سے بہت محبت ہے۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ گھر میرے کمرے میں چڑیوں کے اتنے گھونسلے تھے۔ اور اکثر کوئی بچہ گھونسلے سے گر جاتا تو میں اس کی دیکھ بھال کرتی۔ چڑیا اور چڑا میرے ہاتھ سے دانے کر کھاتے تھے۔
میں نے کہا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہیں پرندے اچھے لگتے ہیں۔
کہنے لگی۔ میں کیا جانوں۔ میں سمجھتی تھی تمہیں بُرا لگے گا۔ ورنہ گھر میں ہم کچھ نہ کچھ ضرور رکھتے۔ تنہائی میں دل بہلا رہتا ہے۔ گاؤں سے لوٹ کر ہم نے ایک پنجرہ بنوایا۔ بہت بڑا نہیں مگر آرام دہ سا۔ جس میں چھت کے قریب میں نے کئی چھوٹے گھر بنوائے۔ گول سوراخ اندر جانے کے لیے جو آگے سے کشادہ تھے۔ پنجرے میں ان کو قفس کے احساس سے بچانے کے لیے میں نے درخت کی ایک ایسی مضبوط اور چھوٹی سی ٹہنی کٹوا کر لگوائی جس میں کئی شاخیں تھیں۔ اور جس پر دُور سے ایک چھوٹے سے درخت کا دھوکا ہوتا تھا۔ مالتی

کے چہرے پہ اتنی خوبیت ہوتی جیسے وہ کسی محبت میں گرفتار ہو رہی ہو رہی ہو۔ برآمدے میں جہاں بڑھئی کام کرتا تھا وہ گھڑی گھڑی پھیرے کرتی۔

جس دن میں کئی جوڑے رنگین طوطے لایا ہوں۔ وہ بہت خوش تھی۔ کہنے لگی۔ مجھے سب سے یہ رنگین طوطے پسند ہیں۔ اس سے گھر میں کتنی رونق ہو جائے گی۔ یہ سارا پنجرہ تو ان کا گھر بن جائے گا۔ جب بچے دیں گے تو ہم ان کے لیے ایک اور گھر بنوائیں گے۔ ہم اکٹھے ہوتے تو اکثر ان کی باتیں کرتے۔ میں آتا تو سب سے پہلے پوچھتا۔ کہیں مالتی بچوں کا کیا حال ہے۔" ہنس کر کہتی۔ "تمہاری باٹ دیکھ رہے ہیں۔"

ہمیں دیکھ کر وہ بہت شور کرتے ان ڈالیوں پر الٹے ہو کر لٹکنے لگتے۔ جیسے اور اتنا ناز خوشی سنا رہے ہوں۔

ہوتے ہوتے گرمی بڑھنے لگی تھی۔ جیسا کہ بسنت چلا گیا تھا۔ اور زمین الاؤ کی طرح سلگنے لگی تھی جس کے شعلے بلند ہوا ہی چاہتے ہوں۔ ہوا سلگتی ہوئی لگتی جیسے نرک کے دوار کھل گئے ہوں۔ لو چلتی رہتی اور دوپہریں سنسان ہونے لگی تھیں۔ لمبی اور ختم نہ ہونے والی۔ مالتی نے کہا اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کمرے میں پنجرہ رکھوا لیں۔ بولتے نہیں پر محسوس تو کرتے ہیں۔ اور اب کے گرمی نہیں قیامت ہے۔ شام ڈھلے تک

ڈھلتی ہے۔

کمرے میں آکر وہ اندھیرے میں گھبراتے۔ اور جب تک ہم سے کوئی
پاس نہ جاتا بولتے رہتے۔ ایک گھڑی آرام نہ کرنے دیتے انہیں نیند تو
نہیں تھی۔ انہیں ڈرانا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں ان کی سن میں سوچتا۔
وہ دنوں کی بات کہنے کی بات اور راہ بتانے والے جانے کہاں
گئے۔ سوتی ماں نے کہانیاں کیسی گھڑ لی تھیں۔ پر کوئی تھا جو کہتا تھا یہ سب
جھوٹ نہیں ہے۔ یہ سب جھوٹ نہیں ہے۔

ماں نے ماضی کو بھلا دیا تھا۔ میں اسے کہاں پہنچانے گیا ہوں۔ تو گرمی
سے زمین اور آسمان یوں تپ رہے تھے۔ مانو چرخے کو آگ دکھا دی گئی
ہے۔ نالے سوکھ گئے تھے۔ تالاب خالی تھے۔ ان کی تہ میں کیچڑ تھا۔ درخت
ننگے تھے۔ اور دنیا اتنی بے رونق ہو گئی تھی۔

مجھے کچھ دن لگ گئے۔ رات کرتا یا ہوں۔ تو ان میں سے کئی گردنیں
ڈھیلی اور آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر پھڑکے تو سہی مگر وہ
ماضی کو ڈھونڈتے رہے تھے۔ وہ ان کے لیے ماں سے سوال تھی۔ اس
نے مجھ سے کہا تھا۔ تنہائی میں جی بہل جاتا تھا۔ کام سے آکر میں ان کا دانہ
اپنے سامنے ڈلواتا اور پانی بدلواتا۔ پنجرہ صاف کرواتا انہیں باہر نکلواتا۔ وہ
ڈالیوں پر اترتے چہرے پر پنکھ پھڑپھڑاتے اور کبھی کبھار کوئی اڑتا ہوا

آزاد طوطا پنجرے کی جالی کے ساتھ ٹک جاتا۔ اور پھر گھر گھر چہکار اور شور سے بھر جاتا۔ میں پیر سے آتا تو وہ شکایت کرنے کے انداز میں بولتے۔

ماں کے خط پر خط چلے آتے تھے۔ چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ میں جانا بھی چاہتا تھا۔ مگر یہ قفس زنجیر بن گیا تھا۔ پھر ماں نے لکھا "میرا جی اچھا نہیں ہے۔ اگر آ ؤ تو دیکھو کہ شہر کے درخت بوند بوند کو ترس رہے ہیں۔ آسمان کا رنگ زرد ہے۔ ساری دنیا بارش کے لیے پریشان ہے۔ اور پرارتھنا کر رہی ہے۔ بادل بنا برسے گزر جاتے ہیں۔ اور میں بھی اس پریشان دنیا میں ہوں۔"

میں نے ایک ایک کو نکال کر ہاتھ میں لے کر پیار کیا تو کروں کو تاکید کی اُن کا خیال رکھیں۔ پر وہ سب یوں چیخ رہے تھے۔ مانو آخری بار مجھ سے جدا ہو رہے ہوں۔ میرا جی سہم گیا۔ پر اُن کا رونا۔

تم پوچھو میں انہیں ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔ تمہیں پتہ نہیں میری ماں پوجا پاٹ میں لگی رہنے والی اور شگن لینے والی اور نحوستوں میں یقین رکھنے والی عورت تھی۔ وہ روز تلسی کو پانی دیتی۔ چیونٹیوں کے لیے جگہ جگہ دانہ ڈالتی پھرتی چڑیوں کووں کی روٹی کا خیال رکھتی۔ مگر طوطے کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ کہتی تھی یہ بڑا منحوس پرندہ ہے۔ بہت بے وفا ہے۔ ایک بار اُڑ جائے تو پلٹ کر نہیں آتا۔ جس گھر میں ہو وہاں

بارتی دیوی قدم نہیں دھرتی۔ شاستروں میں یہ لکھا ہے' وہ لکھا ہے اور
ایسی ہی کئی دلیلیں۔

گیا ہوں تو ماتنی پوچھنے لگی" اُن کی دیکھ بھال کس کے ذمے لگا
آئے ہو۔"

فکر مند سی ہو کر کہنے لگی" اتنی لمبی چھٹیاں ہیں۔ اور نوکر لوگوں کا کیا ہے۔
لاکھ تاکید یں کر و پر کریں گے اپنی من مانی ہی۔ کبھی بھوکا رکھیں گے اور کبھی
پانی نہیں دیں گے۔ جانے ان کا کیا حال ہو گیا کس حالت میں رہے۔"

اس رات ساون کی پہلی بارش ہوئی۔ گھٹائیں جھوم کر آئیں۔ پھر
شہر پر جوبن چھا گیا۔ دُنیا نہائی دھوئی اپنے نئے سنگار اور نئے رُوپ
سے کنیٔی کی طرح سنور گئی۔ باغ میں ہر طرف جھینگریوں کا شور تھا۔ اور
آموں کی مہک کوئل کی کوک میں مل جیسے لا رہی تھی۔ سیاہ بھونرے ہوا
کے جھونکوں سے بورے ہوئے اڑتے تھے۔ اور پُرانی یادیں اُمنڈی
پڑتی تھیں۔

ماں نے کہا" مگر اب تو گرمی بھی کم ہو گئی ہے۔ اپنی تو سی ماں
سے تو مل آ۔ کتنی بار پوچھ چکی ہیں تجھے۔"

جس دن میں نے جانے کا ارادہ کیا۔ ماں کہنے لگی" زیادہ دن گھوڑی کی
دن رہ کے آ جانا۔ مجھے آج مندر میں دیوی پوجا کے لیے جانا ہے۔

اور چولھیا جلاؤں گی۔ تیرا جانا بہت ضروری ہے۔ پنڈت جی نے کہا ہے اشبھ مہورت ہے۔"

میں نے چوکھٹ سے باہر قدم دھرتے ہوئے کہا "سب مہورت شبھ ہیں۔ یہ تو سوچنے کی بات ہے۔"

ماں نے کہا "ارے نوشٹ آئیو تو بہت سوچ کر پڑھ لکھ کر سمندر پار ہو آیا ہے۔ تو اب دھرم کرم سے باہر ہے۔" میں نے ہاتھ ہلا کر ہاں کہہ دیا۔

موسی ماں بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں پر پپوٹے اور بھی ڈھلک آئے تھے اور سفید بھنویں جھکی ہوئی تھیں۔ ان سے چلا پھرا بھی نہیں جاتا تھا۔ حویلی کے کمرے میں وہ تنہا بیٹھی تھی۔ اور ہر طرف چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ جھروکے میں سے ہوا آ رہی تھی۔ ہوا کے زور سے کواڑ دھڑ دھڑ بجتے تھے۔ جیسے اس سناٹے کو توڑ رہے ہوں۔

کہنے لگیں "ارے تو مرلی ہے ادھر آ میرا ہاتھ اپنے سر پہ دھر دے بیٹا۔ میں تو اب چلنے لائق بھی نہیں رہی۔ پوتے پوتیاں سب اپنے گھروں کو چلے گئے ایک نوکر ہے جو جی میں آئے تو پانی پلا دیتا ہے اور جی میں آئے تو کھلا دیتا ہے۔ پڑوس کی ایک عورت کبھی کبھار آ کر صفائی

دیتی ہے۔ مجھ کو ان جانا ہے۔ دیکھنے میں آدمی جیسا نہیں چاہتا پر وت بھی تو نہیں آ تی کر سہارا دے۔"

میرا جی انہیں دیکھ کر بہت اُداس ہو گیا۔ آدمی کی بھر پور جینے کے بعد یہ دشا ہوتی ہے۔ وہی موسی ماں جو کبھی کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھیں۔ ایک ایک کو دیکھنے کے لیے ترستی تھیں۔

میں نے اُسے خوش کرنے کے لیے کہا" ماں میں نے ایک پنجرہ بنوایا ہے۔ اُس میں طوطوں کے کئی جوڑے ہیں۔ مگر وہ اس رات کی طرح ہی چُپ رہی جب میں نے اُسے کہا تھا کہ نیلا طوطا ہی سب کچھ جاننے والا کیوں ہے۔

میں نے کہا" ماں چُپ کیوں ہو گئی ہو۔"
کہنے لگی کچھ نہیں یونہی۔

میں نے کہا تم بھی یہی کہو گی کہ طوطے گھر میں رکھنا منحوس ہے۔
نہیں میں یہ نہیں کہتی بیٹے پر سوچتی ہوں۔ تو بھی میری طرح سپنوں کے پیچھے دیوانہ ہے۔ بیٹے بھلا چلنے بھی کبھی سچے ہوتے ہیں۔ کسی کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ طوطے تو میرا سپنا تھے۔ وہ کہانی تو میں آپ بُنتی تھی۔ اور تو کیوں اس پرچھائیں کے پیچھے لگ گیا ہے۔
میں نے کہا پر وہ تو نہ سپنا ہیں اور نہ پرچھائیں رنگین طوطے

ہیں ۔

اسے مزل چیننے کی کوئی ایک صورت ہوتی ہے ؟

اس رات میں موسی ماں کے سو جانے کے بعد دیر تک جاگتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ "کیا سپنوں کے پیچھے بھاگنا دیوانگی ہے؟ بہار دن آ گیا وقت کیسے بیت رہا تھا؟ پرندوں کے رنگوں میں چمک گہری اور جاذب نظر ہو گئی۔ کروں اور کادیتوں نے سردی کی تیاری کے لیے تنکے پکڑنے اور نئے آشیانے بنائے۔ باغ انہی مختلف آوازوں سے بھرا رہتا۔ جب بادل جھک آتے تو کوئل کوہو کوہو بولتی اور بارش سے دھند لکا ہونے لگتا۔ پانی پر بگلوں کی کشتیاں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتیں۔ ہر طرف ہریالی خوشی اور زندگی تھی۔ مالتی اور میں برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تماشا دیکھتے رہتے۔ مگر ماں اسے باہر نہ بیٹھنے دیتی۔ بجلی کی چمک سے اسے بچاتی اور پھر جینے کسی نہ کسی پوجا پاٹ میں لگی رہتی۔

واپس آیا ہوں تو اُداسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ دیکھ کر دھچکا سا لگا کہ باوجود تاکید کے انہوں نے پرندوں کا خیال اس قدر نہیں کیا تھا جتنا میں چاہتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بھی چپ بیٹھے رہے۔ جیسے پہچان نہ رہے ہوں۔ اور اگر پہچان بھی گئے ہوں تو خفا ہوں۔ کئی

طوطے کر سکتے۔ میں نے ہر کسی سے پوچھا۔ بک بک جھک جھک کی مگر پتہ نہ چل سکا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی۔ جب میں نے مالتی کو لکھا۔ "تمہارے بچوں کی آبادی شاید بڑھنے والی ہے۔ طوطیاں گھر کے میں گھسی رہتی ہیں۔"

کاتک میں جانے کیا ہوا۔ روز صبح جب میں اٹھتا تو ایک ایک طوطا مرا ہوا ملتا۔ میں نے پرندوں کے معالجوں سے مشورہ کیا۔ انھیں دوا کھلائی۔ مگر رات کالی ناگن کر آتی۔ بیرے ان جانے ان دیکھے موت اس گھر کے پیاروں اور کمروں میں چکر لگا رہی تھی۔

مالتی کو میں نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں بہت بے تابی سے اس بچے ہوئے جوڑے کو دیکھتا۔ وہ دونوں سر جوڑے گردن پر گردن رکھے آنکھیں بند کیے سارا دن خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ انھیں متوجہ کرنے کے لیے سیٹیاں بجاتا، آوازیں نکالتا۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے سے لگے بیٹھے رہتے جیسے آنے والے خطرے کے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ اس ہنستے کھیلتے زندگی سے پُر گھر کی ویرانی دیکھ کر مجھے طرح طرح کے خیال آتے۔ چار دن کی چھٹی لے کر مالتی کو دیکھنے گیا ہوں تو کہنے لگی۔ "تم نے خط میں کبھی ذکر تک نہ کیا۔ اور میں روز پچھلی سے ان کی خبر سننے کے لیے تیار ہوتی ہوں۔" میں نے جواب نہیں

دیا۔ اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ اس کے چہرے پر
ایسی زردی کھنڈی تھی جو فوز ڈھلتی تھی۔ آنکھیں پھیلی ہوئی اور اندر کسی جوت
سے جگ مگ کرتی لگتی تھیں۔ جسم بھرا بھرا جیسے دھرتی پر نئی بہار آئی
ہو۔ اس کی نگاہوں کے احاطے میں ہوتے اس کی خوشی سے ماند دیکھنے
لگتی ہو۔ میں نے اسے کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔

کہنے لگی چپ کیوں ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔

میں نے کہا مغروں نے انڈے دیے ہیں۔

مالتی خوش ہو کر بولی۔ ہمارا گھر اب زندگی اور خوشی سے بھر جائے
گا۔ میں آؤں گی تو ذرا سی فرصت میں نہیں ہوا کرے گی۔

میرے دل کو کوئی مسلنے لگا وہ ورث کر جائے گی تو کتنی اداس ہوگی۔

اب خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ اور ڈھلی نے سیج کی انڈے دیے
تھے۔ جس دن مجھے ذکر نے بتایا۔ کہ اس نے انڈے دیکھے ہیں۔ میں
ننگے پاؤں بھاگتا ہوا پنجرے کی طرف گیا۔ سردی کی شدت سے بچانے
کے لیے میں نے پنجرے کو کمرے کے ساتھ برآمدے میں ذرا اندر کی
طرف رکھوا دیا۔ دن کا زیادہ حصہ مادہ اندر رہتی۔ اور نر اس کی حفاظت
کرتا۔ اکیلا ہی کبھی اندر جاتا اور کبھی باہر آ کر خاموش بیٹھا رہتا۔ جیسے منتظر ہو
مادہ باہر آتی تو اس کے چہرے پر طمانیت ہوتی۔ مالتی نے لکھا۔ " میں

پڑھتی ہوں اور تم لکھتے نہیں ہو۔ کیا رونق بڑھ گئی ہے۔ طوطیاں اب تو
بچوں میں مگن ہوں گی۔ مجھے لکھو اس کے بچے کیسے ہیں؟ کیا ان کی چونچیں
بھی ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی چڑیا کے بچوں کی؟"

ایک مہینہ انتظار میں بیت گیا۔ اس بار میں دو بار گاؤں گیا۔
مالتی نے پوچھا "بچے نہیں نکلے ابھی" اس کی آواز فکرمند سی تھی۔
میں نے کہا۔ "تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ ہو سکتا ہے دو تین ہفتے لگیں
پرندوں کی اپنی اپنی عادتیں ہیں۔"

مگر مجھے لگا۔ میرے اس جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔
جانے کیوں میرا دل بھی پریشان رہنے لگا۔

انڈوں سے بچے کسی طرح نکل ہی نہیں پا رہے تھے۔ دونوں سر
جوڑے بیٹھے رہتے۔ جیسے ناخوش ہوں۔ ایک ہی جگہ ٹکے رہتے۔ ادھر
ادھر بھی نہ جاتے۔ مادہ بہت کم اندر جاتی۔ جانے کیا بات تھی۔

سردیوں کی شامیں بڑی اداس تھیں۔ کلب سے آکر بھی وقت
کاٹے نہ کٹتا۔ میں آتشدان میں آگ جلواتا اور کندھوں پر ہلکی سی چادر ڈال
کر کمرے میں ہی ٹہلتا رہتا۔ مجھے گاؤں سے روز کسی خبر کا انتظار رہتا۔
کوئی شے میرے اندر تھی جو رہ رہ کر بے چین ہوتی تھی۔ میرا جی کہیں نہ لگتا۔
جی سوچتا گاؤں چلا جاؤں۔ پھر کہتا "وہاں کیا سوچے گی۔ اسے ہم پر [illegible]

نہیں ہے۔ کیا پڑھ لکھ کر بے شرم ہو گیا ہے؟"

جس دن نانی آکر چپ چاپ باہر بیٹھ گیا تو مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے کہا۔

"بھو کا جی اچھا نہیں ماں نے بلوایا ہے۔" اس کا چہرہ اترا ہوا اور اداس تھا۔ وہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر رہا تھا۔

بین کرنے والی عورتیں باہر آنگن میں زمین پر بیٹھی تھیں اور سارا گاؤں گھر میں جمع تھا۔

موسی ماں میں رونے کی ہمت نہ تھی۔ بیٹھی خالی نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ مجھے بلا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی۔

"مرلی دھر بیٹے یہ موہ کا سپنا ہے۔ یہ بیٹے بیٹیاں یہ سنسار یہ سب کچھ سپنا ہی تو ہے۔ کبھی سپنا سچا ہو گیا اور کبھی جھوٹا۔ تو نراش نہ ہونا بیٹا۔ بھو کو حوصلہ دے۔ رو رو کر پاگل ہوئی جاتی ہے۔"

مالتی کی آنکھیں خالی خالی تھیں اور چہرہ اتنا زرد تھا۔ مجھے دیکھا تو دیکھتی رہی جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اور مجھے بھی لگا اس کا اندیشہ اتنا ہی نہ جانے وہ کیوں اتنی اداس ہے اور میں کیوں اداس ہوں۔ یہ سپنا ہی تو تھا کوئی میرے جی میں جیسے ہولے سے کہتا رہا۔

گاؤں سے رستے میں مجھے سردی لگ گئی۔ دو دن اکیلا بخار میں

چھٹکارا ہا۔ دماغ میں تصویریں سی گھومتیں ویران گھروں اور اداس بستیوں کی۔ ماتی کو پہچانے آئی تو کہنے لگی۔ کیا پتے پیا ہے کے کونے میں پنجرہ رکھا ہے۔ اس میں کیا تھا؟

میں اور ماتی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ماں دوسرے کمرے میں گئی تو ماتی کہنے لگی۔ تم نے طوطے دان کر دیے تھے کیا؟

میں پھر بھی کچھ نہ بولا۔

چلنے کے قابل ہوا جوں تو میں نے پنجرہ اٹھا کر اپنے پاس رکھا۔ چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار ان خالی گھروں میں گھومتی پھر رہی تھی جیسے لٹیروں کا گروہ ہو۔ جھٹ تڑ وا کر میں نے دیکھا تو انڈے اسی طرح پڑے تھے اور ان دونوں کے ڈھانچے جو اب صرف پر رہ گئے تھے ان کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ ماتی نے میری طرف دیکھا۔ پر ہم دونوں نے بھی ایک دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ میں کس سے پوچھوں کہ انھوں نے اپنے پر انڈوں پر کیوں پھیلائے تھے؟ اور کیا یہ ماں کا وہم تھا کہ طوطے بے وفا اور منہ زور ہوتے ہیں۔ ایک بار اڑ جائیں تو لوٹ کر نہیں آتے۔

بُجھے دیے

میں گھڑی گھڑی اپنے سینے سے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا دو سال کے بعد میں اب اس سے روٹی کھا سکوں گا۔ دو سال کے پیچھے دو سال کی گھڑیاں، دو سال کے پل یوں ہوتے ہوئے میرے سامنے سے کھسک رہے تھے۔ جیسے برسات کے بادل جو چھا جائیں تو لگتا ہے کہ اب آکاش کبھی نہیں دکھے گا۔ اور گہرا اندھیرا ہوگا۔ اور بڑھے گا۔ اور گرد کی ہر شے ہماری نظروں سے چھپ جائے گی۔

ہری سنگھ چاچا نے اپنی گھوڑی کی باگ کھینچ لی۔ اور میں جو اپنے خیالوں میں ڈوبا انگوں کی طرف جانے والے اکھڑے بکھرے راہ سے اس کے پیچھے آ رہا تھا، گرتے گرتے بچا، میرا بازو پکڑ کر اس نے زور سے ہلایا اور کہنے لگا۔

"یہ سپنے دیکھنے کی عادت عورتوں کی ہے۔ مرد کام کرتا ہے چوٹ کھانا جانتا ہے اور چوٹ مارنا۔ جیت سنگھ کو گر کر تم ایسے اداس ہو گئے ہو۔ کیوں یار بس یہی بل تھا۔ اگر اتنا چھوٹا دل ہوتا ہے تو عورتوں

کے کپڑے پہن کر گھر بیٹھا کرو۔ میلوں ٹھیلوں میں آنے اور یاروں سے بیر کمانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے بے بس ہو کر کہا "چاچا تم جانتے ہو میں نے اُس سے بیر نہیں کمایا تھا۔"

ہری سنگھ نے میرا بازو چھوڑ دیا اور چھڑی کو زور سے سر کے اوپر گھما کر گھوڑی کی گردن پہ مار کر کہنے لگا۔ "تیری ماں بہن کی ایسی تیسی۔" گھوڑی بے چین ہو کر ذرا سا گھومی اور تیز چلنے لگی۔ "کیا تم سوچتے ہو کہ دوستوں یاروں کے ساتھ بیر کمانا بُری بات ہے۔ بات کے پیچھے جان دے دینا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ پر تمہاری اداسی کی ایسی تیسی تم اداس کیوں ہو۔ تم پیچھے کیوں دیکھنے لگتے ہو۔ مرد تو اپنے بیری کو مار کر جان سے ختم کر کے خوش ہوتا ہے اور تمہاری شکل ایسی ہے جیسے جوتے کھا کر آئے ہو۔ میں کہتا ہوں تم اپنی پگڑی کو ہوا میں اچھالو، زور زور سے گاؤ۔ ناچو، اوئے میں پوچھتا ہوں کیا چیت سنگھ کوئی جگ سے نرالا ہے جیسے یہ ہوتا ہی آیا ہے۔ ہماری طرف دیکھو ہم نے زندگی میں کیا کچھ کیا ہے پر کبھی نہیں پچھتائے۔

میں نے پھر اپنی طرف داری کرتے ہوئے کہا: "چاچا چیت سنگھ والا تو یونہی مجھ سے جھگڑ پڑا تو جانتا ہے اُس کا میرا کتنا جوڑا تھا۔ تو، تو

خود جیس دیوں کی جوڑی کہا کرتا تھا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" ہری سنگھ نے پھر زور سے چھڑی گھما کر گھوڑی کو مارتے ہوئے کہا۔ "میں کب کہتا ہوں تو اور جیت سنگھ دیوں کی جوڑی نہیں تھے۔ پر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کی موت تیرے ہاتھ سے لکھی تھی۔ اور بھلا تقدیر آگے اپنی زور آور نہ ہوتی تو تیری اور اس کی لڑائی ہی کیوں ہوتی۔ تو یہ قسم کیوں اٹھاتا کہ جب تک اسے مار نہ لے گا سیدھے ہاتھ سے کھانا نہیں کھائے گا۔"

چاچے نے مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان بتا تقدیر کے سامنے کس کا زور چلا ہے۔" سچا تو تقدیر کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا جو "ہونی" ہے اس کو کون ٹال سکتا ہے۔ دریا کے کنارے بیٹھی دونوں ڈھیریوں میں سے آگے نکال کر لیتی اور پانی میں پھینکتی جاتی ہے۔ ہونی دیوی کے سامنے کس کی پیش گئی ہے۔ مرد کو تو ہونی کے کھیل کو کرنے کے بعد بیٹھنا دیکھنا اور اداس ہونا اچھا نہیں لگتا۔

میں نے پھر کہا۔ "میں اداس کب ہوں چاچا۔ سوچ رہا ہوں کہ جیت سنگھ اگر مجھے خواہ مخواہ غصہ نہ دلاتا۔ میں اور وہ لڑ نہ پڑتے تو آج میں ان اندھے کبڑے راہوں سے پولیس کے ڈر کے مارے بھاگ نہ رہا ہوتا۔ تجھے معلوم ہے ہوگا تو دہی نہ ہو کہیں آ کے مجھے پکڑے جانے کی مقدمہ

چلے گا۔ سال دو سال چار سال ہم کچہریوں کے چکر کاٹیں گے۔ سختیاں آنی ہوں گی۔"

ہرنام سنگھ نے اپنی گھوڑی میرے پاس روک کر کہا: "سختیوں کے باوجود کوئی شے ہے جسے انسان جیت کہتا ہے اور جو اس کی کھوپڑی میں نشہ اور دل میں غرور بن کر سدا رہتی ہے اور جس کی سمجھ تم لوگوں کو نہیں ہے۔ چلو گھوڑی بڑھاؤ اور تیز چلو۔"

میں اور ہری سنگھ چاچا دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

شام کے نیلے دھندلکے میں ڈوبتی ہوئی آوازیں ہمارے گرد گھومنے لگی تھیں۔ گھوڑیوں کے ٹاپوں کی آواز گونج بن کر پھیل رہی تھی۔ اور ٹڈوں کی چرچر میرے جی کی آواز کی طرح ہر شے کو چھو کر لپٹ رہی تھی۔ کھڑی فصلوں میں سے گزرتے اور چاند کی بکھری کرنوں کی طرح کھیتوں میں گم ہوتی پگڈنڈیوں کو ڈھونڈتے ہم نامعلوم راہ پر آگے ہی آگے ہی آگے جا رہے تھے۔ جب بالیں گھوڑیوں کے جسموں سے چھوتیں تو وہ کانپ کر آگے بڑھ جاتیں اور سرسر کرکے بہتی ہوئی اپنی جگہ انہیں پھر لوٹا دیتیں۔ ہم کھیتوں میں ڈوبی گھوڑیوں پر بیٹھے ہوئے دور دور تک پھیلی اور آکاش کو چھو کر آتی خاموشی میں دنیا کے آخری انسان لگ رہے تھے۔ چپ چاپ کسی منزل کے بنا چلتے ہوئے۔

ہری سنگھ چاچا پتہ نہیں مجھے کہاں لیے جاتا تھا۔ وہ بات بہت کم کرتا ہے اور کم بولنے والے سے لوگ یونہی دبنے لگتے ہیں۔ مگر اس کی چپ سے آج نہ جانے کیوں میرا جی گھبرا رہا تھا۔ شام کا اکیلا تارا ایک انگارے کی طرح ہمارے سروں سے دور آم کے درختوں کے اوپر چمک رہا تھا اور کوئل کہیں کو ہو کو ہو بولتی میرے جی کو دہلائے دے رہی تھی۔ پتہ نہیں ان راہوں سے لوٹنا کب نصیب ہو۔ کبھی کبھار آدمی کے پیچھے اس کے قدموں کو ہوا مٹا دیتی ہے۔ پھر وہ ان راہوں سے کبھی پلٹ نہیں سکتا۔ مجھے جیت سنگھ یاد آ رہا تھا۔ میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتنے سالوں اس کے لیے میں نے جو نفرت اپنے جی میں محسوس کی ہے وہ کہاں تھی؟ کیا جیت سنگھ کے اور میرے درمیان کوئی بیر نہیں تھا۔ جو دشمن کی موت کے بعد جی کو ٹھنڈک دیتا ہے اور جیت کی خوشی اپنی پگڑی اچھال کر خون سے بھرے ہاتھوں کو سر سے اوپر نچا کر منایا جا سکتا ہے؟ کیا میں عورتوں کی طرح سپنے دیکھ رہا تھا؟ میں گھبرا کیوں رہا تھا؟

ہری سنگھ نے کھلے میدان میں سے گزرتے ہوئے کہا۔ سال چھ مہینے بیکانیر میں رہو گے تو لوگ جیت سنگھ کی موت کو بھول جائیں گے وقت کے دکھ کو بھلا دیتا ہے۔ پھر تم پلٹ سکتے ہو۔

میں نے کہا۔ "وقت کے ڈنگ کو بھلا دینا ہے چاچا پر بیر کو نہیں۔"

ہری سنگھ نے بھرے ہوئے سے کہا: "تم شاید بھلا سکتے ہو بیر کو بھلا کر ہم لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ قول کی طرح بیر کا پالن کرنا بھی ہمارے خون میں ہے۔ پر پچھلے سال میں گاؤں کی لڑائیاں اور جوش گھٹ گئے ہیں۔ برادری کے جوان جو اب تیرے خون کے پیاسے ہیں، ان سے اپنے کاموں میں لگ کر دشمنی کو پرانا سمجھ لیں گے۔ پھر غصّہ بھی کم ہو جائے گا۔ تب تم آ جانا۔"

چاند نکل آیا تھا اور رات کی جیتی ہوا شام کی نیلی دھواں کو کب کی بجھا چکی تھی۔ اور پانی سے بھری ٹھنڈک جسم کے ساتھ چھو جاتی تو، سردی کی چادر سی باسنوں میں جھول اٹھتی۔ دل کو آپ ایک تسلی ہونے لگی۔ دور کے گاؤں کی روشنیاں چاند کی روشنی میں پھیکی اور بجھی بجھی لگ رہی تھیں۔ آبادی کے قریب سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی۔ حویلیوں میں ٹمٹماتے دیے آکاش پر دور دور چمکتے تاروں کی طرح لگ رہے تھے۔ نیلاہٹ میں ڈوبے ہوئے اور ہولے ہولے ڈولتے ہوئے جیسے پانی پر ناؤ ہچکولے کھانے لگے۔

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ "اگر ہم ساری رات یونہی چلتے رہے تو

وہ دن میں بھی بیکانیر نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہاں وہ گھوڑی کو ذرا تیز ہنکائے۔ اب تو راہ بھی سیدھا ہو گیا ہے۔"

مگر پتہ نہیں کیوں مجھ میں تھوڑی سی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔ میلے کے آخری دن انکھڑتی رونق میں ہم نے سارا دن مل کر شراب پی تھی۔ اور ہاٹ ہاٹ پھر کر میلے میں گھومتی سوانیوں کو بھی چھیڑنا کا تھا۔ اور نئے نئے ہوئے رسیلے گیتوں کو بار بار گایا تھا۔ بھنگڑا ڈالتے ڈالتے تھک سے گئے تھے۔

جیت سنگھ میری ماسی کا پوت اور گاؤں کا سب سے بھلا جوان تھا۔ وہ میرے ساتھ اکھاڑے میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے یاروں کی ٹولی نے اسے بھی آگے کر دیا تھا۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے لائے تھے۔ سارے گاؤں کو پتہ تھا کہ دو سال پہلے اسی میلے کے دن اس کی اور میری لڑائی ہوئی تھی۔ میری ٹولی والوں نے اسے للکارا تھا شراب کے نشے نے ہمیں دگنا بہادر اور نڈر کر دیا تھا۔ اور پھر ہم گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ اصل میں اسے ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ جس دن سے میں نے قسم اٹھائی تھی اور اپنے سیدھے ہاتھ سے روٹی کھانی چھوڑی تھی۔ میرا دل کبھی کبھی اداس ہو جاتا۔ مجھے اپنے کیے پر افسوس ہوتا تھا۔ جیت سنگھ کی اور میری یاری بہت پرانی تھی۔ وہ اور میں بچپن سے

سے ہی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ عورت کے لیے لڑنا کتنی
بیکار سی بات ہے اور پھر بھی اس کا اور میرا جھگڑا ایک عورت کے
لیے ہوا تھا۔

بھلا سکھو اچھی تھی یا بری تھی۔ تو اس سے ہم دونوں کو کیا فائدہ۔
سکھو گاؤں کی کنواری اور بڑی طرحدار ٹھیاد تھی۔ اس کی صورت پر کبھی
چاند نہیں چمکا پر تہبند کو ڈھنگ سے باندھ کر جیسی چھینٹ کی کرتی پہنتی تھی
تو اس کے جسم میں سے آگ نکلتی تھی۔ جیت سنگھ اور میں دونوں بہت
دنوں اس کی آنکھ سے بچ کر رہتے۔ پھر اس کی نظر جیت سنگھ کو
کھا گئی۔

ہم دونوں میں سے کوئی بھی سکھو کے لیے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔
پر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ میرے جی میں گرہ پڑ گئی۔ ہم نے ایک
دوسرے سے بولنا چھوڑ دیا۔ جوانوں کی دو ٹولیاں بن گئیں۔ گاؤں بٹ
گیا۔ میری ماں اور جیت سنگھ کی ماں بہت فکرمند رہنے لگیں۔ پہلے
کھیتوں میں جاتے تھے تو جیسے دو بیٹے گھر سے آتے۔ اب دو دو کے ساتھ
جاتا۔ گاؤں کی ٹیاریں دروازوں کی درزوں میں سے ہمیں جھانکتیں، بہو بیٹیاں
گھونگھٹ کی اوٹ سے ہمیں دیکھتیں۔ یہ ہماری یاری کو دنیا کی نظر
لگ گئی۔

جب جیت سنگھ کو بچا کر میں نے اپنی چھری اس کے پیٹ میں اتاری ہے تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ ہری سنگھ نے میری بانہہ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا۔ اور شور کرتے گالیاں بکتے لوگوں کی بھیڑ میں سے نکال کر وہ مجھے بیٹ سے باہر لے گیا۔ دونوں گھوڑیاں سرپٹ ریتیاں کی پچھلی طرف سے ہو کر بیلے ماہیوں سے ہوتی بیکانیر کو جا رہی تھیں۔

چاند اونچا ہوتا جاتا تھا۔ اور کہیں کہیں کسی ایلی کی طرح زور سے چیخ اٹھتی۔ ابیا گانے اور ڈھولک کے ساتھ اوپر اٹھتے۔ گھنٹیوں کی آواز ادھر ادھر سے آ کر ہمارا راستہ کاٹتی گزر جاتی۔ پھر کوئل بولنے لگتی۔ اور اس کی کو ہو کو ہو ہچکیوں کی طرح میرے دل کے اندر ڈوب جاتی۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ مجھے جیت سنگھ یاد آ رہا تھا۔

ہری سنگھ چاچا کی گھوڑی راہ میں کئی بار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچی۔ اور دن ہوتا تو وہ راہ کی ماں بہن کو گالیاں دیتا مگر آج رات جب میں اور وہ بیکانیر جا رہے تھے۔ اس کو گالی یاد نہ تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ مجھے گھر یاد آ رہا تھا۔ آنگن میں سے پلٹ پلٹ کر جاتی اور پھر لوٹ کر آتی اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ گلی کا دروازہ کھول کر باہر جھانکتی بہنیں اور اسے بلاتی ہوئی دادی اور اس کا سفید بالوں سے بھرا سر یاد آ رہا تھا۔ سنتو جو کوٹھڑی میں باہر کی ہوا آہٹ پہ کان لگائے بیٹھی

سُلا رہی ہوگی۔ اور مُٹھی پر ہاتھ دھرے کانپ کانپ کر سوچ رہی ہوگی۔ "پیچھے سے پلٹنے والے پتہ نہیں کب گھر پہنچیں گے۔ آج کیا پتہ اب میں کب گھر آؤں گا؟"

مجھے ماں اور پتنی، دادی اور سنتو سب پر ترس آ رہا تھا جو نہیں جانتیں ان کا کیا حال ہوگا۔ ریتے والا اور کاٹیاں کے درمیان بہنے والی نہر کے پاس پہنچ کر میں نے کہا: "چاچا کیوں نہ ہم پلٹ چلیں۔ اور آدمیوں کی طرح جیسے تم سے کام کا کچھ جانتے ہیں؟"

ہری سنگھ نے زور سے میرا بازو پکڑا۔ اور سر اکڑا ہلا کر کہنے لگے

"تم کو ان حرفوں نے خراب کیا ہے جو منشی جی کے پاس تم نے مدرسے میں پڑھے۔ تم گاؤں کو نہیں بدل سکتے۔ تم زندگی اور پرانی ڈگر کو نہیں بدل سکتے۔ سب کچھ ویسا ہی رہے گا جیسے۔ بدلہ لینا اور آپ کو بچانا یہ دونوں کام تو ہیں کرنے ہوں گے تجھے۔ پیچھے میرے پیچھے چلے آؤ۔ تمہاری عقل کی ماں کی ایسی تیسی تم اب گاؤں میں میری جیسی واڑ واؤ گے۔ میرا بھتیجا اور جیت سنگھ کی ٹولی کے ہاتھ بُری موت مرے۔ نہیں بھاؤ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے بہت کچھ سہا ہے تم سے زیادہ کڑی زندگی گزاری ہے۔ بہت کچھ آن کی بھینٹ کیا ہے پوری زندگی چند گھڑیوں کی بھینٹ ہے۔ ایک بُری نظر کا بدلہ بھی لیا ہے۔ ہم نے بہت

کچھ کھو دیا ہے بھاؤ اور تم ایک دوسرے کو دیتے ہو۔ تم لوگ نہیں کا پاس نہیں کر سکتے۔ تو قول کا کیا کرو گے۔ تم لوگ مرتے یا ستے ہو تمھارا خون ہوتے ہوتے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تمھارے جی کو نہ یاری کا خیال ہے۔ اور نہ دشمنی کا۔ میں نے جل کر کہا "چاچا کیا آج میں نے جیت سنگھ کو نہیں مارا؟"

ہری سنگھ نے مڑ کر کہا اور پھر سوانیوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔ واپس جا کر اس کی ارتھی کو کندھا دے کر شمشان سے بارا چاہتا ہے یہ کیا ہوا؟

میں نے کہا چاچا تم غلط کہتے ہو۔ ہم ہر شے سے لڑ جاتے ہیں۔ میں آنسو نہیں بہا رہا۔ یہ گھر چھٹنے کا دکھ ہے۔

ہری سنگھ نے پھر ذرا سا ہنس کر کہا "گھر کی محبت! گھر میں تمھاری ماں ہو گی۔ بہن ہو گی، بیوی ہو گی؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

ہری سنگھ نے پھر کہا: "اور اگر میں تمہیں ایسے آدمیوں کا نشان دوں جنھوں نے بہنوں، ماؤں اور بیویوں کو قتل کر دیا۔ گھر کو آن پر قربان کر دیا۔"

"سنو چاچا۔" میں نے کہا۔ "آج میں بیکانیر کی طرف نکل جاؤں گا۔

اور پھر پتہ نہیں کب پلٹ کر آؤں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پیار اور لگاوٹ
کسی طرح کا کشش نہیں ہے؟"

"کشش۔ کشش؟ یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟" ہری سنگھ چاچا نے
اپنے دل پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ "اتنی یادوں کا بوجھ دل پر لیے
زندہ رہنا کبھی کبھار بہت کٹھن لگتا ہے بھتیجے۔ تمہیں کیا پتہ میں نے زندگی
میں کیا کچھ سہا ہے۔ کیا کچھ کھویا ہے۔ کتنے پیارا اپنے ہاتھوں دھرتی میں
ملائے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ ہے۔ تمہارے پاس یہ آس تو ہے کہ سال
چھ مہینوں کو لوٹ کر آؤ گے تو تمہارے گھر کے دروازے کھلے ہوں گے۔
حویلی میں تمہاری ماں اور دادی تمہیں دیکھ کر سینے سے لگالیں گی۔ تمہاری
بہن تم پر سے واری ہونے کے لیے اپنا دل بھی نکال کر تمہارے قدموں
میں رکھ دے گی۔ تمہاری بیوی گھونگھٹ کو ہاتھ تک کھینچے کھینچے
آنگن میں آکر تمہیں ایک نظر دیکھے گی۔ تمہاری لڑکیاں تمہاری ٹانگوں
سے چمٹ جائیں گی۔ تم مر نہیں سکتے جاتن۔ دنیا کے رشتے بستے
دل میں تمہارا حصہ ہے۔ پر میری طرف دیکھو۔"

میں نے چاندی کرنوں کے بہتے دھارے میں ہری سنگھ چاچا کی
طرف دیکھا۔ اس کی سفید داڑھی پر آنسو چمک رہے تھے اور آنکھیں اندر
دھنسی ہوئی اور بے نور لگتی تھیں۔ اس نے بانہیں چھوڑ دی تھیں اور

گھوڑی ان مختے دل سے اجنبی راہوں پر بیگانوں کی طرح ایک ایک قدم چل رہی تھی — اور چاچا یوں بیٹھا تھا جیسے اسے کہیں جانا نہ ہو۔ میلے کا شور بہت دور پیچھے رہ گیا تھا۔ پہلے میلے سے پلٹتے ہمارے ساتھ نئی خریدی ہوئی گھوڑیاں ہوتی تھیں۔ بانپتی اور تیز دوڑتی ہوئی ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر ہم باتیں کرتے اور شراب کی بوتلیں بانٹ بانٹ کر پیتے اور ٹھٹھا کرتے ہوئے گاؤں کو لوٹتے۔ آج میں اور میری جگہ چاچا گاؤں سے الٹی طرف جا رہے تھے۔ چاچا بھی اداس تھا۔

"چاننی تمہاری ماں کی طرح اگر میری ماں بھی ہوتی تو آج دل پہ ہاتھ دھرے ڈوبتی جان کے ساتھ تمہیں بیکانیر کی راہ دکھاتا اور مردوں کی طرح ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کی نصیحت کرتا۔ آپ اتنا اداس نہ ہوتا۔ تم بھی کہو گے میں اتنا بوڑھا ہو کر بھی ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ سفید بالوں اور بیتے سالوں کا بوجھ اٹھائے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ چاننی اور پھر بھی میں ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ تم اس کو میرے دماغ کی خرابی کہو گے۔ تم سوچو گے میں پاگل ہوں۔"

میں نے دھیرے سے کہا "نہیں چاچا میں تمہیں پاگل نہیں کہتا۔ میں تمہیں غلط بھی نہیں کہتا۔ مجھے تمہاری بات پر اعتبار ہے۔"

ہری سنگھ نے پھر کہا: "اعتبار کرو یا نہ کرو بھتیجے، پر یہ باتیں میں تمھیں ضرور دکھاؤں گا۔ تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ زندگی میں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے اور کیسی کیسی تمناؤں میں مرے گھاؤ ہوتے ہیں جسے نہ خوشی بھر سکتی ہے اور نہ ہی گزرتا وقت۔"

"اچھا چاچا!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا: "میں نے زندگی کا ابھی کچھ نہیں دیکھا پر پتہ نہیں کیوں، جیت سنگھ کا پیار میرے جی میں لوٹ آیا ہے۔ وہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں اگر وہ ہوتا تو آج ہم سکھو کو بیچ میں سے نکال کر پھر صلح کر لیتے۔ پچھلے دنوں کی طرح پھر گلے میں باہیں ڈال کر چلتے۔ اور دنیوں کی جوڑی کہلاتے۔"

ہری سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھری، کہنے لگا "ابھی رات باقی ہے سرحد کونسی دور ہے۔ آؤ اس اجاڑ کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ جائیں، میں تمھیں اپنا دکھ سنا دوں۔ تاکہ تمھارے جی کو تسلی ہو کہ لوگ جیت سنگھ سے بھی پیاری چیزیں اپنے ہاتھوں برباد کر سکتے ہیں۔"

میں کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ جو جگہ جگہ سے اینٹوں کے اکھڑے ہونے کی وجہ سے بہت پرانی لگ رہی تھی۔ دراڑوں میں اُگے پیپل کے پتے چاندنی میں چمک رہے تھے اور ہوا شاخوں میں سے سیں سیں کر کے گزر رہی تھی۔ ہم نے گھوڑیوں کے رسے گرے ہوئے ستونوں کی ایک

معبود اینٹ میں چھپا دیئے۔ ایک آگ چھپتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ گھوڑیاں ڈر کر ستونوں کے گرد چکر کاٹنے لگیں۔

میری سنگھو نے کہا: "گھوڑ اور گھر تب اُجڑتے ہیں۔ جب ان کو چلانے والا باقی نہ رہے۔ ماں کے بعد ہمارے گھر کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ پر بیٹو کو پالنے اور سنبھالنے کا سارا بوجھ میرے اور باپو کے سر پر آ پڑا۔ میری ماں نے بہت دُکھ سہے ہیں۔ پر وہ دیئے کی لو کی طرح بھڑک کر بجھ نہیں گئی۔ بھیکے بھیکے، ہولے ہولے گھل گئی۔ باپو کی طبیعت کی سختی نے اُسے برباد کیا ہے اُس کی طبع بڑی نازک تھی۔ بیل بیمار ہوتے تو وہ پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ کسی کی تکلیف اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ آپ دُکھ اُٹھاؤ تو دوسرے کے دکھ کی قدر ہوتی ہے یہ کٹھن تکلیفیں انسان کو پتھر بنا دیتی ہیں۔ ماں کا دل سورگ بن گیا تھا میری ماں بہت بڑی عورت تھی چاہتی بڑی اور اونچی عورت۔ اس نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ کبھی روئی نہیں۔ باپو کی جوانی میں اس نے سوکنوں کے نخرے اُٹھائے ہیں۔ رات رات بھر کھڑی رہی ہے۔ دھوپ کی سختیاں سہی ہیں۔ پوہ کی راتیں باہر بیٹھ کر کاٹی ہیں۔ اور جب میں جوان ہوا تو پر بیٹو کو چھوڑ کر وہ چلی گئی جیسے اس ستونوں کے پیچھے چھپ گئی ہو۔ مجھے آج بھی یقین نہیں کہ وہ مرگئی تھی۔ اس نے

بہت کچھ سہا ہے۔ اس میں اور بہت کچھ سہنے کی طاقت تھی نہیں جیسے
ماں تو کہ وہ مر گئی۔ اگر میں ماں کی تکلیفوں کا حال سنانے بیٹھوں تو یہ
رات بہت بیت جائے گی۔ اس سے اگلی رات بیت جائے گی اور
اس سے اگلی بھی۔ پھر اس کے دکھ کی کہانیاں مجھے سچی نہیں لگتیں۔ وہ
باتیں میں نے دوسروں سے سنی ہیں۔ بھلا اکیلی اور کمزور سی کم بولنے والی
عورت کتنا کچھ سہہ سکتی ہے۔ پریتو کو چھوڑ کر وہ مری ہے تو میں اور باپو
دونوں اکیلے رہ گئے۔ اور دونوں کے کندھوں پر پریتو کو پالنے کا بوجھ
پڑ گیا۔ ماں کے مائکے گھر کے لوگ لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے۔ پر باپو کا
دل پتہ نہیں ایکا ایکی اتنا نرم کیوں ہو گیا تھا۔ اسے ماں کی دی ہوئی تکلیفیں
یاد آئی نہیں۔ اور وہ پریتو کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پریتو ہمارے
سامنے بڑی ہوئی ہے میری بانہوں میں۔ اس کے جسم کی نرمی ہے میرے
دل میں آج بھی اس کا پیار ہے۔ ایسا نہیں جیسا ایک بھائی کو عام زندگی
میں ایک بہن سے ہوتا ہے۔ مجھے لگتا تھا میرا جسم ایک درخت تھا اور
وہ میری ایک شاخ تھی۔ اس کے ٹوٹ جانے کا گھاؤ کبھی نہیں بھرے
گا۔ یا یوں سمجھو وہ شاخ ٹوٹ کر اپنا نشان چھوڑ گئی ہے۔ پریتو ایک چاند
تھی جس سے میری زندگی کی تپش میں ذرا سی ٹھنڈک ہوئی تھی۔ میں ماں کا
بدلہ باپو سے نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا بھی کیا رشتہ تھا؟ میں نے پریتو

گڑیا سی ہے۔ مگر نتھو کی طرح پوتر اور آتما کی طرح میرے سانس کی ڈوری سی
اس میں اٹکی ہوئی تھی۔

وہ بڑی سی ہوتی گئی۔ تو ہمارے گھر میں بانو بہار آنے لگی۔ بابو شنکر کا
سانس پھولنے لگا۔ میں باہر سے آتا تو وہ دوڑ کر میری ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔
میں بیچارے کا تھیلا زمین پر پھینک کر جھٹ اُسے اپنے بازوؤں میں
اٹھا لیتا۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ ہلکا ہلکا امروں پڑوتا
لگتا۔ جانتی ہو تمہیں کیا بتاؤں وہ کیا شے تھی۔ اس کی باتیں ذرا ذرا سی ساری
مجھے ایک ایک کر کے یاد ہیں۔ چاہو تو میں تمہیں ایک ایک دن کی ساری
باتیں سنا دوں۔

وہ ذرا سی اور بھی ہوتی تو گھر میں ساری چیزیں ٹھکانے سے نظر آنے
لگیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے روٹیاں پکا کر جب وہ مجھے اور
باپو کو کھلاتی تو جہاں اپنے سے زیادہ خوش اور کوئی دکھائی نہ دیتا۔ چھوٹی
چھوٹی انگلیوں میں تاگے کا تار پکڑے اس نے چرخہ بھی کاتا ہے۔ کمزور
ہاتھوں سے دودھ بھی بلوایا ہے۔ جانتی ہو نہیں اس میں اتنی طاقت
کہاں سے تھی۔ بھلا دس سال کی لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے؟

اور بڑی ہوئی تو اس نے بڑا روپ نکالا۔ تتلی سی آنگن میں ادھر
سے اُدھر گھومتی پھرتی اور کام کرتی رہتی۔ رات کو تھک کر لیٹتی تو اب

مجھ سے کہانیاں بھی سنتی تھی۔ میں کہتا: "پرتیو تو اب پریوں کی کہانی
نہیں سنے گی؟" تو ہنس کر کہتی: "ویر بھلا اب میں کہانیاں سننے جیسی
ہوں۔ اب تو میں بہت بڑی ہو گئی ہوں۔" میلے پر جاتا تو میں اس کے
لیے رنگ برنگ چوڑیاں، مٹھائی اور کوئی کام کی شے ضرور لاتا۔

چوڑیاں بھی کیا شے ہیں۔ جب جاتی عورت پہن لے تو وہ گیت بن
جاتی ہے۔ ہولے ہولے چھن چھن کرتی۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر راگ
پیدا کرتی چوڑیاں عجیب چیز ہیں۔ کانچ کی چوڑیاں جیسے سات سُروں
کو کسی نے ہاتھ میں پرو دیا ہو۔

میرا سنگھ چپ ہو گیا۔ جیسے بہت سی باتوں کے بوجھ تلے دبا
سسک رہا ہو۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ چاند کے سامنے سے سفید
بادلوں کے ٹکڑے ذرا ذرا سے پرندوں کی طرح اُڑ اُڑ کر ہوا کے زور
سے بکھر رہے تھے۔ "میلے پر جانے کی ایک شام مجھے بہت اچھی طرح
یاد ہے۔ پرتیو نے حلوہ پکایا تھا اور پراٹھے پکا کر میرے لیے اپنے
ہاتھوں سے کاڑھے ہوئے ایک رومال میں باندھے تھے۔ جب میں
نے پگڑی کو کس کس کر باندھا تو میرے پاس کھڑی ابرق کو اکٹھا کرتی رہی۔
پھر اس نے میرے سر پر سے ماش وارے۔ میں نے کہا پرتیو تجھے
یہ باتیں کہاں سے آتی ہیں تو کہنے لگی: "مجھے اور بھی بڑی باتیں پتہ ہیں ویر

اس طرح سے نظر نہیں لگتی۔"

میں نے شام سے پہلے پہلے ہی گھوڑیاں تیار کر کے اور سامان لاد کر اونٹوں کو پیارا سنگھ کے ساتھ میلے میں بھجوا دیا تھا۔ پریتو کہنے لگی دیر میرے لیے میلے میں سے ڈھیر ساری رنگ برنگی چوڑیاں لانا۔ مٹھائی بھی اور ایک پنکھوں والی چھتری۔" جب میں دروازے سے باہر نکلا ہوں تو بوڑھی ماسی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔" وے چانن میرے لیے کرتے کا کپڑا لانا۔" پریتو کو میں نے اس سے کبھی زور سے بولتے نہیں سنا پر اس دن چیخ کر کہنے لگی۔" ماسی بھلا جاتے ہوئے کسی کو پیچھے سے آواز دیتے ہیں تو بھی پاگل ہے سکھ سے میرا ویر گیا ہے سکھ سے واپس گھر آئے۔" میں نے مڑ کر دونوں کو دیکھا اور ہنس پڑا۔ پریتو کو کتنی عقل آ گئی تھی۔ شام نے مجھے سلیٹی کپڑے سے اوڑھ دیا۔ کالے بادل آگے پیچھے گرجتی فوجوں کی طرح اٹھتے ہوئے اور جب میں اپنے گاؤں سے دو کوس گیا تھا۔ تو مجھے یاد آیا کہ میں نے جلدی میں دانا گھاس بھی نہیں لیا۔ اور نہ پان کی ڈبی کا پان لیے۔ یہ سوچتے سوچتے میں سنگھے کیرے جا پہنچا۔ میلے میں جانے والے لوگ گڈوں پر گھوڑیوں پر اور اونٹوں پر ایک دو دو چار ہے تھے۔ گھوڑیوں کے پاؤں میں پڑے گھنگھرو چھن چھن کرتے ہوئے اور گانے والوں کی لے میں رس

سا گونج رہے تھے۔ اونٹنیاں بھاری قدموں سے تیز تیز چلتی ہوئی مستانی چال سے
جھولتی ہوئیں اوپر بجتے اور راگوں میں بجنے والے دماموں میں لہریں پیدا
کرتی ہوئی آگے ہی آگے جا رہی تھیں۔ گاڑیوں کے نیچے بتیاں جل رہی
تھیں اور جوان بیلوں کے دودھیا پٹھے ادوان کو چیر کر باہر نکل کر گویا
سے آگے ہی آگے جا رہے کسی کنواری کا دکھتا ہوا جوبن ہو۔ جوان
ہوتے لڑکے شور کر رہے تھے۔ اور جانوروں کی بولیاں بول رہے
تھے۔ گھوڑے دوڑا کر آگے نکلنے والے لڑکوں کو میلے کی خوشی
اور زندگی کا نیا پن شراب کے نشے کی طرح مدہوش کر رہا تھا۔ اجاڑ
راہیں آباد تھیں۔ اور گرو کے نام کا نعرہ درختوں کے بیچ بیچ راستوں
اور چھوٹی راہوں پر زور سے گونج اٹھتا۔

میں نے سوچا کیوں نہ واپس جا کر کیس سے آؤں۔ کرپان کے
بنا میلے میں جانا بھی بھلا نہیں لگتا۔ لوگوں سے یونہی لڑا جانا ذرا ذرا
سی باتوں پر لڑنے لگنا میری عادت نہیں۔ اور پھر یہ کوئی مردمی تو نہیں
کہ کرپان ہاتھ میں ہو تو ساری دنیا تمہیں کیڑے مکوڑے کی طرح لگے۔
میں نے کہا چاچا میں نے تو ایسا نہیں سوچا تھا۔ جیت سنگھ مجھ
سے تگڑا جوان تھا اور تمہیں پتہ ہے اس نے کبھی کسی سے پچھاڑ نہیں
کھائی۔ کسی سے دبا نہیں۔

ہری سنگھ نے میرے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ پر جوان میں نے یہ کب کہا ہے کہ تو نے جیت سنگھ کو کمزور سمجھ کر مارا ہے۔ میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔ میلے میں کرپان نہ ہو تو آدمی خالی خالی لگتا ہے جیسے سوتے سے اٹھ کر چلا آیا ہو۔ کرپان کا ابرق اور ہتھے کے رنگ برنگے رنگ اور جوتی کی اوپر کو اٹھی نوک۔ سب میلہ ہی کی اکلا لگتے ہیں۔ سکھتے کھیڑے میں میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرے یار میلے کے لیے جا چکے تھے۔ حویلیوں میں دیے جل رہے تھے اور بوڑھے کہار آگ تاپتے ہوئے ایک ایک دو دو پرانے سرداروں کے قصّے سنا رہے تھے۔ عورتیں باہر سے لوٹ رہی تھیں۔ اور جوان لڑکیاں زور زور سے باتیں کرتی کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ میں نے اپنی باگیں کھینچیں اور گھوڑی کو دوڑاتا گاؤں پلٹ آیا کہ کھیس اور کرپان لے کر پھر جاؤں گا۔

گلیوں میں خاموشی تھی۔ تیز ہوا کے سانٹے تھے اور گرد اڑ رہی تھی۔ بادل سکھتے کھیڑے کی طرف چلے گئے تھے۔ اور ہمارے گاؤں پر چاند ہولے ہولے نیلے پانی میں کشتی کی طرح تیر رہا تھا۔ جیسے سفید بطخ اکیلی جوہڑ کے میلے پانی پر ہو۔ پتہ نہیں کونسی طاقت تھی جو مجھے واپس لائی تھی۔ گھر کی دیوار کے ساتھ نیم کا ایک بڑا درخت ہے اب تو اس کی شاخیں آنگن میں بہت اندر کی طرف جھک آئی ہیں اور دیوار میں

بڑی دراڑ پڑ گئی ہے۔ ان دونوں نیم کی ڈالیاں دیوار سے اندر کی طرف جھکی جھکی اور نرم تھیں۔ اور آدمی آرام سے اُس پر سے کود کر بنا آواز پیدا کیے۔ آنگن میں اتر سکتا تھا۔ میں نے گھوڑی کو نیم کے ساتھ باہر باندھ دیا۔ اور دیر ہو جانے کے ڈر سے کود کر اندر چلا گیا۔ بوڑھی ماسی رضائی میں مُنہ دیے باریک خراٹے لے رہی تھی۔ سانس کے ساتھ اُس کے گلے میں بلغم غر غر کرتی۔ دیا جل رہا تھا اور پریتو کا پلنگ خالی تھا۔ پہلے میں نے سوچا ماسی کو جگا کر اس سے آ پتہ پوچھوں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دیا لے جا کر دوسری کوٹھڑی میں رکھ دیا اور آپ اُسی راستے باہر آ گیا۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ میرا دل پاگل ہو رہا تھا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ پریتو کے لیے پیار کی تہوں میں چھپا پتہ نہیں کب کا دبا غصہ میری نس نس میں گھوم رہا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ میں پریتو کو زور سے پکارنا چاہتا تھا۔ اتنی زور سے کہ سوئے کر جانے لوگ جاگ جائیں۔ اور مجھ سے پوچھیں کیوں کیا بات ہے؟

کھیتوں کی اونچی منڈیروں اور شہتوت کے خوشبو دار مٹھاس سے بھرے درختوں سے ٹکرا کر میری آواز لوٹ آئے اور پریتو اس کے ساتھ ساتھ اڑتی میرے پاس آ جائے۔ کبھی کبھار دماغ بھی کیسی انہونی

باتیں سوچتا ہے۔

گھوڑی کو میں نے ایک اجاڑ کھوہ پر باندھ دیا۔ میں دوڑ رہا تھا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ پتہ نہیں کون شے تھی جو مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ میں زندہ تھا اور میرا سانس چل رہا تھا۔ کیوں جاتن کیا تو نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ایسی گھڑی تمہارے سر پہ ہے جب اس کے بوجھ سے تمہارا دم بند ہو سکتا ہے۔ تم موت اور جینے کے درمیان کسی ایسی حد پر تڑپ رہے ہوتے ہو جو حد تم چھو نہیں سکتے اس حد کا کوئی نام نہیں

پھر میں نے پریتو کو دیکھا۔" وہ اور جوالا سنگھ ایک درخت کے پاس کھڑے تھے جو ذرا اوٹ میں تھا اور اونچے کھیت کی وجہ سے نظر بھی کم آتا تھا۔ پریتو کے بعد میں نے وہ درخت آپ کاٹ دیا تھا۔"

"کون جوالا سنگھ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"اوئے بھئی وہی جوالا سنگھ جو میری ماسی کا پُوت تھا جس کا گھر تمہارے گھروں کے ختم ہوتے ہی گلی کے دوسرے سرے پہ ہے جس میں چننت کور رہتی ہے۔" ہری سنگھ نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

"اچھا اچھا سمجھ آ گئی میں وہ دوسرا جوالا سنگھ سمجھ رہا تھا — ہرنام سنگھ کا سالا۔" میں نے بڑی آسانی سے جواب دیا۔ "تم سوچتے ہو

میری بہن سے بات کرنے والا میری چوری چھپے اُس سے ملنے والا آدمی آج تک زندہ ہو سکتا ہے۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو بیٹے؟ کیا تم کو یہ یقین ہے کہ اس رات جب میں میلے پر جانے کے لیے گھر سے چلا گیا تھا اور پریتو اُس سے ملنے اُس شریں کے پاس کھڑی تھی، میں نے جوالا سنگھ کو زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا ہو گا؟ پریتو اُسے کہہ رہی تھی: "جوالا سنگھ تو میرے ویر کی طرح تنو مند نہیں اور نہ ہی میرے باپو کی طرح بہادر ہے پر پھر بھی تو مجھے اچھا لگتا ہے۔"

جوالا سنگھ نے کہا: "ایسی باتیں تو ہر عورت کسی نہ کسی مرد سے کہتی ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ تو زندگی میں ہی نہیں موت میں بھی میرا ساتھ دے۔ سدا سدا کے لیے مجھ سے نباہ کرے۔"

اور پریتو نے اُس کے بازو پر ہاتھ دھر کر کہا: "اچھا جوالا سنگھ میرا تیرا قول رہا۔ میں موت میں بھی تیرا ساتھ دوں گی۔"

وہ موت سے کتنے قریب تھے۔ میں کھیت کی اوٹ میں اُن کے پیچھے کھڑا رہا۔

پہلے میرا جی چاہا کہ میں کرپان کا ہاتھ لمبا کر کے ماروں اور اُن دونوں کو وہیں گرا دوں۔ پھر میں کچھ سوچ کر لوٹ آیا۔ میں گھر میں پریتو کے پلنگ میں لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک آہٹ پر

میں چونک چونک جاتا۔ وقت چیونٹی کی چال چل رہا تھا۔ کھسکتا ہوا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد ذرا سا کھٹکا ہوا۔ جیسے کوئی بلی آنگن میں کودے۔ پھر سانس روک کے پنجے کے بل چلتی پریتو اندر آئی۔ اس نے ٹٹول کر اپنا پلنگ ڈھونڈا۔ جس پر موت اس کا انتظار کر رہی تھی جو بھی محبت کی طرح زبردست ہے۔

جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہے تو وہ ٹھٹھرا تھا۔ میں آگے گھسیٹتا ہوا دوسری طرف کو تڑپا میں لے گیا۔ وہ میرے ساتھ یوں کھنچی چلی آئی جیسے اس میں جان نہ ہو۔ دیے کی لو کو اونچا کر کے میں نے اسے کہا۔

"سچ بتا تو کب سے جوالا سے ملتی ہے؟"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر کو نیچا کیے بیٹھ گئی اور آخر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ میرا بھی دم دم آگ ہو رہا تھا۔ میں آوا بھی آواز سے بول بھی نہیں رہا تھا۔ کوٹھڑی میں ہماری آواز کی گونج نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا۔ ہم دونوں سانس بھی نہیں لے رہے تھے جب میں نے کہا۔ "اس جوالا سنگھ سے بھی نمٹ لوں گا۔" تو پریتو نے سر اونچا کر کے مجھے دیکھا اور کہنے لگی "ویرا اس کا کوئی قصور نہیں۔"

میں نے دانت پیس کر کہا: "اچھا اُس کا کوئی قصور نہیں تو نہ سہی۔" پھر میں نے کرپان کے ایک ہی ہاتھ سے اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ اُس کا جسم تھوڑی دیر تڑپا اور پھر جیسے ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اُس کے ٹکڑے کیے اور بوری میں بند کر کے اناج کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ آنگن میں دبے قدموں چلتا میں پیچھے کے راستے گلی میں آ گیا۔

جگت کور کے گھر میں جو پیپل ہے وہ اُن دنوں اتنا اُونچا نہ تھا دیوار کے برابر اگر کسی طرح باہر کی طرف سے چڑھ جاؤ تو اندر آنے میں آسانی رہتی ہے۔ جب میں نے اندر جا کر جوالا سنگھ کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے تو میرا دل بڑا شانت تھا، ٹھنڈا اور کام کرنے کے لیے تیار۔ جوالا سنگھ نے کرتا نہیں پہنا ہوا تھا۔ دونوں بغلوں میں ہاتھ دیے جب اُس نے "کون ہے؟" کہہ کر دروازہ کھولا۔ تو میں موت بن کر اُس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اُسے ہلنے بولنے کا وقت بھی نہ دیا۔ اپنی پگڑی سے میں نے اُس کے ہاتھ پیر اچھی طرح جکڑ دیے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ کہ وہ ہل اور بول نہ سکے۔

بخشی ابھی تک سو رہی تھی۔ بخشی میری پرتھو کی بڑی سہیلی تھی۔ جوالا سنگھ کی ماں کے مرنے کے دُوسرے بیٹے برادری کی سب سے چھوٹی

لڑکی کو چاہیے کرتار سنگھ نے جوالا سنگھ کے لیے مانگا تھا۔ اس کا گھر سونا
تھا۔ سارے لوگوں کو اس سے ہمدردی تھی اور بخشی کے باپ نے کہا
تھا: میں نے تجھے اپنی لڑکی دان دی ہے۔ بخشی بڑی الھڑ تھی۔ وہ
گھر سنبھالنے کے قابل نہ تھی۔ یوں بھی پرتیو جیسی سوجھ بوجھ ہر لڑکی
کہاں ہوتی ہے۔ بخشی کی عادتوں میں ابھی بچپنا تھا۔ اور اسی لیے
جب اس کے پاس ہی میں نے جوالا سنگھ کو باندھا ہے تو بھی
وہ نہ جاگی۔

پھر میں نے اسے جگا کر باندھ دیا۔ وہ بندھی ہوئی بھی اونگھ
رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارا تماشا کیا ہو رہا ہے۔ وہ
بڑی بڑی آنکھیں کھولے میلے بالوں میں گندی سی گڑیا لگ رہی تھی۔
جو یونہی کسی مصیبت میں پڑ گئی ہو۔

پھر میں نے بوڑھے کرتار سنگھ کو بھی رسیوں سے جکڑا اور
اسے بھی اس کوٹھڑی میں لے آیا۔

پھوس کے ڈھیر میں نے پہلے سے ہی کھسکا کر کوٹھڑی کے
دروازے کے قریب کر لیے تھے۔ پھر میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے
کہا: "جوالا سنگھ! میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو میری اسی کا پوت
تھا۔ تو نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے تجھے اس کا بدلہ دینا ہوگا۔

جوالا سنگھ کی آنکھوں میں خوف تھا۔ جیسے اُس کھیل کا ایسا آخر اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ ایک بچے کی طرح جس نے کھیلتے کھیلتے اپنی سب سے پیاری شے کھو دی ہو۔ اور اب افسوس بھی نہ کر سکتا ہو۔ پر اس کی آنکھوں میں زندگی مانگنے کی بھیک نہ تھی۔

میں نے کہا: "تم دونوں نے زندگی اور موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا یہ قول نبھانا ہوگا۔" پھر میں نے بخشی سے کہا: "بخشی تو نے میرا قصور نہیں کیا۔ میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں۔ تو اگر چاہے تو بچ سکتی ہے۔ تو جوالا سنگھ کے ساتھ کیوں آگ میں پڑے بول بخشی! تیری اور میری بہن کی بڑی پریت تھی۔ اب وہ پریت نہیں رہی۔ وہ بھی نہیں رہی۔ پر مجھے تجھے کچھ نہیں کہنا بول!"

جب میں نے بخشی کا منہ کھول دیا تو وہ کہنے لگی: "ہری سنگھ گرنتھ کے سامنے میرے اور جوالا سنگھ کے پھیرے ہوئے تھے۔ اور میں نے بھی آخر تک اس کا ساتھ دینے کا قول کیا تھا تب واہگرو بھی وہاں تھا۔ اب بھلا میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی اس کے پیچھے زندہ رہ کر کیا کروں گی بتا؟"

وہ چھوٹی اور الھڑ سی لڑکی کہاں تھی۔ وہ لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے بڑی چھوٹی سی گندی میلی گڈی لگ رہی تھی۔ اور یہ عورت جو جوالا سنگھ

کے ساتھ موت قبول کر رہی تھی۔ یہ یقیناً بخشی نہ تھی۔

میں نے کہا: "اچھا جو تیری اور واہ گرو کی مرضی ہو۔ اور میں نے اس کا منہ پھر باندھ دیا۔

پھر میں نے چاچے کرتار سنگھ سے کہا: "چاچا تیری میری کوئی لڑائی نہیں۔ میرا باپو تیرا بھائی ہے تو ہماری برادری کا سب سے عقلمند آدمی ہے۔ تیری بات چوپال میں کسی نے کبھی رد نہیں کی۔ بتا میں کیا کروں۔ جوالا سنگھ نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا چاچا، پر تیری زندگی تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر تو کہے تو میں تجھے چھوڑ دوں۔

چاچا نے کہا: "ہری سنگھ پوت یہ زندگی کی ڈگر ہے جس کو ہم میں سے کوئی بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تو نے جو کچھ کیا اگر نہ کرتا تو تو مرد نہ ہوتا۔ تیری راہ سیدھی ہے۔ میں تجھے دوش نہیں دوں گا۔ پر میں بھی بہت بوڑھا ہوں اور جوالا سنگھ کے بعد تجھ سے اس کی موت کا بدلہ لینے کے قابل نہیں۔ میری ہڈیوں میں اب نہ وہ جوش ہے اور نہ طاقت۔ جوالا سنگھ کے بعد میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ ہری سنگھ اچھا ہے تو جو کچھ اس کے ساتھ کرنا چاہتا ہے کرے پر ہم اس کا ساتھ دیں گے۔

میں بھی اور بخشی بھی پھر اس نے پہلی بار اپنی ننگے سر بیٹھی بے بس بہو کو دیکھا

اور منہ دُوسری طرف پھیر لیا۔

میں نے بھوسی کے ڈھیر جوڑ کے اُن کے گرد چُن دیے۔ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی۔ اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

اناج کی کوٹھڑی میں سے پرمیتو کے ٹکڑوں سے بھری بوری اُٹھا کر میں جب تیزی سے گلیوں میں سے گزرتا نہر کے پل کی طرف جا رہا تھا۔ تو گاؤں میں واویلا مچا ہوا تھا۔ لوگ جوالا سنگھ کے گھر کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ مجھے معلوم ہوتا وہ تینوں کب کے جل چکے تھے۔ تینوں جنھوں نے الگ الگ مرنے اور بہت دنوں ایک دُوسرے کا انتظار کرنے کی بجائے ایک ساتھ مرنا قبول کیا تھا۔

نہر پانی سے بھری ہوئی اور بادلوں کے سیاہ ٹکڑوں کے پھٹے کناروں سے چھنتی روشنی میں سیاہی اور سفیدی سے بنا دُور تک پھیلا کپڑا لگ رہی تھی۔ پل کے نیچے اندھیرا تھا۔ اور پانی گھر گھر کے ستونوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ اچھل رہا تھا اور بھنوروں میں گھوم رہا تھا۔ اندھیکار جس کا رشتہ پتہ نہیں کس پاتال اور کس ساگر کے ساتھ تھا؟ میں نے بوری کو سر سے اُوپر اُٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے میں آپ بھی اپنے سر سے اُونچا اُٹھ گیا ہوں اور اب بوری

نے ساتھ نہر میں گر جاؤں گا۔ مگر میرے قدم دھرتی پر تھے اور ابھی کتنے
ہی گناہوں کا بوجھ میں نے اُٹھانا تھا۔ پرنیتو کے چھپنے اور اس کی آشنائیں
سارے اندھیرے میں اپنا راہ ڈھونڈنے میں کسی نئی پاتال میں اُتر
گئے۔ اس گھڑی مجھے یاد آیا۔ کہ میلے پر جانے سے چند دنوں پہلے
میں نے اُسے آپ ہی آپ ہنستے دیکھا تھا۔ چوکے میں بیٹھی ہے۔ روٹی
پکا رہی ہے اور من ہی من میں مسکرا رہی ہے۔ ہونٹ آدھے کھلے ہیں
اور آنکھیں پتہ نہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ جیسے وہ اس دُنیا میں نہ ہو۔ میں
اور باپو چارپائی پر بیٹھے ہیں اور پانی پکڑانے میں بے دھیان سے وہ
گلاس میری جگہ باپو کو روٹی میرے تھال میں رکھ رہی ہے۔ اتنی بھی؟
دونوں ہوتے ہوئے بڑبڑاتی رہتی۔ مگر پرنیتو کسی بات کا بُرا نہ مناتی۔ اس
کی چُپڑی میں اُن دنوں رنگ بھی گہرا ہوتا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا۔
جہاں ہوتی لڑکیاں رنگوں اور سپنوں اور پھولوں سے آنے والے دنوں
کا سواگت کرتی ہیں۔ پُل پر کھڑے میں نے کہا تھا: "ہاں ہوتی تو اس طرح
پرنیتو کا اور میرا رشتہ ٹوٹ نہ جاتا۔ پرنیتو کے بعد اُس آنگن میں کبھی بھی کسی
کی چہکار سُنائی نہیں دی۔ کبھی چوڑیوں کی جھنکار نہیں گونجی۔ کبھی سپنوں
بھری آنکھیں دیواروں پر نہیں پڑیں۔ جانے سنگھو اُن دنوں مجھے پتہ چلا
تھا۔ کہ سپنے دیکھنے عورت کے حصے میں آئے ہیں۔ عورت آپ بھی ایک

سپنا ہے۔ پھولوں کے اندر خوشبو میں بند۔ رنگ کے اندر اس کی اڑان میں بند۔ عورت ماں ہو۔ بہن ہو۔ بس سپنے دیکھتی ہے اور ان کو سچ سمجھنے میں اپنی ساری زندگی برباد کر دیتی ہے۔ پریتو کا سپنا چھوٹا سا تھا۔ برسات میں اڑنے والی چیونٹیوں کی طرح۔ اس سپنے کے پر نکل آئے۔ وہ روشنی کی تلاش میں گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ وہ دیا بھی بجھ گیا۔

اسی رات میں میلے میں پہنچ گیا۔ میں نے سارے سودے خسارے کے بیچے۔ پیارا سنگھ نے میری شکل دیکھ کر کہا: "سردار تیری صورت تو پھیکی اور رنگ اتنا اڑا اڑا کیوں ہے۔ کیا تیرا جی اچھا نہیں؟" بات مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اور میں نے اسے سمجھنے کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی آجاتی۔ میلے میں پھیلے دور دور تک کے ہاٹ مجھے زہر لگتے۔ چوڑیوں کی دکانوں پر اپنی بانہیں بھرواتی سوانیاں مجھے بہت بری معلوم دیتیں۔ ساری عورتیں ہی ایسی ہو سکتی ہیں۔ اپنے سپنوں کو لے کر دیوں کی کھوج میں گھومتی ہوئیں۔ مجھے کسی پر اعتبار نہ رہا۔ دنیا کی ساری روشنی سمٹ کر میرے لیے ایک نکتہ بن گئی۔ خوشیاں دکھوں میں مل گئیں۔ پریتو کے بعد سے مجھے کسی شے کی کھوج نہیں رہی پیارا سنگھ۔ مجھے آج تک کسی شے

کی کھوج نہیں ہے پر ایک بات کا پتہ نہیں چلتا ہاں سنگھ! انسان اتنا خود غرض کیوں ہے وہ سارے پیار اپنے لیے ہی کیوں بیٹنا چاہتا ہے؟ میں نے کہا شاید یہی بات تھی۔ میری اور جیت سنگھ کی خود غرضی ہی تھی۔ جو ہمارے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

ہری سنگھ نے کہا: "نہیں بھتیجے مرد عورت کے سارے سپنوں کا دیا آپ بڑا اچھا ہے۔ سالوں کے بعد یہ بات مجھے جب سمجھ آئی ہے تو پر تو نہیں ہے۔ اس غصے میں جو پیار کو پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ بھی قصور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ پریتو میرے علاوہ کسی اور میں وشواش کرے۔

"شاید یہ بات ہو؟" میں نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

کونجوں کی ڈار چاند کے سامنے سے اڑ کر آکاش اور دھرتی کے ملتے کناروں کی طرف چلی گئی۔ کھوہ پر ٹوٹی اینٹوں میں سے پھدک پھدک کر مینڈک باہر نکل آئے اور پیپل کی شاخوں پر پرندے کبھی کبھی نیند میں چونک چونک کر بولنے لگتے۔ میں سوچ رہا تھا۔ ہیکا بیر سے ہم کتنی دور ہے؟

ہری سنگھ نے کہا: "میلے میں ہاٹ ہاٹ گھومتے جب ہم

یہ خبر ملی کہ رات کسی نے میری بہن پرتیو کو مار دیا ہے۔ جوالا سنگھ کا گھر
جل گیا ہے۔ اور وہ سارے اندر جل کر مر گئے ہیں۔ تو میں پرتیو کے لیے
چوڑیاں لیے بنا چنگیوں والی چھڑی اور اسی کے لیے کرتے کا کپڑا خریدے
بغیر واپس آ گیا۔ آس پاس جیس کسی پر شک کیا جاتا تھا۔ شہر میں سختیاں
سہتا اور پولیس کے چکر میں پڑا رہا۔ تین سال بعد مقدمہ خارج ہو گیا۔

کسی عورت کو چوڑیاں پہنے دیکھوں تو مجھے پرتیو یاد آ جاتی ہے
چنگیوں والی چھڑی میں مجھے پرتیو کا دل اٹکا لگتا ہے۔ میں نے تب سے
آج تک کسی بھی شادی نہیں کی کبھی چاہ نہ سکا۔ زندگی کی ساری خوشیاں میرے
لیے اس دن ختم ہو گئی تھیں۔ جب پرتیو سر جھکائے میرے سامنے بیٹھی
اور میں سوچ رہی تھی۔ کہ سارا قصور اُس کا ہے جوالا سنگھ کا
نہیں۔ عورت اپنے سپنوں کی خاطر یوں چپ چاپ بھینٹ چڑھ جاتی
ہے۔ ہم عورت کے سپنوں میں کہیں نہ کہیں روڑے بن جاتے ہیں۔ ہم
اسے سپنے بھی نہیں دیکھنے دیتے۔ ہم سب کے سب تم اور میں اور یہ
دنیا اس کے سپنوں کے ہی خلاف ہیں۔

پرتیو کے مرنے کے بعد، سونے گھر کو بسانے کے لیے باپو
نے میری منت کی۔ دل ہی دل میں اپنے پر اور باپو پر اور باقی گاؤں
پر ہنسا۔ میں نے باپو کی بات مان لی۔ آخر کہاں تک کوئی بنا بات کے

انکار کرتا جائے۔ جن دنوں برادری کی عورتیں ہمارے گھر میں ڈولک لے کر بیٹھتیں تو میں باہر نکل جاتا۔ اُن راتوں میں میں نے پریتو اور جیالا سنگھ دونوں کو دیکھا ہے۔ درختوں کے تنوں کے پاس کھڑے چاندنی کرنیں اُن کے آرپار ہوتی جاتیں۔ جلتے ہوئے تصویر کی طرح ہوا کے ساتھ اُڑتے وہ میرے پاس آتے اور پھر دُور چلے جاتے۔ میں آنکھیں مل کر دیکھتا تو وہاں کچھ نہ ہوتا۔ پر میری بہن نے کبھی میری طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ آخری رات کے بعد جب وہ میرے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا۔ عورت رنگ روپ اور سپنا ہے۔ جیا تو سنگھ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

وقت وقت کے دُکھوں کی دوا ہے پر وہ میرے لیے کچھ نہ کر سکا۔ پتہ نہیں کون سی شکتی ہے جو آج تمہارے سامنے مجھے اپنے آپ کو اس طرح ننگا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ ہم ساری عمر لپٹے لپٹائے اپنی گٹھڑی کو اپنے کندھے پر اُٹھائے گھومتے ہیں اور آج جب میں تمہیں اتنا کچھ بتا رہا ہوں یہ کیوں نہ بتا دوں کہ سرجیت کو بھی میں نے مار دیا تھا۔

سرجیت جیسے سر ہو گیت کا بہتا دھارا ہو۔ جیسے کسی راگنی کا

ڈوپ ہو۔ اتنی کومل کہ ہوا پر تصویر کی طرح لگتی۔ چاندنی میں اُس کی طرف
دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ روشنی کے ساتھ اوپر اٹھتی لگتی۔ کرنوں کی سی نرمی
سے دل کے اندر اتر جانے والی تھی کے سامنے اُس کے ڈوپٹے پر
مان لی، پر میں غلط کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے جیتا جاگتا چاہتی تھی۔

میرے لیے ساری عورتیں پرتیو ہیں۔ اگر وہ اٹھا سپنا لے سکتی
تھی۔ تو ہر عورت غلط ہے اس کے بعد دنیا میں کیا باقی رہا ہے اور
اگر ہے تو میں اس پر وشواش کیسے کر سکتا ہوں؟

دکھی دل کے ساتھ میں نے سوچا میں سرجو کو ساری عمر گھر نہیں
لاؤں گا۔ مگر اس کا باپ سفید پوش تھا۔ دس گاؤں میں اُس کی عزت
تھی۔ ان کے ڈر سے میرے انکار کے باوجود بابو نے بیاہ کے چار
ماہ بعد مجھے اُسے لوانے کے لیے اُس کے میکے گھر زبردستی بھیج دیا۔

"بہار کی سہانی رُت تھی۔ سرد ہوا میں آموں کے بور کی خوشبو
تھی۔" ہری سنگھ چاچا ایک دم چپ ہو گیا۔ دور کہیں کوئل کوہو کو بول
رہی تھی۔ چاند نیچے جھکتا جاتا تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ کیا قبر کی سرحد
پار کرنا اب کبھی ہو سکے گا۔ جیت سنگھ بے آواز قدموں سے سدا
میرا پیچھا کرے گا۔ میں کہاں جا سکوں گا۔

ہری سنگھ چاچا یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور بولا "چاندنی بیت چلے

میری ساری زندگی پر پھیلے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

میں نے کہا: "نہیں چاچا بہار کی رُت کی بات سن کر بھی تُو اوقت باقی ہے۔ تم کہو پھر سرجیت کا کیا بنا؟"

"سرجیت کو میکے گھر سے لانے جاتے ہوئے میں جوان تھا۔ جاتن میں تم سے بھی جوان تھا۔ میری نئی جُوتی دھوپ میں چمکتی اور چمک میرے ہاتھوں میں مہندی کی باس میں مل کر میرے گرد پھیل رہی تھی۔ میں اصیل گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھا تھا۔ پر میری آنکھوں میں سرجیت سے ملنے کی خوشی کا نشہ نہ تھا۔ مجھے پریتو یاد آ رہی تھی۔ جیسے نے کہا تھا۔ جوالا سنگھ کا کوئی قصور نہیں۔ وہ کیوں جوالا سنگھ کو بچا کر سارے الزام اپنے سر لینا چاہتی تھی۔ کیا محبت موت سے بھی زبردست ہے؟ اور اس دن پہلی بار میرا جی چاہا، میں بھی کسی کو چاہوں۔ کسی کے لیے اپنے گلے پر چھری چلوا لوں اور اُف نہ کروں۔

مگر سرجو کو میکے سے لینے جاتے میں نے سوچا تھا میں اسے کب اٹھا سکوں گا۔ اُسے دینے کے لیے میرے پاس کیا ہے۔ اُس سے لینے کی بھی میرے دل میں کوئی خواہش نہ تھی۔ میرے دل میں کسی چاہت کا خیال نہ تھا۔

میں نے دھوکا باز کی طرح جھوٹی مسکراہٹ کا پردہ سا اپنے

اُوپر کر لیا۔ سسرال گھر میں فولادی پلنگ پر بیٹھا جھکی جھکی آنکھوں سے
سب طرف دیکھتا میں ساس اور سسر جی کے باپ اور بھابیوں کی
دلداری کرنے کی کوششوں کو دل ہی دل میں ہنس کر دیکھ رہا تھا۔ وہ
سارے پیسے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں
دم دم پر گھونگٹ میں کھڑی ہو کر اندر جھانکتیں۔ کہاریاں تخت پر بیٹھے
مجھے پنکھا جھلتیں۔ میں اُس گھر کی زندگی تھا۔

سسرال گھر سے ہم چلے ہیں تو سارا ان کا جیا گھڑا زدوں زدوں کا
سسر جی کی ڈولی کے ساتھ تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا اگر پریتو زندہ ہوتی تو
سویرے کے ساتھ وہ بھی یونہی وداع ہو کر کسی گاؤں جاتی۔ کوئی ڈھم
چھیلا ہمارے بھی آنگن میں آتا۔ ہم سب گھنٹوں سے اُس کی تواضع کرتے
اُس پر سے روپے وارتے۔ لال پایوں والے فولادی پلنگ پر
بٹھاتے اُس کے آگے پیچھے پھرتے۔

سایوں میں یونہی جگہ بہ جگہ ٹھہرتے میں نے کہاروں کو تھکا دیا۔
شام ہمیں گاؤں سے دو چار کوس اِدھر ہی ہو گئی۔ نہروں میں پانی تھمے
ہوئے بہنے لگا۔ ہوا تھک کر آہستہ چلنے لگی۔ بادلوں کی سُرخی پانی میں
گھل گئی۔ چارے کے گٹھے اٹھائے عورتیں اور بیلوں کو ہانکتے
چھوٹے لڑکے اندھیرے کے بھتنوں کی طرح ہو گئے۔ کھیتوں میں ڈوبتے

درختوں پر چڑیاں۔ کوّے بیٹھنے لگے۔ دُور تک پھیلے کھیتوں کی ہریالی میں بھی اداس کر گئی۔ نئی دھرتی کی باس جل سے نکلتی ہوئی بہاروں مجھ سے مجھے بچھڑنے لگی۔

میں نے کہاروں سے کہا۔ تم ڈولی لے کر آگے چلے جاؤ۔ ہم اور سرجو نہر کے کنارے چلتے ہیں۔ وہ سارا دن بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہو گی!

میں نے جب ڈولی کا لال پردہ اٹھایا تو سرجو کی آنکھیں جھک گئیں وہ رنگین شلوار کو سنبھالتی اور منہدی سے رنگے پیروں کو آگے کرکے اترنے لگی۔ اُس کے گلے میں پڑے زیور اور رواتی ہار کے نگوں پر روشنی دھنک کے سارے رنگ بن رہی تھی۔ نتھ میں لگے سُرخ موتیوں کا عکس اُس کے ہونٹوں کو اور بھی سُرخ کر رہا تھا۔ اپنی پلکیں جھکائے انگوٹھے سے بھرا ہوا ریشم ماتھے تک کھسکاتی وہ باہر آ گئی جب کہار ڈولی لے کر دور چلے گئے اور وہ اپنی قمیض کو ہاتھ پھیر کر گھٹنوں پہ سیدھا کر چکی تو سُرخ رومال سے اپنا مُنہ ڈھانپتی ہوئی وہ میرے پاس کھڑی ہو گئی۔

اُس کے گرد شام کی ساری خوشبوئیں تھیں۔ اور دن بھر کے مسلے ہوئے کپڑوں کی الجھی باس بھی۔ دھرتی کی باس جیسی جل چھڑکا کر ہم نے

کبھی کبھی نئی زمین میں محسوس کی تھی۔ سونگھی تھی۔ پرتتا۔ زمین اور اپنے
اندر بنے خوابوں سے مل کر بنی ہوئی وہ باس بھی میرے ارادے کو
بدل نہ سکی۔

میں نے کہا سرجو کچھ بولو کچھ کہو۔

وہ شرم سے دوہری ہو گئی۔ اور میری طرف پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو
گئی۔ اُس کے بالوں میں گندھے سونے کے پھول کانوں کے دونوں
طرف ذرا ذرا اوپر تھے اور دوپٹے میں سے چمک رہے تھے۔ اُس
کے پراندے میں بڑے سرخ پھندنے تھے جن میں سونے کے تاگے تھے
نیچے اوپر نکلتے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ اور وہ آپ جیسے
کوئی سندر سا سپنا ہو۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ دھرا تو وہ
کانپ گئی۔ اُس کی کپکپاہٹ میری اُنگلیوں کی پوروں میں سے ہوتی
ہوئی میری جان کو ٹھنڈا کر گئی۔ جیسے میری موت نزدیک ہو۔ بیٹھے
ہوئے دل کے ساتھ جب میں نے اُسے کہا سرجو میری طرف دیکھو
تو اس نے ہولے ہولے گھوم کر بہت آہستہ اپنی آنکھیں اٹھائیں۔
مگر وہ نگاہ وہ نہ تھی۔ وہ پھول کی نازک پنکھڑی کی خوشبو تھی۔ جو میرے
کمزور دل کو چھو کر واپس چلی گئی۔ میرے اندر پتھر کا دل بھلا کہیں
پگھل سکتا تھا۔

میں نے کہا "سرجو! ذرا اس نہر کے کنارے بیٹھ جاؤ۔ تم تھک گئی ذرا دم لو۔" اس نے نہ تو میری طرف حیرت سے دیکھا اور نہ ہی خوف سے۔ وہ بھری گھاس پر گٹھڑی سی بن کر پڑی رہی۔ میں نے سوچا بس یہ رنگ ہے اور روپ ہے۔ میں اس کو اکٹھا کر لوں گا۔ اور سرجو کو نہر میں بہا دوں گا۔ ہر عورت میرے لیے پرنٹو کی طرح تھی۔ پتہ نہیں اس رنگ اور روپ سے پڑے کونسے چہرے ہیں جو ان آنکھوں میں گردشیں لے چکے ہیں۔ اس نرمی اور چاند کی سی ٹھنڈک کو کون ہاتھ چھو چکے ہیں؟

پھر میں نے کہا دکھاؤ سرجو تمہارے ہاتھ میں چوڑیاں ہیں؟ سرجو نے سُرخ چوڑے سے بھری بانہیں میرے سامنے کر دیں۔ جیسے ایک جھونکے سے کوئی نئی شاخ ایک لمحے کے لیے جھُول جائے۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کی انگلیوں میں سارے جسم کی نرمی آگئی تھی۔ میں نے پور پور کر کے انہیں چوما جیسے کوئی فرض ادا کر رہا ہوں۔ اور کوئی سچ کہہ رہا ہوں جیسے آگ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور صرف ٹھیک بات کہنے پر مجبور ہوں۔ وہ اپنا منہ چھپائے لیٹی رہی۔ اس کا جسم رہ رہ کر کانپ اٹھتا۔

میں نے جب اسے بال کھولنے کو کہا۔ تو تب بھی اس نے حیرت

نہ ہوئی۔ اس نے جوڑے ہوئے مینڈھیاں کھولیں۔ گندھے ہوئے
زیور کھولے اور انہیں قریب رکھ دیا۔ جب وہ بال کھولے بیٹھی تھی
تو مجھے لگا وہ اُڑ جائے گی۔ شام کی سُرخی میں چھپ جائے گی اور
میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور تیز دھار
والی کرپان سے اُسے کاٹنے لگا۔ میں نے اس کے ٹکڑے نہر
میں بہا دیے۔ پانی میں بادلوں کی سُرخی کے ساتھ ساتھ سورج کی مہندی
کی سُرخی تھی۔ اس کا سہاگ پانی کے قطروں میں مل گیا۔ اس کے
جسم کی گرمی ہوا میں رچ گئی۔"

میں نے اُٹھ کر گھوڑیاں کھولیں۔ ہری سنگھ چاچا اور میں
دونوں چپ چاپ بیکانیر کی طرف جانے والی راہ پر جا رہے تھے
اور میں اپنے سیدھے ہاتھ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ دو سال کے بعد
اب اس ہاتھ سے روٹی کھا سکوں گا۔